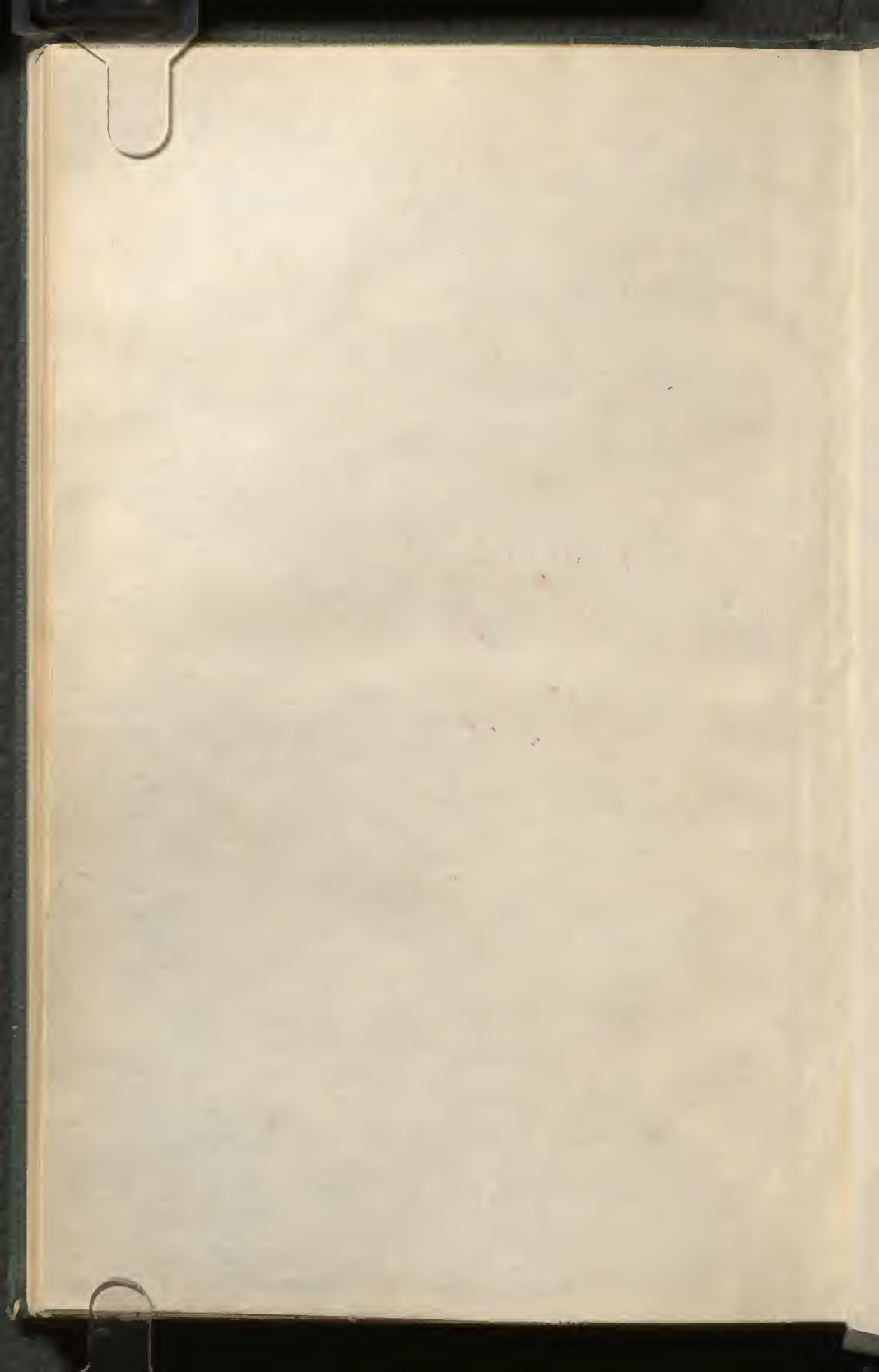


McGill University Library



3 103 077 349 1





/ Mazime Kitayot...

" Abd. al-Bādir, Shaukh



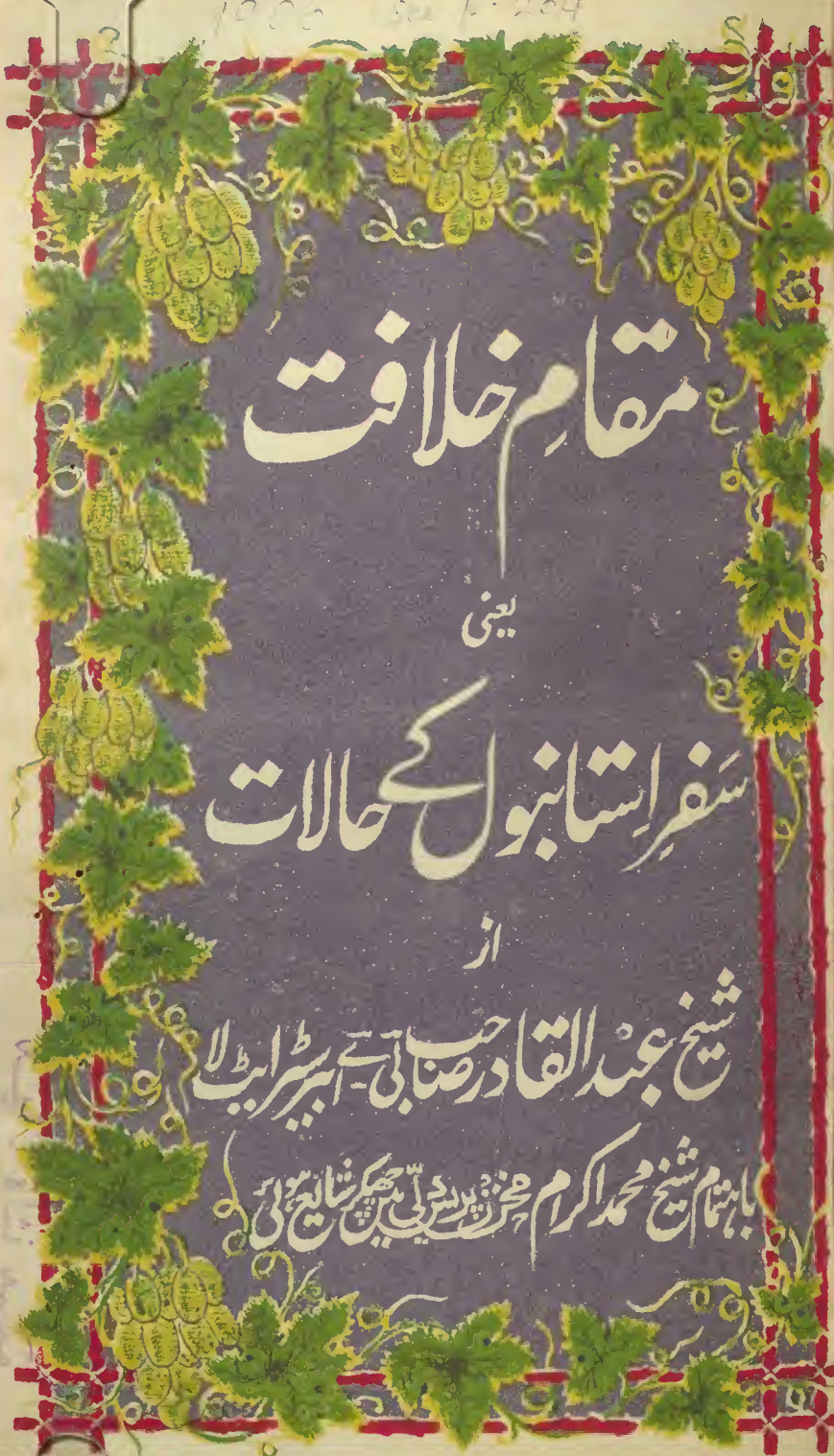
استانبول پام تخت دولت عالیہ عثمانیہ

دریچالت ورس کے ہاں ورس کے قریب کے متعلق تین سطور
جو

شیخ مصباحی کے ایڈیٹر کے سفر قسطنطنیہ کا نتیجہ



1900 500 / 204



مقام خلافت

یعنی

سفرِ استانبول کے حالات

از

شیخ عبد القادر صابئی - ایڈیٹر

بابہام شیخ محمد اکرم - ترجمہ و تفسیر



۱۰
۱۱
۱۲
۱۳
۱۴
۱۵
۱۶
۱۷
۱۸
۱۹
۲۰
۲۱
۲۲
۲۳
۲۴
۲۵
۲۶
۲۷
۲۸
۲۹
۳۰
۳۱
۳۲
۳۳
۳۴
۳۵
۳۶
۳۷
۳۸
۳۹
۴۰
۴۱
۴۲
۴۳
۴۴
۴۵
۴۶
۴۷
۴۸
۴۹
۵۰
۵۱
۵۲
۵۳
۵۴
۵۵
۵۶
۵۷
۵۸
۵۹
۶۰
۶۱
۶۲
۶۳
۶۴
۶۵
۶۶
۶۷
۶۸
۶۹
۷۰
۷۱
۷۲
۷۳
۷۴
۷۵
۷۶
۷۷
۷۸
۷۹
۸۰
۸۱
۸۲
۸۳
۸۴
۸۵
۸۶
۸۷
۸۸
۸۹
۹۰
۹۱
۹۲
۹۳
۹۴
۹۵
۹۶
۹۷
۹۸
۹۹
۱۰۰

فہرست مضامین مقام خلافت

نمبر صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۱	مقام خلافت	۱
۳	استانبول	۲
۱۴	سراے ہمایوں	۳
۲۳	باب عالی	۴
۳۰	ایاصوفیہ	۵
۴۱	خزینہ و سراے قدیم	۶
۴۹	چشہ سلطان احمد و چشمہ امیر اطور	۷
۵۴	ات میدان	۸
۶۰	عجائب خانہ بنی چری	۹
۶۴	جامع احمدیہ	۱۰
۶۹	مشہور مسجدیں	۱۱
۷۴	بازار مسقف	۱۲
۸۰	خان والدہ	۱۳
۸۶	جامع ایوب و ہفت برج	۱۴
۹۵	کاغذ خانہ	۱۵
۹۹	بوغاز و اطہار	۱۶

نمبر شمار	مضون	نمبر صفحہ
۱۷	ہر کیہ	۱۰۹
۱۸	مکاتب و مدارس	۱۱۸
۱۹	حمید چیتہ خانہ اطفال	۱۲۸
۲۰	دار الحجۃ	۱۳۵
۲۱	مطبع عثمانی	۱۴۱
۲۲	اخباری دُنیا	۱۴۶
۲۳	تربیت اطفال	۱۵۴
۲۴	تعلیم نسواں	۱۵۷
۲۵	عثمانی معاشرت	۱۶۲
۲۶	عیسائیوں سے تعلقات	۱۶۴
۲۷	عثمانیوں کی عام حالت	۱۶۹
۲۸	دورِ حمیدیہ	۱۸۴
۲۹	روزنامہ کا خلاصہ	۱۸۹

فہرست تصاویر مقام خلافت

نمبر شمار	تصویر	نمبر صفحہ
۱	حضرت ایوب انصاری	۱
۲	غلطہ کا بڑا پل	۱۲
۳	غلطہ مینار	۱۳
۴	قصر ملید زجاج حمیدیہ و سلاطین	۱۴
۵	جامع ایاصوفیہ	۳۰
۶	اندرون جامع ایاصوفیہ	۳۴
۷	خزینہ ہمالیوں کا دروازہ	۴۱
۸	چشمہ سلطان احمد	۴۹
۹	چشمہ امیر اطور	۶۱
۱۰	شیخ الاسلام	۶۱
۱۱	صدر اعظم	۶۱
۱۲	جامع سلطان احمد	۶۴
۱۳	میدان سرعسکرت	۶۴
۱۴	جزیرہ ملی	۱۰۸
۱۵	مکتب بحریہ کے طلبہ	۱۰۸
۱۶	حمید پختہ خانہ	۱۲۸

نمبر شمار

تصویر

نمبر صفحہ

۱۶	ایک ترک خانہ	۱۶۳
۱۸	ترکی برقعہ	
۱۹	سلطان المعظم کی گاڑی	
۲۰	افسران توپخانہ	
۲۱	درویشان طریقت مولویہ	
۲۲	والی بروہہ کے سارٹھتین مہمان (شیخ عبدالقادر جلال بے انسی مہر پر شیخ پتھین قدوسی)	
۲۳	علو جامع بروہہ	
۲۴	مدرسہ صنعت ابریشیم بروہہ	
۲۵	کارخانہ ابریشیم بروہہ	
۲۶	ہزائی نس عباس حلی پاشا خدیو مصر	

منظر اور زناچہ





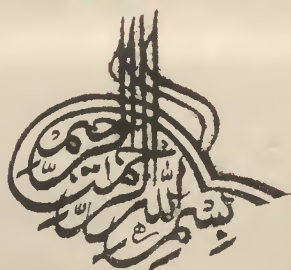
جامع حضرت ابوبکر انصاری

Isfahan, Persia 176

Vine d'Ezrah Station



بسم الله الرحمن الرحيم
الحمد لله رب العالمين
والصلاة والسلام على
سيدنا محمد وآله الطيبين
الطاهرين



آبِ دانہ کی کشت۔ سیر و سفر کی عادت یا **ہمقلہ خلافت** کی زیارت کی دیرینہ
 آرزو۔ گذشتہ سال ہوسٹنگرما میں مجھے **استانبول** لے گئی۔ وہاں چند ہفتے نہایت لطیف
 سے گزرے۔ عثمانیوں کی اخوتِ اسلامی نے غربت میں وطن کا سماں باندھ دیا۔ دین
 گذرتے معلوم نہ ہوئے۔ چار ہفتے ٹھہرنے کے ارادے سے گیا۔ سات ہفتے رہا۔
 اس پر بھی دل یہی کہتا تھا کہ ابھی اور رہئے۔ مگر تعطیل کا زمانہ تمام ہوا۔ لندن پس
 پہنچنے کا وقت قریب آگیا۔ ناچار استانبول کو خیر باد کہنا پڑا۔ واپسی پر ایرانِ مطن

کے خط پہنچے کہ معلوماتِ سفر میں ہمارا بھی حصہ ہے۔ اتنے دنوں کے سفر میں کیا معلوم
 بہم پہنچ سکتی تھیں۔ مگر جو کچھ معلوم ہوا اُس سے دریغ نہیں۔ حاضر کئے دیتا ہوں۔
 یہ مختصر سی کتاب سفر نامہ ہے۔ نہ سیاحت نامہ۔ اور نہ میں چاہتا ہوں کہ اسے
 اس نظر سے دیکھا جائے۔ بعض اتفاقات ایسے جمع ہو گئے۔ کہ میں نے استانبول
 کے قابل دید مقامات کو نہایت معتبر رہبروں کی حیثیت میں دیکھا اور وہاں کے
 اکابر سے ملاقات کی۔ اس لئے ان چند ہفتوں کے مشاہدات اس قابل ہو گئے کہ
 انہیں حوالہ قلم کیا جائے۔ آنکھوں نے استانبول اور اس کے قُرب وجوار کے دلپذیر
 مناظر قدرت کے فرے لئے۔ کانوں نے شیریں زبان ترکوں کی گفتگوئیں سُنیں۔
 یہ جو کچھ میں پیش کرتا ہوں اُن مناظر کی ایک دُھندلی سی تصویر اور اُن دلنشین
 لہجوں کی ایک ہلکی سی صدا ہے۔

بقیہ



استانبول

قُسطنطنیہ اور استانبول دونوں سے یہ شہر مشہور ہے اور دونوں اپنی اپنی حکیمہ تاریخی حکایات سے بھرے ہوئے ہیں۔

قُسطنطنیہ ! نام لیتے ہی کیا کیا نقشے آنکھوں کے روبرو آجاتے ہیں۔ روم کی عظیم الشان سلطنت کا زمانہ عروج۔ قُسطنطین اعظم کا دور جب قسطنطین کا عہد۔ رومی قیصر کی خواہش کہ ایک نیا روم بنائیں۔ اس خواہش کے پورا کرنے کے اہتمام۔ اس کی تکمیل۔ اور صدیوں کی تعمیرات۔ اب وہ سب کہاں ہیں ؟ اسی نام میں یہاں ہیں اور چند شکستہ آثار کے سوا یہی اُن گزشتہ صدیوں کی یادگار باقی ہے۔

استانبول ! اس نام کے ساتھ قُسطنطنیہ کے موجودہ فرمانرواؤں کی تاریخ وابستہ ہے۔ اور اُن کی عظمت و اقتدار کی حکایت گویا اس لفظ میں بند ہے۔ سلطان محمد فاتح کی مشہور فتوحات سے لیکر مختلف سلاطین عالی وقار کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا تماشا اسی استانبول نے دیکھا ہے۔ اس کی سرزمین کا چہ چہ اپنے اندر ایک مہٹری چھپائے ہوئے ہے۔ اور اس کی پرانی پرانی دیواریں اور اونچی نیچی گلیاں اپنی اپنی کہانی سنارہی ہیں۔

لیکن اس نادر شہر کی دلچسپی صرف تاریخی ہی نہیں۔ جغرافیہ نے بھی اس کی عظمت بڑھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ یورپ اور ایشیا کا مقام اتصال یہی ہے۔ کرۂ زمین کے نقشے پر اگر نگاہ دوڑائیں تو آسانی سے نظر آسکتا ہے کہ لکھنے والوں نے

اسے کلیدِ عالم پہنچا نہیں لکھا۔ جب تک عثمانی سلطنت بری اور بحری قوت میں یورپ کی دوسری سلطنتوں کے جوڑ کی تھی۔ اور عیسائی سلطنتوں نے مذہبی تعصب سے کام لیکر اس کے خلاف ایک نہیں کیا تھا۔ اُس وقت تک یورپ کی ہر سلطنت فرداً فرداً سلطنتِ عثمانیہ سے کانپتی تھی۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ قسطنطنیہ کے محل وقوع نے اسے کس قدر محفوظ بنا دیا ہے اور اُسے دوسروں پر حملہ کرنے کے لئے کتنی آسانیاں دے رکھی ہیں۔ خشکی اور تری دونوں راستے اُس کے لئے یکساں کھلے ہیں۔ اب بھی اگر ترکوں کی بحری طاقت سنبھل جائے اور اندرونی انتظام میں اغیار کی مداخلت نہ رہے تو قسطنطنیہ کا محل وقوع اس کے مالکوں کو یہ موقعہ دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو زیادہ خطرہ میں ڈالنے کے بغیر دوسروں کی عافیت کو معرضِ خطر میں نہ لکھیں۔ اسی لئے تو ان کے پیرا ہمسائے انہیں چین سے رہنے نہیں دیتے۔ اور ہمیشہ "مشرقِ قریب" میں کوئی نہ کوئی بھگڑا کھڑا رکھتے ہیں۔

• علومِ تاریخ و جغرافیہ کے اعتبار سے جو اہمیت استنبول کو ہے۔ اس کے علاوہ اس کے کوہ و دریا کا لطیف۔ اس کے باغ و مرغ کے نظارہ کا شوق۔ اس کی مخلوط آبادی کا تماشا اور موسمِ گرما میں اس کی آب و ہوا کا اعتدال ہر سال دُنیا کے ہر گوشے سے لوگوں کو کھینچتا ہے۔ امریکا کے لوگ جو سیر و سیاحت میں سارے جہان سے ہجرت لے گئے ہیں۔ ہزاروں آتے ہیں۔ اور اگر آمد و رفت میں گیمروں دار۔ روک تمام اس قدر نہ ہوتیں قدراب ہے تو اور بھی زیادہ آئیں۔ ان کے علاوہ انگریز آتے ہیں۔ فرانسیسی آتے ہیں۔ جرمنی آتے ہیں۔ غرض یورپ کی ہر قوم کے افراد ہر وقت استنبول میں موجود رہتے ہیں۔ اور اس کے حالات معلوم کرنے

کے مشتاق۔ مگر مسلمانوں کے لئے استانبول میں ایک خاص کشش ہے۔ اور وہ یہ مقام ایک ایسے بادشاہ کا پایہ تخت ہے۔ جو نہ صرف اسلامی تاجداروں میں سب سے بڑا ہے۔ بلکہ دنیا کے مسلمانوں میں بیشتر کے نزدیک خلیفہ وقت ہے اور اسی لئے مسلمان اکثر اس مقام کو مقام خلافت کہتے ہیں اور اس کے حالات سننے کا بیحد شوق رکھتے ہیں۔ روس کے مسلمان تو اکثر حج بیت اللہ شریف کو جاتے وقت اسی راستے سے گزرتے ہیں اور مقام خلافت کی سیر کو اپنے مقدس سفر کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے سوا اور ممالک اسلام سے بھی زائر آتے جاتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان بھی وقتاً فوقتاً وہاں پہنچتے ہیں۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ چین کے مسلمان جو اس دار الخلافہ سے ہندوستانیوں سے بھی دور ہیں۔ اکثر آتے رہتے ہیں۔ اور بعض اپنے بچوں کو وہاں تعلیم و تربیت کے لئے بھیجتے ہیں۔ گویا تاریخ اور جغرافیہ کی کوشش کے سوا مذہب کی زبردست قوت بھی اس عجیب مقام کی قدر بڑھانے میں مدد دے رہی ہے۔ قسطنطنیہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس مقام خلافت کی حفاظت کے لئے اپنی جان نثار کرنا نہ صرف قومی اور ملکی بلکہ مذہبی فرض جانتے ہیں۔ کیونکہ وہاں ایک روایت نہایت مقبول ہے کہ اس شہر کا فتح ہونا جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کی تصدیق کے لئے لازم تھا۔ مسلمانوں نے اس کے فتح کرنے میں اپنا فرض مذہبی ادا کیا اور اس قبضہ کا قائم رکھنا اسی عہد بار سے ان پر واجب ہے۔

فتوحات کی تاریخ میں شاید فتح جلیل قسطنطنیہ سے بڑھ کر عجیب حالات کسی بڑے

۱۵۔ نام کی ایک کتاب نے زبان میں شائع ہوئی ہے جس میں اس تاریخ افق کی کیفیت شرح و بسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

پایہ تخت کے فتح ہونے کے متعلق مروی نہیں ہیں۔ جامع فاتح کے ایک دروازہ پر وہ حدیث
 نبویؐ لکھی ہے جس سے فتح قسطنطنیہ کے لئے مسلمانوں کی متواتر کوششیں منسوب ہیں۔
 حدیث شریف کی عبارت یہ ہے :- **لَتَفْتَحَنَّ الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ فَلْيَعْمَا الْاَمِيرُ**
اَمِيرُهَا وَلْيَعْمَا الْجَيْشُ ذَاكَ الْجَيْشُ۔ اس پیشین گوئی سے بڑھ کر حیران کرنے
 والی پیشین گوئی کیا ہو سکتی ہے۔ کہ ساتویں صدی عیسوی کے نصف اول میں عرب
 کے چند بادشاہینوں کو جو پیغمبر عرب کے زبردست متغناطیسی اثر سے اس کے گرد
 جمع ہو گئے تھے۔ یہ مژدہ دیا جائے کہ مسلمان قیصر روم کی عالیشان سلطنت کی بنیاد
 اکھیر دینگے۔ اور خود اس کی جگہ لینگے۔ اور ان لوگوں کے عقیدہ کی پختگی کو دیکھتے۔
 کہ وہ اس بے سروسامانی میں بھی اس اُمید پر اٹھ کھڑے ہوئے کہ وہاں پہنچنے کی
 دیر ہے۔ پھر وہاں کی کلید ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ۶۷۸ء میں یعنی رسول مقبولؐ
 وصال کے بعد تھوڑے سے عرصے کے اندر ہی ان باحوصلہ عربوں نے قسطنطنیہ کے
 پایہ تخت کے دروازہ پر آدست تک نہی۔ حضرت ایوب انصاریؓ علم بردار نبویؐ اس لشکر
 کے سرگروہ تھے۔ اُس زمانے میں شہر کے گرد مضبوط دیواریں تھیں۔ عیسائی خبر پاتے
 ہی دروازے بند کر کے قلعہ بند ہو بیٹھے۔ مسلمانوں نے باہر ڈیرے ڈال دیئے۔
 آخر دونوں کی مُسط بھیڑ ہوئی۔ مسلمانوں نے دادرماگی دی۔ تعداد میں کم تھے
 اور گھر سے منزلوں دُور۔ کئی خشک بیابان اور کئی دشوار گزار پہاڑی راستے۔
 کئی دریا اور کئی وادیاں درمیان حائل تھیں۔ بھاگ کر جاتے تو کہاں جاتے
 اور بھاگنے والے ہوتے تو اتنی دُور کیوں آتے۔ کچھ لڑائی میں کام آئے
 لے ترجمہ تم فتح کرو گے قسطنطنیہ کو پس باک ہو وہ امیر اس شہر کا امیر گکا اور باک ہو وہ لشکر اس کا گکا

یہ سزا دینا اور کچھ وبا کی نذر ہوئے۔ مگر مرتے ہوئے اپنے مغرور غنیم سے یہ کہہ گئے۔ کہ یہ سبھنا
 کو کشیش نہیں کہ یہ ہڈیاں یہاں بے سبب گڑی ہیں۔ اس خاک پر ہم بے وجہ نہیں لیٹے جب یہ
 فلسفہ کیا ہڈیاں پویند خاک ہو جائیں گی۔ تب اس خاک سے ایک خمیر اٹھے گا۔ اور وہ خمیر ماہ
 سے بڑھ کر دکان اسلام ہوگا۔ جس کی گرم بازاری کا زمانہ آنے والا ہے۔

یہ بہادر مرنے کو تو مر گئے۔ مگر عجب کام کر گئے۔ بجائے اس کے کہ انکی
 شکست مسلمانوں کی ہمت کو شکست دے۔ اس کے لئے اور تازیانہ بنی شہبہ
 اس زمانے کے استوار عقائد میں راہ پا نہیں سکتا تھا۔ وہ دل سے مانتے تھے کہ
 جناب رسالت مآب کی زبان وحی ترجمان سے جو بات نکلی ہے وہ پوری ہو کر رہیگی
 خواہ اسباب اس کے کتنے ہی مخالف کیوں نہ نظر آئیں۔ اب انہیں مزید ترغیب
 یہ ہو گئی۔ کہ اپنے شہیدوں کا خون بہالیں۔ اُن کی ہڈیوں کی حفاظت کریں۔ اُن کے
 مزار بنائیں اور اُن مزاروں کو بے حُرمتی سے بچائیں۔ آئے اور بار بار آئے۔
 عربوں نے سات سال متواتر حملہ کیا۔ خلفائے بغداد کے عروج کے زمانہ میں اسوش
 آیا۔ اور اسکدار (سقوطی) پر اس کا جھنڈا اُڑ گیا۔ اُس وقت ایک ملکہ قسطنطنیہ کی حکمران
 تھی۔ اس نے خراج دینا منظور کر کے صلح کر لی۔ پھر ایک زمانہ گزر گیا۔ مگر مسلمان اس
 پیشین گوئی کو نہیں بھوئے۔ عثمانی تاجدار کو شیش کرتے رہے۔ لیکن جس نامور کے
 زور و شہسیر سے آخر عالم قسطنطین سرنگوں ہوا۔ وہ فخر خاندان عثمانی سلطان محمد ثانی تھا۔
 جس نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کیا اور فاتح کے لقب سے ممتاز ہوا۔ اور اسی نام
 سے آج تک دشمن و دوست اُسے یاد کرتے ہیں۔ اسی کے حُسن تدبیر نے خشتی پر
 کشتیاں چلا دیں۔ اور وہ مہم سر کی جس کی فکر میں مسلمان آٹھ سو سال سے تھے۔ مگر کامیاب

نہ ہوئے تھے۔

حال میں ایک فرانسیسی مولف موسیو بارتھ نامی نے قسطنطنیہ پر ایک کتاب لکھی جو جس کا بعض حصے قابل اقتباس ہیں۔ اُس نے معرکہ قسطنطنیہ کا جو بیان لکھا ہے۔ اُس کا ترجمہ یہاں درج کرنا خالی از لطف نہیں:-

۲۳۔ مارچ ۱۴۵۳ء کو محمد ثانی اپنے دار الخلافہ اور یاںوپل سے چلا اور ۶۔ اپریل کو اس نے قسطنطنیہ کا برسی اور بحری محاصرہ کر لیا۔ ترکی جہاز بٹ کٹاش کے مقابل اکھڑ ہوئے۔ لیکن آہنی زنجیریں جو بندرگاہ کی حفاظت کے لئے لگی ہوئی تھیں جہازوں کے بندریں داخل ہونے کی مانع تھیں۔ سلطان محمد نے چھوٹی کشتیوں کو پیٹے لگوا دیئے اور خشکی پر اُس وادی کے راستے جو غلطہ کے پیچھے واقع ہے انہیں چاکر وہ بندرگاہ کی دوسری طرف لے آیا۔ جہاں اب جامع ایوب ہے۔ اُس حصے کے سامنے جب اچانک کیشتیاں پانی میں ڈالی گئیں اور آنا فنا سارے بندرگاہ پر چھا گئیں تو شہر بھر میں حیرت گھبرائٹ پھیل گئی۔ حملہ آوروں نے پیغام دیا کہ اگر اوقات قبول کر لو تو تمہارے جان و مال کو امان دی جائیگی۔ لیکن قسطنطنین یازدہم نے دلیلاً انکار کیا۔ پانچ ہزار یونانی وفادار اور تین ہزار اہل جنو اجمان تیار ساتھ دینے کو تیار اور سات ہفتے تک غنیم کا جو تعداد میں اُن سے بڑھ کر تھے۔ بہادرانہ مقابلہ کرتے رہے۔ فٹاریں ڈیوک تو قسطنطنیہ سے ہٹ کر تھا۔ تیر انداز اور سنگ انداز ہند کے مختلف حصوں میں تقسیم شدہ تھے۔ قیصر خود فیصل پرچہ نیل گیلنانی کے ساتھ موجود تھا جہاں اب تو پچانہ کا دروازہ ہے۔ وہ حصہ سب میں کمزور اور غیر محفوظ تھا۔ اور محمد ثانی نے اپنی ساری سعی اس دروازہ کے خلاف کرنی شروع کی۔ اُس نے اس واقعہ پر

یہ قامت توپوں سے کام لیا جو اربان نامی باشندہ ہنگری نے تیار کی تھیں اور جس سے
 بڑے چٹان تین ساڑھے تین قنطار وزن کے پھینکے جاسکتے تھے۔ سلطان خود
 میدان کماندہ پیکوں کے قریب کھڑا تھا جہاں سے وہ غنیم کی سب حرکات دیکھ سکتا تھا۔ ۹۰
 وائس نے حملے کا حکم دیا۔ اور عثمانی فوج ہار گئی۔ مگر یونانی شکست کھانے پر بھی
 بلے باز اس طرح جان لٹا رہے تھے کہ فاتحین شہر میں داخل نہ ہو سکے اور مینی چری فوج دو فوج
 شکار کے پاس پاموٹی۔ اس وقت نازک میں ایک مسلمان درویش کا خواب مسلمانوں کی حوصلہ افزائی
 کے لئے بول رہا تھا۔ جس نے دعویٰ کیا کہ رسول مقبول کے صحابی حضرت ایوب انصاری کا
 چھوٹا کنبہ نزار اسے خواب میں دکھایا گیا ہے۔ اس خبر کے سنتے ہی مسلمانوں کے جسمیں ایک
 بیچھے لالہ بازہ جان پر لگی اور وہ از سر نو حملہ آور ہوئے۔ ان میں سے کوئی پچاس آدمی ایک
 ہے۔ ہندو زمینی راستے سے جس کا دروازہ یونانی بند کرنا بھول گئے تھے شہر کے اندر گھس آئے۔
 انہوں نے مصلوبین جنہیں ان کے داخل ہونے کا کچھ علم نہیں تھا۔ اپنی جگہ پر روکنے کے لئے
 نے پتھر پٹے ہوئے تھے کہ موت نے انہیں پیچھے سے آلیا۔ اس حالت کے دیکھتے ہی
 انہیں ایک تشنج سا ہو گیا۔ ان کی گھبراہٹ دیکھ کر غنیم دیواروں پر چڑھ آئے۔
 اور مذہب مسیحیانی ایک گولے سے زخمی ہو گیا اور اپنے جہاز میں لاکر لٹا دیا گیا۔ اور بیٹے
 کی جان نکل گئی۔ قیصر جو غریب سے اپنے بزرگوں کے ورثہ کی حفاظت کرتا
 رہا ہوا اسی معرکے میں کام آیا۔ غنیم کی فوج جسے اب کوئی روکنے والا نہیں رہا تھا۔ مصروف
 کی رہنمائی ہوئی۔ اور تین دن تک کشت و خون جاری رہا۔ سلطان محمد بسر کردگی عثمانیاں

۱۵ فرہادی میں لفظ قنطار اس کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور ایک قنطار کا وزن ایک سو کیلو گرام ہے۔ اور

س نے ایلو انگریزی پوڈ کے قریب ہوتا ہے پس قنطار کوئی سوا من ہندوستانی ہوا ۱۲

جب داخل شہر ہوا تو ایک شہر کا چم غیر سینٹ صوفیا کے گرجے میں پناہ گزین تھا۔
 شہر والوں کا ہر طبقہ وہاں اڑائی کے انجام کا منتظر تھا اور چوری خدا سے دعا کرتے
 مانگ رہے تھے اور غرض عقیدت عورتیں مذہبی گیت گانے کر دھا کر رہی تھیں کہ
 انہیں بچالے مگر فاتحین نے دروازے توڑ ڈالے۔ اور قتل عام شروع ہوا تین
 ہزار آدمی مارے گئے ہونگے۔ سلطان گھوڑے پر سوار خود دروازہ پر آ پہنچا۔ اور
 سواری زینوں کو پھاند کر از خود رفتہ گروہ کے روبرو آپکارا کلام اللہ سبحانہ
 رسول اللہ گرجے کی بے ادبی گویا اس کے توطنے پھوڑنے کا اعلان تھا۔ بہت
 اور صلیبیں گلہاڑیوں سے توڑی گئیں اور قیمتی ظروف فاتحین کے پانوں میں
 روندے گئے۔ ایک کھڑکی کے مقابل جسے دیکھ کر دہکتے ہیں۔ اب تک پتھر
 کے ستون میں ایک ہاتھ کا نشان گڑا ہوا نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ محمد فتح نے
 گرجے پر قبضہ کرتے وقت یہ نشان اپنے ہاتھ سے لگا دیا تھا۔ اس طرح سینٹ
 صوفیہ کا گرجا جو نو سال سے عیسائیوں کے جمع ہونے کا مقام تھا اسلام کی ملک ہو گیا
 یونانیوں میں ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک متبرک پادری اس قبضے کے وقت ایک
 دروازہ سے بھڑانہ غائب ہو گیا۔ اور وہ دروازہ خود بخود بند ہو گیا اور آج تک بند
 جس دن پھر صلیب ہلال کی جگہ لے گی۔ اُس دن وہ دروازہ کھلے گا اور وہ پادری
 جتنا جاگتا اُس عبادت میں مصروف نظر آئے گا جو وہ اُس وقت کر رہا تھا۔

موسو بارحقہ عیسائی ہے اور عیسائی ناظرین کے لئے کتاب لکھ رہا ہے۔ اس لئے
 اُس کے بیان میں تعصب صاف نظر آ رہا ہے۔ مثلاً گرجے کے اندر قتل کا جو بیان اس نے
 لکھا ہے۔ اس کی تردید ایک اور عیسائی مؤلف مسٹر مرے یوں کرتا ہے :-

غلط کا ٹرائل





بوت کے سن

کے پھر کے اور

روایت کے راہ

وہ کہانی کی

کہانی کے

نہایت پر

وہ کہانی

کے کہانی

نہایت پر

وہ کہانی

کے کہانی

نہایت پر

وہ کہانی

کے کہانی

نہایت پر

وہ کہانی

کے کہانی

نہایت پر

ہاتھ کے اس نشان کی بابت کہا جاتا ہے کہ فاتح جب گھوڑے پر سوار مقتولین کی لاشوں کے ڈھیر کے اوپر گزر رہا تھا۔ اُس وقت اُس کا ہاتھ اتنی بلندی تک پہنچ سکتا تھا کہ اس روایت کے راوی یہ بھول جاتے ہیں کہ جو جماعت فتح کے دن گرجے کے اندر تھی وہ قید کر لی گئی تھی اور قتل نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے قصداً موسیو بارنہ کو موقع دیا ہے کہ وہ اس واقعہ کو عیسائیوں کی روایات کی رو سے بیان کر دے۔ کیونکہ اول تو مخالف شہادت کا وہ حصہ جو باوجود مخالفت کے آہنگ کے واقعات اصلی کی تائید کرے۔ موافق شہادت سے زیادہ با اثر ہوتا ہے اور دوسرے ان بیانات سے جو نقل کئے گئے ہیں۔ اُن احساسات پر روشنی پڑتی ہے جو عیسائی عموماً قسطنطنیہ اور ایاصوفیہ کے متعلق رکھتے ہیں اور جن سے اُس عناد کا عقدہ حل ہوتا ہے جو عالم عیسوی کو بالعموم عثمانی کے ساتھ ہے۔ وہ ان بے سرو پا کہانیوں سے برا فروختہ ہوتے ہیں۔ اور انہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ سلطان فاتح ہی وہ سلطان جو جس نے یونانی گرجے کے پادریوں کو خاص حقوق عطا کئے۔ اُن کو گرجے کے اندرونی انتظام میں پوری آزادی۔ دوسرے عیسائیوں کی مداخلت سے اُن کے گرجے کو بچایا اور رعایا کی نہی آزادی اور ایک نہایت معقول حد تک مساوات حقوق کی ایسے وقت میں بنیاد ڈالی۔ جب یورپ کے دوسرے حصے مساوات کا خیال بھی نہ رکھتے تھے۔

۱۴۵۳ء سے لیکر آج تک استانبول سلطانین عثمانیہ کا دار الخلافہ چلا آتا ہے۔

سلطان محمد فاتح نے اپنی فتح کی کسی یادگاریں چھوڑیں جن میں روم اہلی حصار اور جامع فاتح خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد یہ رسم ہو گئی۔ کہ قریب قریب ہر سلطان اپنے عہد کی یادگاریں ایک مسجد بنا کرے اور اسی لئے استانبول مساجد کے اعتبار سے

شہرت خاص رکھتا ہے۔ شاید کسی اور اسلامی مرکز میں بڑی مسجدیں اس کثرت سے نہیں مل سکتیں۔ مسجدوں کے بلند مینار دُور سے نظر آنے لگتے ہیں۔ اور آسمان سے باتیں کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی صورت کا یہی دُھ حصہ ہے جس پر فلستان کے با مذاق نظارہ پسند وجد کرتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ گو اگلا جو شہر تعریف شہر میں قدم رکھتے ہی گلی کوچوں کی حالت کو دیکھ کر فرو ہو جاتا ہے اور پھر مذمت بھی ایسی ہی کرتے ہیں۔ تاہم اس شہر کی دو خوبیوں کا وہ ہمیشہ عترت شرف کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ دُور سے استانبول بجائے معمولی انسانی آبادی کے عالم بالا کی کسی بستی کی تصویر نظر آتا ہے۔ جس کا نقشہ صاف نیلگوں آسمان کے وسیع کینوس اس پر نقاش ازل نے اپنے ہاتھ سے کھینچا ہے۔ اور دُور سے یہ کہ تاریخی نشانوں کی بوقلمونی کے لحاظ سے یہ دار الخلافہ اپنی مثال نہیں رکھتا۔

اصل پرانا قسطنطنیہ تو وہی ہے جسے اب استانبول کہتے ہیں۔ مگر اب رفتہ رفتہ پھیلنے پھیلنے پر نام کی حصول پر جو پہلے غیر آباد تھے یا علیحدہ سمجھے جاتے تھے حادی ہو گیا ہے۔ اس کے اب تین بڑے حصے ہیں۔ استانبول۔ پیرا غلطہ اور اسکدار۔ ان میں استانبول اور پیرا غلطہ یورپی ساحل پر واقع ہیں اور اسکدار (سقوٹری) ایشیائی ساحل پر۔ یورپی ساحل اور ایشیائی ساحل کے درمیان آبنائے باسفور ہے اور استانبول اور پیرا غلطہ کے درمیان شاخ زرین کا پانی حائل ہے۔ شاخ زرین پر صبح سے شام تک آئندہ روند کی کثرت رہتی ہے۔ اور باوجود اپنی گہنگی کے یہ پُل نہایت دلچسپ ہے۔ دُنیا کی ہر قوم کا نمونہ اس پُل پر نظر آسکتا ہے اور مشرق و مغرب کے سب لباسوں کی آئینہ

۱۲ انگیزی میں اس کھردرے سے کپڑے کو کہتے ہیں۔ جس پر نقاش تصویریں کھینچتے ہیں ۱۲

غلاطی میں



کے کھیل کے لئے
تھے ہیں۔ اور
ہر حصہ میں
رستہ نہیں
لوگوں کو کرنا
میں انہوں نے
نی آبادی کے
ن کے
یہ کہ تہی

میں۔ گلاب
ہے جسے
پیرا غلاطی
مدار
سفیر
تین ہر
نہایت
بہا

ہے

[illegible]

اس کے منظر کو نہایت دلپذیر بناتی ہے۔ اسکا دار کی آبادی بیشتر مسلمانوں کی ہے۔ تانبول
 میں بھی زیادہ تر مسلمان ہی آباد ہیں۔ گو تاجر اور دوکانداروں میں عیسائی اور یہودی
 بھی بکثرت ہیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تجارت کا ایک کثیر حصہ انہی کے ہاتھ میں ہے۔
 اسی حصہ میں ایاصوفیہ۔ اسی میں باب عالی۔ باب مشیخت۔ عدالتیں۔ اور دیگر دفاتر کاری
 ہیں۔ اسی میں زیادہ تر مساجد۔ اسی حصہ میں قسطنطنیہ کا مشہور عالم سقف بازار ہے اور
 یہیں خان والدہ میں ایرانی تجارت کی بستی ہے۔ مسافر کی دلچسپی کے جس قدر سامان اس
 حصہ میں جوڑانی چادر دیواری کے اندر ہے موجود ہیں۔ اور کسی حصہ میں نہیں۔ پیرا
 غلطہ ایک دوسرے سے ملے جملے ہوتے ہیں۔ لیکن اصل میں دو حصے ہیں۔ پیرا نقاشی
 عیسائیوں اور یورپ کے عیسائیوں کی بود و باش کا مرکز ہے یہیں یورپی ہوٹلوں
 کے نمونے کے ہوٹل ہیں۔ اور یہیں دول خارجیہ کے سفیروں کے مکان ہیں۔ غلطہ
 میں غلطہ سرائے نام شاہی محل ہے جو سلطان عبدالعزیز کے زمانے سے مکتب سلطانی کو
 دیدیا گیا ہے۔ یہیں غلطہ مینار ہے جس پر چڑھنے سے استانبول بہ تمام و کمال نظر
 آسکتا ہے۔ اور اسی کے پرے اگر کچھ دُور نکل جائیں تو نشان طاش۔ بشکاش وغیرہ
 شہر کے کھلے اور نو تعمیر شدہ حصے آجاتے ہیں۔ جہاں اُمرا کے مکانات۔ شاہی
 محلات اور موجودہ قصر شاہی یعنی یلدرم ہے جسے استانبول کے روزمرہ میں "سرائے
 ہائیون" کہتے ہیں۔

سرائے ہمایون

استانبول مقام خلافت ہے۔ تو سرائے ہمایون مرکز خلافت۔ سب بڑے بڑے ملکی معاملات اسی قصر شاہی کی چار دیواری کے اندر فیصلہ ہوتے ہیں اور اسی طرح کاروبار خلافت کے متعلق احکام یہیں سے صادر ہوتے رہتے ہیں۔ سلطان العظمیٰ حرمین شریفین ہیں۔ اور وہاں کے کارکن مختلف امور میں حکم احکام حاصل کرنے کے لیے یہیں سے رجوع کرتے ہیں۔ جب سے دولت عثمانیہ کے موجودہ فرمانروا سلطان عبد الحمید خاں غازی تخت نشین سلطنت ہوئے ہیں۔ سکونت شاہانہ کا فرائض محل کو بخشا گیا ہے۔ اور اس کے بڑے احاطے کے اندر کی تعمیرات بیشتر سلطان العظمیٰ کے عہد کی تعمیرات ہیں۔ اُن کے جد مرحوم سلطان محمود نے ۱۸۳۲ء میں اس محل کی بنیاد ڈالی تھی۔ مگر اُس وقت بشکطاش کی چوٹی پر یہ صرف چھوٹا سا کیوتک تھا۔ اور اس کے گرد ایک نہایت وسیع باغ تھا۔ جہاں وہ کبھی تفریحاً جاتے تھے۔ مرحوم سلطان محمود ہی نے اس کا نام یلدرم کو شک سکھا۔ یلدرم ترکی میں ستارے کو کہتے ہیں اور اس چھوٹے سے محل کو اس کی خوبصورتی اور بلندی کی وجہ سے یہ نام دیا گیا۔ ۱۸۴۲ء میں سلطان عبد الحمید مرحوم و مغفور نے اسے اور بڑا یا اور آراستہ کیا۔ اُن کے بعد سلطان عبد العزیز مرحوم نے اس کے باغ کو اور وسعت دی یہاں تک کہ یلدرم کا باغ قصر چراغاں تک جا پہنچا۔ جو عین لب باسفور واقع ہے۔ انہوں نے چند اور کو شک بھی اس میں تعمیر کئے اور سب سے بڑی تعمیر محل کے

تھریلڈز - جامع عہدہ - رستم سلاطینک



تھریلڈز - جامع عہدہ - رستم سلاطینک
 یسعیہ ہوسٹل
 نہیں سائن
 حکمران کے
 شاہانہ کے
 سکونت
 تعمیرات
 ۱۸۳۱ء میں
 ٹوٹا سا
 جگہ
 کی میں
 کی کی
 سے اور
 کو اور
 وروڈ
 تعمیر

۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰
 ۲۰۱
 ۲۰۲
 ۲۰۳
 ۲۰۴
 ۲۰۵
 ۲۰۶
 ۲۰۷
 ۲۰۸
 ۲۰۹
 ۲۱۰
 ۲۱۱
 ۲۱۲
 ۲۱۳
 ۲۱۴
 ۲۱۵
 ۲۱۶
 ۲۱۷
 ۲۱۸
 ۲۱۹
 ۲۲۰
 ۲۲۱
 ۲۲۲
 ۲۲۳
 ۲۲۴
 ۲۲۵
 ۲۲۶
 ۲۲۷
 ۲۲۸
 ۲۲۹
 ۲۳۰
 ۲۳۱
 ۲۳۲
 ۲۳۳
 ۲۳۴
 ۲۳۵
 ۲۳۶
 ۲۳۷
 ۲۳۸
 ۲۳۹
 ۲۴۰
 ۲۴۱
 ۲۴۲
 ۲۴۳
 ۲۴۴
 ۲۴۵
 ۲۴۶
 ۲۴۷
 ۲۴۸
 ۲۴۹
 ۲۵۰
 ۲۵۱
 ۲۵۲
 ۲۵۳
 ۲۵۴
 ۲۵۵
 ۲۵۶
 ۲۵۷
 ۲۵۸
 ۲۵۹
 ۲۶۰
 ۲۶۱
 ۲۶۲
 ۲۶۳
 ۲۶۴
 ۲۶۵
 ۲۶۶
 ۲۶۷
 ۲۶۸
 ۲۶۹
 ۲۷۰
 ۲۷۱
 ۲۷۲
 ۲۷۳
 ۲۷۴
 ۲۷۵
 ۲۷۶
 ۲۷۷
 ۲۷۸
 ۲۷۹
 ۲۸۰
 ۲۸۱
 ۲۸۲
 ۲۸۳
 ۲۸۴
 ۲۸۵
 ۲۸۶
 ۲۸۷
 ۲۸۸
 ۲۸۹
 ۲۹۰
 ۲۹۱
 ۲۹۲
 ۲۹۳
 ۲۹۴
 ۲۹۵
 ۲۹۶
 ۲۹۷
 ۲۹۸
 ۲۹۹
 ۳۰۰
 ۳۰۱
 ۳۰۲
 ۳۰۳
 ۳۰۴
 ۳۰۵
 ۳۰۶
 ۳۰۷
 ۳۰۸
 ۳۰۹
 ۳۱۰
 ۳۱۱
 ۳۱۲
 ۳۱۳
 ۳۱۴
 ۳۱۵
 ۳۱۶
 ۳۱۷
 ۳۱۸
 ۳۱۹
 ۳۲۰
 ۳۲۱
 ۳۲۲
 ۳۲۳
 ۳۲۴
 ۳۲۵
 ۳۲۶
 ۳۲۷
 ۳۲۸
 ۳۲۹
 ۳۳۰
 ۳۳۱
 ۳۳۲
 ۳۳۳
 ۳۳۴
 ۳۳۵
 ۳۳۶
 ۳۳۷
 ۳۳۸
 ۳۳۹
 ۳۴۰
 ۳۴۱
 ۳۴۲
 ۳۴۳
 ۳۴۴
 ۳۴۵
 ۳۴۶
 ۳۴۷
 ۳۴۸
 ۳۴۹
 ۳۵۰
 ۳۵۱
 ۳۵۲
 ۳۵۳
 ۳۵۴
 ۳۵۵
 ۳۵۶
 ۳۵۷
 ۳۵۸
 ۳۵۹
 ۳۶۰
 ۳۶۱
 ۳۶۲
 ۳۶۳
 ۳۶۴
 ۳۶۵
 ۳۶۶
 ۳۶۷
 ۳۶۸
 ۳۶۹
 ۳۷۰
 ۳۷۱
 ۳۷۲
 ۳۷۳
 ۳۷۴
 ۳۷۵
 ۳۷۶
 ۳۷۷
 ۳۷۸
 ۳۷۹
 ۳۸۰
 ۳۸۱
 ۳۸۲
 ۳۸۳
 ۳۸۴
 ۳۸۵
 ۳۸۶
 ۳۸۷
 ۳۸۸
 ۳۸۹
 ۳۹۰
 ۳۹۱
 ۳۹۲
 ۳۹۳
 ۳۹۴
 ۳۹۵
 ۳۹۶
 ۳۹۷
 ۳۹۸
 ۳۹۹
 ۴۰۰
 ۴۰۱
 ۴۰۲
 ۴۰۳
 ۴۰۴
 ۴۰۵
 ۴۰۶
 ۴۰۷
 ۴۰۸
 ۴۰۹
 ۴۱۰
 ۴۱۱
 ۴۱۲
 ۴۱۳
 ۴۱۴
 ۴۱۵
 ۴۱۶
 ۴۱۷
 ۴۱۸
 ۴۱۹
 ۴۲۰
 ۴۲۱
 ۴۲۲
 ۴۲۳
 ۴۲۴
 ۴۲۵
 ۴۲۶
 ۴۲۷
 ۴۲۸
 ۴۲۹
 ۴۳۰
 ۴۳۱
 ۴۳۲
 ۴۳۳
 ۴۳۴
 ۴۳۵
 ۴۳۶
 ۴۳۷
 ۴۳۸
 ۴۳۹
 ۴۴۰
 ۴۴۱
 ۴۴۲
 ۴۴۳
 ۴۴۴
 ۴۴۵
 ۴۴۶
 ۴۴۷
 ۴۴۸
 ۴۴۹
 ۴۵۰
 ۴۵۱
 ۴۵۲
 ۴۵۳
 ۴۵۴
 ۴۵۵
 ۴۵۶
 ۴۵۷
 ۴۵۸
 ۴۵۹
 ۴۶۰
 ۴۶۱
 ۴۶۲
 ۴۶۳
 ۴۶۴
 ۴۶۵
 ۴۶۶
 ۴۶۷
 ۴۶۸
 ۴۶۹
 ۴۷۰
 ۴۷۱

اُس طرف کی جو مابینِ بھائیوں کے نام سے موسوم ہے اور جہاں شاہی چیمبر لین سے
 ترکی میں جاشنِ مابینچی کہتے ہیں اجلاس کرتا ہے۔

جب سے سلطانِ وقت نے یہاں مستقل سکونت اختیار کی ہو۔ اس کی
 اندرونی زینت اور بیرونی مضبوطی کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ
 اب وہ استانبول میں سب سے محفوظ اور سب سے پُر فضا جگہ ہے۔ یورپ
 میں سلطانِ العظم کے بیشمار مخالف ہیں جو اُن کی ہر بات میں نقص نکالتے ہیں
 اور اُن کے اچھے کاموں کو بھی کسی نہ کسی بُرائی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔
 انہوں نے اس تبدیلی مکان پر عجیب عجیب چیمگوئیاں کی ہیں۔ چونکہ پہلے
 بادشاہ اور محلات میں رہتے تھے۔ اس لئے ان کا قصر یلڈیز کو پسند کرنا خطرناک
 کے لئے آسان بہانہ بن گیا۔ بجائے اس کے کہ تسلیم کریں کہ بلحاظِ ہوا کی پاکیزگی
 اور صفائی کے۔ اور بلحاظِ منظر کی خوبصورتی کے اس قصر کو قدرتی طور پر ترجیح
 دی گئی۔ وہ یہ لکھتے ہیں کہ سلطانِ العظم ڈر کے مارے اس میں رہتے ہیں۔
 کیونکہ دوسرے محلات قُربِ شہر یا قُربِ دریا کی وجہ سے اُن کے لئے ہمیشہ
 باعثِ خطر رہتے۔ اور اُن کے خلاف سازشیں کرنے والے آسانی سے دُوسرے
 محلوں پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قسطنطنیہ میں بادشاہ کی زندگی
 کی حفاظت پر خاص توجہ ہے۔ مگر یہ ضرورت وہاں کی رعایا کے بعض شعور و نشت
 لوگوں کی کارستانیوں اور یورپ کے انارکسٹ لوگوں کی سازشوں کے باعث
 پیدا ہوئی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ کہ قصرِ یلڈیز کی اقامت کا
 باعثِ خوف ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ شہروں کی گنجان آبادی سے الگ رہنے کا خیال

جدید طبی تحقیقات نے ہر ملک میں پیدا کر دیا ہے۔ اور جس کو توفیق ہوتی ہو شہرے باہر رہنے کی فکر کر لیتا ہے جب قسطنطنیہ میں معمولی اُمر اور رُوسا تک اپنے شہر کے مکانات چھوڑ کر سال کے اکثر جہینے باہر دیہات کے کھلے بنگلہ نما مکانات میں کاٹتے ہیں تو کون تعجب کر سکتا ہے کہ یلدرم کی مرتفع کُرسی اور اس کا صحت بخش موقع سلطان المعظم نے اپنے لئے چُن لیا۔ خصوصاً اُس حالت میں جب اُن کے چچا کے وقت میں ہی اسے محل تفریح کی جگہ محل سکونت بنانے کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ جیسا کہ اُس زمانے میں "مابین" کی تعمیر سے ظاہر ہوتا ہے۔

تعمیر یلدرم کی عمارات کی طرز تعمیر جدید ہے اور اُن میں عثمانی طرز تعمیر کی خصوصیات کم نظر آتی ہیں۔ بہ خلاف بعض دوسرے محلات شاہی کے جن کا نقشہ سند کے راستے سے آنے والے مسافر کی نظر کو دُور ہی سے لہاتا ہے۔ اندرونی اُتار میں بھی گراں بہا اور خوبصورت تُرکی قالینوں اور ہر کیہ کے نفیس ریشمی پڑوں کے سوا شیشہ و آلات و سامان زینت زیادہ تر یورپی ہے۔ کہتے ہیں کہ سلطان المعظم کا مذاق زمانہ حال کی طرز تعمیر کا موید ہے اور حفظانِ صحت کے اصول جدیدہ کو مد نظر رکھنا نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اُنہیں خود فنِ تعمیر میں محفول دخل ہو۔ چنانچہ ایک مشہور یورومین کا بیان ہے کہ جب وہ محل کے اندر کام کرتا تھا تو کئی دفعہ اتفاق ہوا۔ کہ سلطان المعظم اپنے ہاتھ سے محل کے کسی حصہ کا نقشہ پینل سے کھینچ کر دیتے تھے۔ جس سے فن کی واقعیت اس درجہ ظاہر ہوتی تھی۔ کہ ماہرانِ فن حیران رہ جاتے تھے۔

یلدرم کی عمارات اور باغات کے احاطہ کرنے کے لئے ایک بہت لمبی چوڑی دیوار

ہے جس کے گرد گرد کے سپاہی ہر وقت پہرا دیتے ہیں۔ شمالی حصے میں شاہی سکونت کے مکانات ہیں۔ جن میں خود بادشاہ اور ان کے حرم اور شاہزادے رہتے ہیں۔ اس حصے کے گرد ایک اور دیوار ہے۔ جو ایک شش پہلو احاطہ بنائی ہے۔ حرم اس شش پہلو احاطہ کے مشرقی طرف ہے۔ اور کوشک شاہی سے اس میں آمد و رفت ایک گیلری کے ذریعے سے ہے۔ شاہزادوں کے مکانات اور حرم شاہی کے درمیان ایک اونچی دیوار حد فاصل ہے۔ قریب ہی ایک اور چھوٹا سا کوشک ہے۔ جسے سلطان المعظم نے ۱۸۹۲ء کے سخت زلزلہ کے بعد تعمیر کرایا۔ اس میں صرف گیارہ کمرے ہیں۔ مگر اس کی صنعت میں جدید فن تعمیر کی ساری کوشش صرف کر دی گئی ہے۔ اسے آتشزدگی اور زلزلہ دونوں کے صدمے سے محفوظ بنایا گیا ہے۔ اس چھوٹے سے محل اور بڑے محل کے درمیان مسقف راستہ ہے۔ اس کے گردا گرد ایک گیلری ہے۔ جس پر رات کو البانین کے سلخسوروں کا پہرا ہوتا ہے۔

کوشک شاہی کے ایک طرف چھوٹا سا تھیٹر بنا ہوا ہے جہاں کبھی کبھی یورپ کے مشہور تماشاگر تماشا کرتے ہیں۔ خصوصاً جب کوئی معزز مہمان یورپ سے آتے ہیں تو یہ تھیٹر ان کی مدارات کا ضروری حصہ ہے۔ کوشک کے دوسری طرف آبشار والی بازری ہے۔ جہاں سے باسفور کا منظر نہایت عمدگی سے دکھائی دیتا ہے اور جہاں بادشاہ کبھی کبھی وقت فرصت ٹہلنے جاتے ہیں۔ کوشک کے سامنے مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے۔ جس میں کئی مصنوعی آبشاراں گرتے ہیں۔ اس میں سلطان المعظم کا ہے گاہے کشتی چلاتے ہیں۔

ایک اور محل ہے جسے قصر مر اسم کہتے ہیں۔ اس میں تصاویر رکھی ہیں۔ چونکہ یورپ سب شاہی محلات میں یہ دستور ہے۔ کہ مشہور نقاشوں کی تصاویر جمع کی جاتی ہیں جس میں سے ہر ایک ہزار مارو پے دام پاتی ہے اور جو بہت نادر ہوں تو لاکھوں تک پہنچتی ہیں۔ یہ محل شش پہلو تعمیر کے باہر واقع ہے۔ اور سہ منزلہ بنایا گیا ہے۔ امپراطور ولیم ثانی جب سلطان المعظم کی ملاقات کو آئے تھے تو یہیں ٹھہرائے گئے تھے اور تصاویر کی گیلری ایسے ہی موقعوں پر کھولی جاتی ہے۔

یورپ کے تیراح اپنی کتابوں میں قصر یلڈیز کا ذکر کرتے ہوئے اکثر حیرت ظاہر کرتے ہیں کہ یلڈیز محض بادشاہ اور اس کے ذاتی خدام کے رہنے کی جگہ نہیں۔ بلکہ ایک شہر کا شہر ہے۔ جس کے باشندوں کی سب ضروریات کے لئے سامان اس کے اندر موجود ہے۔ چونکہ اُن کے ہاں یہ رواج کم ہے اس لئے انہیں تعجب ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ ایشیا کے مشہور بادشاہوں کے حالات سے واقف ہیں۔ اُن کی نظر میں یہ ایک ایسی چیز ہے جو لازماً شاہنشاہی ہے۔

محل کے اندر عمارات کا کام تھوڑا بہت ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اس لئے ایک حصہ اس کا تعمیر خانہ کے نام سے موسوم ہے۔ تعمیر ترکی میں مرمت کو کہتے ہیں اور اس تعمیر خانہ میں لوہاروں۔ ترکھانوں اور معماروں کے کارخانے شامل ہیں ایک کارخانہ ظروف چینی کا بھی یلڈیز کے احاطے کے اندر ہے۔ جس میں چینی کے نہایت نفیس برتن بنتے ہیں۔ اس کا منشاء صرف محل کی ضروریات کے لئے عملاً برتن بہ کفایت مہیا کرتا ہے۔ بلکہ صنعت کا ایک تجربہ ہے۔ جس کی بنا پر اوکارخانے ملک میں بڑے جاسکتے ہیں۔ اس کے دیکھنے کی اجازت خاص طور پر حاصل کرنی

پڑتی ہے۔

یلدیز میں ایک سلاح خانہ بھی ہو جس میں ہر قسم کے ہتھیار پڑانے اور سننے۔
مشرقی اور مغربی رکھے ہیں۔ ونچسٹر۔ مارٹینی۔ موزر۔ بندوقیں اور کرپ اور
میکسم تو ہیں سب یہاں موجود ہیں۔ یہ یگیزین کامیگزین اور عجائب خانے
کا عجائب خانہ ہے۔

اس کے سوا ایک اور عجائب خانہ بھی ہے جس میں ایک ذخیرہ قلمی کتابوں
کا ہے۔ کچھ پڑانے ظروف چینی۔ کچھ جو اہرات اور کچھ نمونے مختلف صنائع
کے ہیں۔ ایک حصے میں نیچرل ہسٹری کا عجائب گھر ہے۔ جہاں طرح طرح کے
جانور ٹھیس سے بھرے ہوئے شیشوں کی الماریوں میں بند ہیں۔ یہیں ایک
عمدہ رصد گاہ ہے جس میں علم ہیئت کا سامان بخوبی ہتیا کیا گیا ہے۔

محل کے باہر جو جامع حمید یہ نماز جمعہ اور سلاطین کے لئے بنی ہے۔ اس کے
سوا دو اور مسجدیں محل کے اندر ہیں۔ جن میں سے ایک خود سلطان المعظم اور
اور اراکین خاص کی نماز کے لئے محل شاہی کے قریب ہو۔ اور دوسری گارد
کے سپاہیوں کی نماز کے لئے ہے۔

چار اہل شاہی ہیں جن میں سے ایک خاصہ سواری کے گھوڑوں کے لئے
مخصوص ہو اور تین اور ہیں جن میں سے ہر ایک میں کوئی ایک سو گھوڑے رہتے
ہیں۔ ان میں سے ایک نہایت ہی جدید سامان سے آراستہ ہے۔ اہل صبل کے
قریب سواری کا مدرسہ ہو۔ وہاں شاہزادوں کو سواری کی تعلیم دی جاتی ہے۔
اس مدرسہ کے قریب ایک سایہ دار گیلری بنی ہے۔ جہاں سے کبھی کبھی بادشاہ

خود بچوں کی تعلیم کا معاہدہ کرتے ہیں۔ خود جوانی میں سواری کا بہت شوق رکھتے تھے اور اب بھی وقت ضرورت نہایت عمدہ سوار ہیں۔ انہیں گھوڑوں کے سوا اور حیوانوں اور جانوروں کے پالنے کا بھی شوق ہے۔ اس لئے ایک خاصہ چڑیا گھر قصر لیدز میں ہے۔ باغ پر بھی ان کی توجہ خاص ہے۔ اور اس لئے باغ میں بہت سے نادر درخت ہیں اور درختوں کو مختلف پیوند لگانے کے تجربے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ گارد کے سپاہیوں کے سوا جو سات ہزار کے قریب ہیں اور جن میں مختلف افواج سلطانی کے چیدہ دستے شامل ہیں۔ تھینڈا کوئی پانچ ہزار آدمی محل کے اندر رہتے ہیں۔ مستورات حرم اور ان کی لونڈیاں اور خواجہ سرا لائے۔ شانہ زادے اور ان کا اپنا اپنا شاف۔ چیمبر لین اور ان کے ماتحت ملازمین۔ ایڈیکانگ۔ دربان۔ باغبان۔ باورچی۔ سٹیس اور دیگر خدام یہ سب محل کی آبادی کا باعث ہیں اور ان میں سے اکثر کے لئے سطح شاہی سے کھانا پکا پکایا آتا ہے۔

محل کے سب حصوں کا مختصر سا بیان آیا۔ لیکن مابین کا ذکر باقی ہے یہی وہ حصہ ہے جس سے رعایا کے معزز افراد اور سرکاری اہلکاروں اور خاص خاص مہمانوں کو اکثر کام پڑتا ہے۔ مجھے اپنے زمانہ قیام میں کئی بار مابین بھائیوں جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں میں نے حاجی علی پاشا بخش مینچی اور تحسین پاشا باش کاتب اور عزت پاشا کاتب ثانی اور غالب بے ترجمان اول رئیس شریفیات کے کمرے دیکھے اور ان سب سے ملاقات کی۔ یہ لوگ نہ صرف محل کے اہلکاروں میں اعلیٰ ترین رتبے رکھتے ہیں۔ بلکہ انہیں امور سلطنت میں بھی دخل ہے۔ کیونکہ سب لے اب انہیں وزارت کا رتبہ اور پاشا کا خطاب مل گیا ہے۔ اس وقت غالب بے تھے۔

ضروری امور خود سلطان المعظم کے ہاتھ میں ہیں اور یہ لوگ گویا اُن کی زبان اور قلم ہیں۔ جن کے ذریعے وہ وزراء کے دولت اور دوسرے اہلکاروں کے نام عموماً احکام جاری کرتے ہیں۔

ان میں سے ہر اہلکار کے پاس متعہ دکرے ہیں۔ جن میں سب سے بڑے کمرے حاجی علی پاشا کے ہیں۔ ایک کمرہ نشست عام کا۔ ایک کمرہ مشورہ خاص کا۔ ایک کمرہ کھانا کھانے کے لئے۔ ایک کمرہ نماز کے لئے اور ایک کمرہ ملازمین کے لئے۔ ان کمروں کی آرائش نہایت سادہ ہے۔ کوئی تصویریں وغیرہ ان میں نہیں دیواروں کی زینت کے لئے قد آدم آئینے اور فرش کی زینت کے لئے بڑے بڑے قالین۔ میز کرسی اور چند زاید کرسیاں ملاقاتیوں کے لئے۔ ان سب کمروں میں برقی روشنی ہے۔ اور یہ اس لئے قابل ذکر ہے کہ محل کے باہر ایک آدھ ہٹل کے سوا برقی روشنی استانبول میں کہیں نہیں۔

محل کے اندر جانا سوائے اُن لوگوں کے جنہیں دربان پہچانتے ہوں یا جنہیں عہدہ داروں میں سے کسی نے خود بکوالیا ہو۔ آسان نہیں۔ جب کوئی انہی جائے تو بہت کچھ پیش ہوتی ہے۔ دربان پہلے اُس کا کارڈ مانگتے ہیں۔ پھر اُس سے پوچھتے ہیں کہ کس سے ملنا ہے۔ پھر اُس عہدہ دار سے جا کر دریافت کرتے ہیں اور وہ اجازت دیتا ہے تو اندر جانا ملتا ہے۔

باہن کا دروازہ جامع حمیدیہ کے مقابل ہے اور اسی دروازہ کے ساتھ وہ چبوترہ ہے۔ جہاں سے سلاطین کی شاندار رسم دیکھی جاتی ہے اور اسی کے اوپر وہ نشستگاہ ہے جہاں سفراءِ دول خارجیہ یا اور مغربہاں سے سلاطین کے من جھانے

جاتے ہیں۔ وزراءِ دولت جب سلام شاہانہ کے لئے آتے ہیں تو وہ بھی اسی دروازہ سے داخل ہوتے ہیں اور پہلے بخش ماہیچی کے ہاں جاتے ہیں۔ وہ جا کر ان کی طرف سے عرض کرتا ہے اور اسی کے توسط سے انہیں جواب ملتا ہے۔ جب کوئی ضروری موقعہ ہوتا ہے تو خود انہیں بار مل جاتا ہے۔ ورنہ باتش ماہیچی کے ذریعے سے حکم صادر ہو جاتا ہے کہ کسی امر میں جس میں وہ استمراج کرنے آئے ہوں کیا کارروائی مناسب ہو۔ اسی سلسلے سے نظم و نسق سلطنت کی گئیں کھینچتے کھینچتے نیکیتہ سلطان المعظم کے ماتھے میں آگئی ہیں اور وزراء محض ان کے احکام کی تعمیل کرنے والے ہیں۔ ملک کی فلاح کے لئے اس طریق حکومت کے مفید ہونے کی نسبت بہت اختلاف آرا ہے۔ لیکن دشمن و دوست سب مُقر ہیں۔ کہ سلطان المعظم حکمتِ عملی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور یہی سبب ہو کہ قصرِ لیدیز نہ صرف اصطلاحی طور پر بلکہ فی الحقیقت اس وقت دولتِ عثمانیہ کا مرکز بن گیا ہے۔ اور بابِ عالی جو پہلے امورِ سیاسی سے مخصوص اور نظامِ مملکت کا زبردست مرکز تھا۔ میدانِ سیاست میں دوم درجے کی قوت رہ گیا ہے۔



باب عالی

صدر اعظم۔ وزیر صیغہ خارجیہ اور وزیر صیغہ داخلہ کے دفاتر جس عمارت میں
میں اُسے ”باب عالی“ کہتے ہیں۔ یہ نام اس عمارت کو یا تو تعظیماً دیا گیا کیونکہ وزیر اے
سلطنت میں یہ تینوں عہدے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اور یا اس لئے کہ تین وزراء
کا ایک مقام اجلاس ہونے کے سبب ضروری ہوا کہ ایک جامع نام رکھا جائے۔
ورنہ یہ عمارت نہ تو بہت بلند ہے۔ اور نہ اس کا دروازہ ایسا شاندار ہے کہ اس نام کا
مستحق ہو۔ تاہم یہی اعتبار سے زمین کا یہ ٹکڑا جس پر یہ دفاتر بنائے گئے ہیں عجیب
انقلابات دیکھ چکا ہے۔ ایاصوفیہ کے بالکل قریب واقع ہے۔ اندر تاج قسطنطنیہ کے سر کے
کاسین اسی قریب میں ہونا چاہئے۔ پُرانے محلات قیصری اسی کے پڑوس میں تھے اور
ان کی جگہ بعد کو پہلا محل سلطانی بھی اسی کے قریب بنا۔ اب اُس محل کے ایک حصے
میں پُرانے تخت اور تاج اور جواہرات اور مالک غیر کے بادشاہوں کے ٹھکانے وغیرہ
رکھے ہیں۔ اُس حصے کو خزینہ ہایوں کہتے ہیں اور دوسرے حصے میں وہ بے بہا
امانت ہو جس پر استانبول جس قدر ناز کرے بجا ہو۔ یعنی علم نبوی و دیگر تبرکات۔
استانبول کا جدید ”وزنہ خانہ“ یا عجائب گھر بھی باب عالی کے قریب واقع ہے۔ اور عدالت
کی کچھیاں بھی کچھ دور نہیں۔ غرض ہر اعتبار سے یہ جگہ دلچسپ ہے۔ دولت عثمانیہ کو یورپ
کی اور سلطنتوں کی طرح نہایت سیار جاس شہری نہیں رکھتی جن میں رعایا کے انتخاب کئے ہوئے
قائم مقام اگر معاملات ملکی کو سلجھائیں۔ تاہم مجلس شہری کا ایک ٹھکانچہ اس میں موجود ہے۔

یعنی ایک وزیر کی مجلس جسے ترکی میں مجلس وکلا کہتے ہیں اور دوسری مجلس شوریٰ دلت جس میں ایک کثیر تعداد اراکین کی ہر جن کا کام وضع قوانین میں مدد دینا ہے۔ اس مجلس کی رکنیت کج کل زیادہ تر اعزازی استیازہ گیا ہو۔ ورنہ اسے علما اسلمنت میں چندان دخل نہیں۔ ان دونوں مجلسوں کے اجلاس بھی باب عالی میں ہوتے ہیں۔ مجلس وکلا کا تو ہفتے میں ایک بار ضرور جلسہ ہوتا ہے۔ اور مجلس شوریٰ کے جلسے بھی وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔ وزیر اعظم مجلس وکلا کا صدر شین ہوتا ہے۔ دیگر اراکین حسب ذیل ہیں :- شیخ الاسلام۔ وزیر جنگ۔ وزیر بحریہ۔ وزیر داخلہ۔ وزیر خارجہ۔ وزیر عدالت۔ وزیر مال۔ وزیر اوقاف۔ وزیر محکمہ تعلیم اور وزیر تعمیرات۔ یہ وزراء ترکی میں عموماً ناظر کے لقب سے ملقب ہیں اور استانبول کے رواج کے مطابق اُن کے القاب یوں لکھے جانے چاہئیں :- خارجہ ناظری۔ مالیہ ناظری۔ عدلیہ ناظری۔ دفاتر استانبول میں تعطیلوں کا عجیب ستور ہے۔ اکثر جگہ ہفتے میں دو دن تعطیل ہوتی ہے۔ ایک جمعہ کو جو اسلامی تعطیل کا روز ہے اور سلطنت اسلامی ہونے کے سبب یہاں کے لئے موزوں ہو اور دوسرے کیشنبہ کو کیونکہ دفاتر میں عیسائی بہت ملازم ہیں اور اُن کے لحاظ سے اُس دن تعطیل کر دی جاتی ہے۔ اس سبب سے گو عثمانیوں کی بے تعصبی ثابت ہوتی ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ کاروبار سرکاری پر دو روزہ تعطیل کا اثر اچھا نہیں پڑ سکتا۔ اور انہیں کوئی تدبیر نکالنی چاہئے۔ جس سے ہفتے میں ایک تعطیل پر سب بلا کر کفایت کریں۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں اگرچہ عدالتوں وغیرہ میں عملہ ہندوستانی ہو اور ہندوستانیوں کو کیشنبہ سے کوئی خصوصیت نہیں۔ لیکن وہ سب خوشی سے کیشنبہ کی تعطیل منظور کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں ہفتے

میں ایک ن آرام کے لئے لینا ہے وہ مل جاتا ہے۔ اور انگریزی حکام کو اپنا مذہب نہ تو
تعمیل کا مل جاتا ہے جس پر دوسروں کو جو پابندِ سلسلہ ملازمت ہیں۔ کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔
باب عالی میں ان دو تعطیلوں کے سوا ایک اور دن بھی ماتحت اہلکاروں کے
لئے نیم تعطیل کا ہوتا ہے۔ چہار شنبہ کے دن عموماً مجلسِ کلا ہوتی ہے۔ اُس دن
چونکہ افسرانِ محکمہ اُس میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سوائے اُن کی پیشی
کے اہلکاروں کے دوسروں کو نسبتاً فرصت ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہو کہ جب سے
کاروبارِ سلطنت کے بوجھ کا پلڑا قصرِ لیدز کی طرف جھک گیا ہے اور بہت سے
کام جو پہلے باب عالی سے سرانجام پاتے تھے اب وہیں سے براہِ راست کر لئے
جالتے ہیں۔ تب سے باب عالی کا کام ہلکا ہو گیا ہے۔ اس پر بھی چونکہ از روئے
قاعدہ سب عرضداشتیں اپنے اپنے مناسب محکموں کے ذریعے سے پیش ہونی چاہیں
اور اُن کے متعلق ضابطہ کی کارروائی لازم ہے۔ اس لئے کاغذ کے گھوڑے
باب عالی میں بھی کافی دوڑتے رہتے ہیں۔ اور اُن عہدہ دارے جلیلہ کی جن کا
یہ صدر مقام ہے ظاہری شان پوری طرح قائم ہے۔

باب عالی کی عمارت طرزِ اطالیہ پر بنی ہوئی ہے اور گواحاظہ کے فرش کے
بے مروت ہونے اور جس زمین پر بنی ہے اُس کے بے قاعدہ و نشیب و فراز کی وجہ
سے باہر سے اُس کا کچھ بہت اچھا اثر دیکھنے والے پر نہیں پڑتا۔ لیکن اندر سے
وسیع اور بارونق ہے۔ وسطی دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک بڑا امتیضِ نال
ہے جس میں مسلح سپاہیوں کی ایک معقول تعداد کھڑی رہتی ہے۔ اس کمرے کی
بغل میں ایک طرف وہ کمرے ہیں جن میں صدرِ عظم ہر مانی نس فرید پائنا بیٹھے

ہیں۔ اور دوسری طرف مجلسِ وکلا اور مجلسِ شوریٰ کے اجلاس کے کمرے ہیں۔
 ہال میں داخل ہوتے ہی جانبِ راست اگر مڑ جائیں تو ایک برآمدے سے ہوتا
 ہوئے نظارتِ خارجہ کے دفاتر آجاتے ہیں اور وہاں ایک وسیع اور شاندار
 گونہایتِ سادگی سے آراستہ کمرہ ہر اسلنسی توفیق پاشا مشہور وزیرِ خارجہ کا ہے۔
 وزیرِ داخلہ ہر اسلنسی مدوح پاشا کے دفتر بھی عمارت کا ایک معقول حصہ گھیرے ہوئے
 ہیں۔ گوجن کمرے میں وہ خود بیٹھتے ہیں وہ بہت بڑا نہیں۔ ان بڑے دفاتر
 کے علاوہ کئی چھوٹے دفاتر متفرق کاموں کے لئے یہیں ہیں۔ انہی میں صغیر
 مطبوعاتِ اجنبیہ ہے جہاں مختلف زبانوں کے اخبارات کے ترجمے ترکی میں
 ہو کر صدرِ اعظم کی خدمت میں بھیجے جاتے ہیں اور جو حصے ان تراجم کے وہ
 ضروری سمجھتے ہیں سرائے ہمایوں میں بھیج دیتے ہیں۔ اگرچہ سرائے میں خود بھی
 ایک علیحدہ محکمہ اس غرض کے لئے ہے۔ مطبوعاتِ اجنبیہ کے دفتر کے قریب
 ہی مطبوعاتِ داخلہ کے معائنہ کا دفتر ہے۔ جس میں سنسور اور اس کے معاونوں کا
 ایک رشتمہ قلم کئی مضمون نگاروں اخبار نویسوں مؤلفوں اور مصنفوں کی محنت کے
 نتائجِ بیرجمی سے ردی کر دیتا ہے۔

بابِ عالی کے دفاتر کوئی چار پانچ گھنٹے کے لئے کھلتے ہیں۔ شاذ ہوتا ہے
 کہ دوپہر سے پہلے ان میں کچھ جانِ نظر آئے۔ ٹھیک دوپہر کے قریب سب
 اہلکار اپنی اپنی جگہ موجود ہوتے ہیں اور چار بجے کے بعد دوپہر سے دفترِ برخاست
 سنسور انگریزی اور فرانسیسی میں اس عہدہ دار کو کہتے ہیں جس کا کام اخباروں کی آزادی کی
 روک تھام ہو۔ اور جسے ان کی ہر قسم پر پزیر نہ کر سکیں گا حق حاصل ہو ۱۲

ہونے لگتے ہیں اور پانچ بجے تک برخاست ہو جاتے ہیں۔ بہ خلاف اس کے یلدرم
میں آٹھ نو بجے صبح سے یک شام تک حاضر باشی ہے۔ اس لئے جن اہلکاروں
کی خدمات اُدھر منتقل ہو جاتی ہیں۔ انہیں غیر معمولی کام کرنا پڑتا ہے۔

ان وقروں کے کھلتے ہی وزیر خارجہ اور صدر اعظم کے ہاں دُولِ خارجہ
کی سفارتوں کے اہلکاروں کی بھیڑ ہو جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے
سفارتوں کے سرکاری اور ترجمان ذاتی ملاقات اور گفتگو کے طلبگار ہوتے ہیں
اور خود سفراء دُول بھی اکثر ملاقات کو آتے رہتے ہیں۔ اور ان سب کی تعداد
اس قدر ہے کہ بابِ عالی کے بیشتر اہلکاروں کا وقت وہی لوگ لے جاتے ہیں
صیغہ خارجہ کا وقت لینے کا تو انہیں حق بھی ہے کیونکہ وہ اسی مطلب کے لئے
موجود ہے۔ مگر صدر اعظم اور ان کے علیے کا بہت سا وقت بھٹم کر کے یہ لوگ
ملک کے اندرونی کاروبار پر ظلم کرتے ہیں۔ کیونکہ اسی نسبت سے اُن امور پر
توجہ کرنے کی فرصت کم رہ جاتی ہے۔

کچھ آب و ہوا کی تاثیر۔ کچھ مزاجوں پر مشرقیت کا اثر۔ بابِ عالی اور تانبو
کے دیگر دفاتر میں یہ رواج عجیب دیکھا۔ کہ دفتر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے اہلکار
سگرت اور قہودہ پیتے اور ملاقاتیوں کو پلاستے رہتے ہیں۔ اخلاق کے اعتبار
سے جہاں ملاقاتیوں کی تواضع قابلِ ستائش ہے۔ وہیں کام کے جلد ختم ہونے میں
یہ بات مارج ہے۔

دفتروں میں اہلکاروں کی کُرسیاں عموماً گتے دار۔ فخل پوش۔ اور نیچی
بیٹھنے کے لئے ان سے زیادہ آرام وہ چیز مشکل سے ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ نہیں کہنا

کہ وہ مستعدی اور بیداری کے لئے بھی ویسی ہی مفید ہیں۔

باب عالی میں زبانِ مرقوبہ ترکی ہے۔ اور تمام کاغذاتِ سرکاری۔ سوائے نظارتِ خارجہ کے اُن خطوط کے جو ممالکِ اجنبیہ کے جواب میں فرانسیسی میں لکھے جاتے ہیں ترکی میں ہیں۔ اہلکارِ ترکی نہایت خوشخط لکھتے ہیں۔ اور اکثر فرانسیسی بھی اچھی طرح لکھ اور بول سکتے ہیں۔ لیکن ترکی چونکہ ملک سے اور پرانی وضع کی روشنائی سے لکھتے ہیں۔ اس لئے لکھے ہوئے کاغذات کو خشک کرنے کی بھی پرانی ترکیب ان کے ہاں مرقوبہ ہے۔ کہ ریت سے سیاہی خشک کی جاتی ہے۔

میں نے پہلے یہ دستورِ مابین ہمایوں میں حاجی علی پاشا کے ہاں دیکھا تھا مجھے تعجب تو ہوا لیکن پھر یہ خیال آیا کہ پاشا موصوفِ پرانی وضع کے آدمی ہیں۔ اس لئے شاید جاوید استعمال کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن جب باب عالی کے فرانسیسی اہلکاروں کے سامنے میں نے رنگا رنگ کی ریگ دیکھی اور انہیں ریگ کاغذ پر ڈال کر اُسے سکھلاتے دیکھا۔ تو میں حیران ہوا کہ یورپ کی سرزمین پر بیسویں صدی میں یہ رسم باقی ہو۔ میں اس رسم پر اعتراض کرنے کو تھا کہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ اُس روشنائی کے لئے یہی ترکیب موزوں ہو اور وہ روشنائی ترکی لکھنے کے لئے اور ملک سے لکھنے کے لئے دوسری روشنائی سے بہتر ہے۔ اس لئے جمہوری ہو۔ چونکہ میں دفاتر کی زبانیں بدستور ترکی رہنے کا خواہاں ہوں اور ترکی لکھنے والوں کے نزدیک وہ قلم۔ وہ سیاہی اور وہ ریگ لازمِ ضروری میں سے ہیں۔ اس لئے مجھے ریگ کی ضرورت کو بھی تسلیم کرنا پڑا۔ اب مجھ سے وہ پر خاشش باقی نہیں جو پہلے دن تھی۔

زبان دانی میں عثمانیوں کو خاص ملکہ معلوم ہوتا ہے۔ باب عالی میں قریب قریب ہر زبان کے جاننے والے موجود ہیں۔ فرانسیسی تو تعلیم یافتہ عثمانیوں میں سے اکثر کو خوب آتی ہے۔ اس کے سوا باب عالی کے کئی اہلکار جرمن بہت سے بولتے ہیں اور چند انگریزی بھی جانتے ہیں۔ انگریزی داں اصحاب میں دو صاحبوں سے ملاقات کا مجھے موقع ملا۔ ایک توسعد الدین بے جو صیغہ خارجہ کے ترجمان اول ہیں۔ اور جن کے توسط سے مجھ سے اور وزیر خارجہ سے باتیں ہوتی ہیں۔ اور دوسرے حقی بے جو مجلس شوریٰ کے رکن ہیں۔ دونوں نہایت خیر خواہ دولت۔ ہمدرد اسلام اور بیدار مغز نظر آئے۔ باب عالی تاریخ عثمانیہ کے لمبے سلسلے میں کبھی ارباب کمال سے حالی نہیں رہا۔ اور اس وقت بھی خالی نہیں۔ عثمانیوں میں اس وقت بہت سے باکمال ایسے بھی ہیں جو برسر کار نہیں۔ اور خانہ نشین ہیں۔ لیکن جو لوگ عہدوں پر مامور ہیں ان میں بھی اچھی تعلیم و تربیت کے آدمیوں کی کمی نہیں اور جب دولت عثمانیہ اپنے مامورین کی قابلیتوں سے پوری طرح کام لے گی۔ تو بہت سے نقصان کا اس کے مخالفین آئے دن اس زور سے چرچا کرتے ہیں۔ رفع ہو جائیگے۔ استانبول کی سب سرکاری عمارتوں کی یہ صفت قابل تعریف ہے۔ کہ نمازیں ایک جگہ عمارت میں مخصوص ہے۔ چنانچہ باب عالی میں بھی ایک فراخ کمرہ نماز کے لئے رکھا گیا ہے جہاں مامورین نماز ظہر ادا کرتے ہیں۔ ادھر ایاصوفیہ سے این کا آواز بلند ہوا اور ادھر مسلمان اہلکار دنیا کے دھندے چھوڑ کر خدا کی طرف رجوع

ایا صوفیہ

سجدہ کی آرزو ہو تو قسطنطنیہ میں ایا صوفیہ سے زیادہ کونسی جگہ اس کیلئے
موزون ہوگی۔ زمین کا یہ قطعہ کوئی ڈیڑھ ہزار برس سے عبادت گاہِ خلائق بنا
آتا ہے۔ پہلے جن کے پاس تھا وہ اپنے عقائد کے موافق اس میں پیش کرتے
تھے۔ اب جن کے پاس ہے وہ اپنے عقیدے کے موافق اپنے معبود کی اطاعت
کرتے ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قطعہ زمین کی قسمت میں قسام ازل نے
ہر انقلاب کے بعد عبادت گاہ بننا لکھا ہے۔ یہ تو عام طور پر معلوم ہو کہ جب
مسلمانوں نے اس پر قبضہ کیا۔ اُس سے پہلے یہ مشرقی یورپ کا سب سے بڑا
اور سب سے مشہور گرجا تھا۔ مگر یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس گرجے
سے پہلے جسے مسلمانوں نے موجود پایا۔ یہ بنا کئی دفعہ خراب ہو چکی تھی۔ مگر
یہ اُجڑنے کے بعد پھر آباد ہوتی رہی اور ہر صدی میں اُسی ایک مقصدِ عبادت کے
لئے مخصوص رہی۔ یہاں کہا جاتا ہے کہ قسطنطین اعظم نے اس کی بنیاد رکھی اور
اور اس کے بیٹے کے عہد میں اس کی بحال ہوئی۔ سترہویں صدی میں بڑی شان کے
ساتھ اس کی سرِ مناسبتِ ادائیگی ہوئی۔ مگر ساری محنت اور سارا پیسہ جلد برباد ہو گیا
کیونکہ سترہویں صدی میں آگ نے اس کو پویندِ زمین کر دیا۔ اور چونکہ اُس عمارت میں زیادہ
ترکری سے کام لیا گیا تھا فقط راکھ کا ایک ڈھیر اس کا نشان رہ گیا۔ پھر طوفانِ سیل
ثانی نے اسے از سر نو تعمیر کیا اور سترہویں صدی میں اس کا افتتاح ہوا مگر ابتداء سے ۱۸۵۳ء

جامع اياضوفيه





بہارِ گل
کے گلشن
نئے جہاں
نورِ حیات
روشنی
نایک شہید
جس کے منہ
ہوئے نہا گیا
پس پرچہ
عرب کا سامان
کس سے پہنچا
لوگوں کے ہاتھ
یوسف سے
مردانہ
نہ پرچہ
نہ شخص
نہ ہوش
نہ کلام
نہ کلام

میں پھر آگ نے اسے آیا۔ لیکن نفسِ وار یہ رکھ کے ٹھہر سے جی اُٹھی اور آتشِ نگی کے چالیس دن بعد قیصرِ حبشین نے اسے بنوانا شروع کر دیا۔ عمارت پانچ سالوں میں بننے جاری رہی۔ اور ۳۳۵ء کے آخری مہینے میں اس کی رسمِ افتتاح پھر ادا کی گئی۔ قیصرِ حبشین نے اپنی ساری ہمت اس کے مضبوط اور عالیشان بنانے میں صرف کر دی تھی۔ لیکن اس دفعہ بھی اس گرجے کو دیر تک عافیت نہ نصیب ہوئی۔ ۳۵۵ء میں ایک شدید زلزلہ آیا اور اُس سے اس کا سب سے بڑا گنبد ٹوٹ کر گر پڑا اور گرجے کے منبر اور قربانگاہ وغیرہ اس کے نیچے دب کر ٹوٹ گئے۔ ۳۸۵ء میں پھر اُسے بنایا گیا۔ گنبد ۲۵ فٹ اور بلند کیا گیا اور اس میں سولہ دریچوں کی بجائے چالیس دریچے روشنی کے لئے رکھے گئے۔ عجیب اتفاق یہ کہ اس گرجے کو بارہا ان مصائب کا سامنا ہوا اور تاریخِ مذکورہ کے بعد بھی کئی دفعہ زلزلوں سے سخت نقصان اُسے پہنچتا رہا۔ اور اس کے کئی حصے گر گئے۔ مگر جب سے یہ عمارت مسلمانوں کے ہاتھ آئی ہو اور خدا سے واحد کی عبادت کے لئے وقف ہوئی ہو۔ اُس وقت سے ایسا کوئی حادثہ نہیں ہوا جس سے یہ بالکل تباہ ہو جاتی اور اس کے از سر نو بنانے کی ضرورت پڑتی۔ سلاطینِ عظام نے اس کی مرمت کی طرف ہمیشہ توجہ رکھی ہو۔ ۱۱۷۱ء میں سلطان عبد المجید مرحوم نے بہت روپیہ لگا کر اس کے سب حصوں کی معقول مرمت کرا دی تھی اور اس کے بعد حال میں سلطان المعظم کی توجہ خاص سے سن ۱۲۹۷ء میں بڑے گنبد اور مسجد کے حصہ مغربی کی مرمت وسیع پیمانے پر ہوئی ہے۔ یہ بات قابلِ داد ہے کہ سلاطینِ عثمانی نے اس کی اندرونی عمارت کو حتی الوسع بحال رکھا ہے۔ اور صرف وہ تبدیلیاں کی ہیں

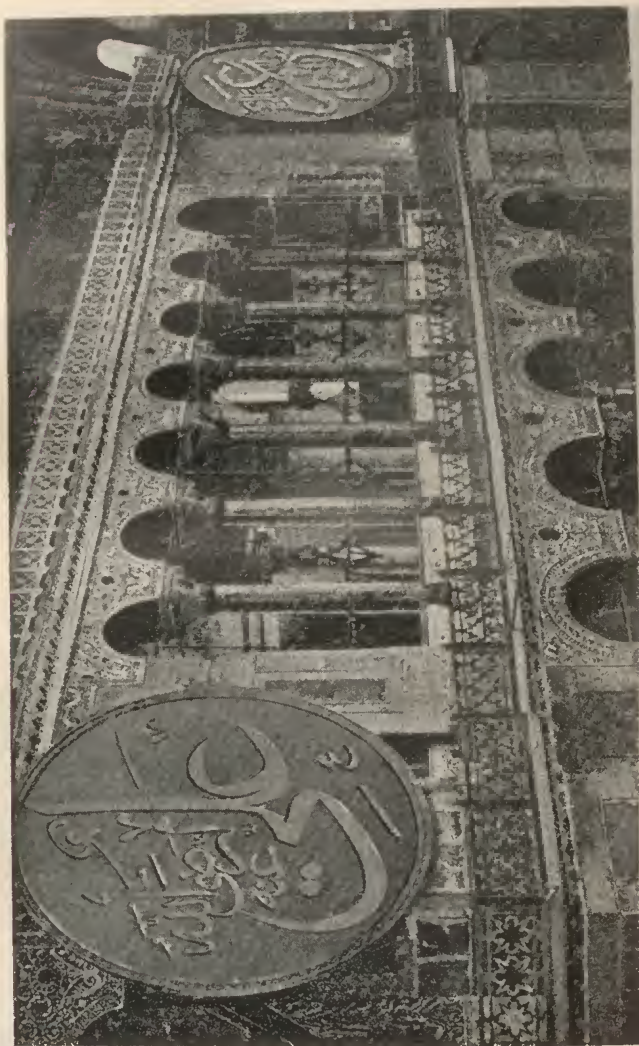
جواز روئے مذہب لایہ تھیں۔ اس لئے کیا عیسائی کیا مسلمان دونوں کے لئے یقیناً
 آج تک دلچسپ چلا جاتا ہے۔ تاریخی مذاق رکھنے والے عیسائی تیلح اس کے ہر پانے
 حصے کو شوق سے دیکھتے ہیں اور اس کے نقشے کھینچتے ہیں۔ اس کی مختلف زبانوں
 کی فرمتوں کا پتا چلاتے ہیں اور تحقیقات کرتے ہیں کہ کون سا حصہ بالکل اُسی طرح باقی
 ہے۔ جس طرح حبشین کے زمانے میں تھا اور کون سا اس کے جانشینوں کے
 وقت کی خبر دیتا ہے۔ مسلمان جاتے ہیں اور خدا کی قدرت دیکھ کر حیران ہوتے
 ہیں۔ کہ کیسے کیسے انقلاباتِ زمانہ سے یہ عالیشان بناؤں کی عبادت گاہ بنی۔
 یہ عمارت باہر سے نہ پہلے کچھ بہت خوبصورت تھی۔ نہ اب ہے۔ گنبد اس کے
 باہر سے سادہ رکھے گئے تھے اور اسلام نے جو مینار بڑھائے ہیں وہ بھی سادہ
 ہیں۔ اور چونکہ اس کے آس پاس جو عمارات اس کے بعد بنی ہیں ان کی گریباں
 اونچی ہیں اور ارد گرد کی زمین کی سطح کو اونچا کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کی بلندی
 بھی باہر سے کم نظر آتی ہو۔ پہلے دن جب ریل میں قسطنطنیہ پہنچتے وقت مجھے کسی
 نے کہا۔ کہ وہ جامع ایاصوفیہ ہے۔ اور میں شوق سے ریل کی کھڑکی سے دیکھنے لگا۔
 تو مجھ کو حیرت تھی کہ ایاصوفیہ کی اس قدر تعریف کس بات کی ہے۔ لیکن اندر جا کر وہ حیرت
 رفع ہو گئی۔ اور ایک اور قسم کی حیرت اس کی جگہ جاگزین ہوئی۔ یہ حیرت عمارت
 کی اندرونی خوبیوں کے اثر نے پیدا کی۔ عیسائی ماہرانِ تعمیر لکھتے ہیں کہ دنیا بھر میں اور
 کہیں عیسائیوں نے اصول فن کی رو سے اتنا مکمل اور ایسا خوبصورت گرجا نہیں بنایا
 اگر محض گنبد سے فیصلہ کریں تو یہ نتیجہ برہمی ہے۔ روم کے مشہور پینتھون کے گنبد
 کا قطر ایک سو تیس فٹ ہو۔ سینٹ پطرس کے شہرہ آفاق گرجے اور فلانس کے

بڑے گرجے کے گنبد ایک سو چھٹیس فٹ کا قطر رکھتے ہیں اور لندن کا سب سے بڑا گرجا سینٹ پولس ایک سو آٹھ فٹ کے قطر کا گنبد رکھتا ہے۔ حالانکہ ایسا صوفیہ کے گنبد کا قطر ایک سو اسی فٹ ہی۔ یہ بڑا گنبد چار بڑے محرابوں پر قائم ہے جو طول میں پچھترہ فٹ اور عرض میں پچیس فٹ ہیں۔ گنبد کے نیچے کا حصہ جو ایسا صوفیہ کا وسطیٰ قطعہ ہے۔ ایک بڑا مستطیل ۱۱ دو سو پچاس فٹ لمبا اور ایک سو فٹ چوڑا ہے۔ اس کے دائیں بائیں دو مندر عمارت ہیں۔ جس کی ایک طرف کی گیلری کا طول عرض ۲۰.۵ x ۲۶ فٹ ہے۔ تو دروازے ایسا صوفیہ میں داخل ہونے کے ہیں اور ان میں سب سے بڑا دروازہ نہایت شاندار ہے۔ گو ان دروازوں کی شان میں اب یہ فرق آگیا کہ کہ عمارت کے نشیب میں ہونے کی وجہ سے دروازہ سے چند سیڑھیاں اتر کر اندر جانا ہوتا ہے۔ حالانکہ پہلے جب ارد گرد کی زمین اس عمارت کی گرسی سے نیچے تھی تو دروازہ چند سیڑھیاں چڑھ کر آتا تھا۔

وسط مسجد میں داخل ہوتے ہی سنگ مرمر کا ایک بہت بڑا ٹکڑا پانی سے بھرا رکھا ہے۔ جس میں وضو کے لئے پانی ہے۔ یہ اُس موقع پر ہے۔ جہاں گرجے کے زمانے عیسائی پانی کا ایک بڑا برتن رکھا کرتے تھے۔ اور اُس برتن پر عبارت لکھی ہوئی تھی۔۔ صرف منہ دھونا کافی نہیں۔ اپنے گناہوں کو دھو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ کے عیسائیوں میں عبادت سے پہلے وضو کا طریق جاری تھا اور اب وہ اس سے غافل ہو گئے ہیں اور جیسا کہ مسلمانوں میں وضو گناہوں کے دھونے کا نشان ظاہری سمجھا جاتا ہے۔ ایسا ہی عقیدہ عیسائیوں میں بھی تھا۔

سنگ مرمر کے برتن سے ذرا آگے وسط عمارت کی طرف بڑھیں تو عین گنبد کے

نیچے جاتے تھے ہیں۔ اوپر کو نظر اٹھائیں تو سب سے پہلے لگا دھچکت کے خوبصورت
 کام پر جا کے جمتی ہے اور اس کے بعد اُس کے چاروں گوشوں میں ایک عجیب
 ہیئت کی چار تصویریں ایک دوسرے کے مشابہ دیکھ کر حیران ہوتی ہیں کہ یہ
 کیا تصویریں ہیں اور مسجد میں ان کا کیا کام۔ یہ گر جا ہونے کے وقت کا بقیہ
 ہیں۔ چاروں مشہور فرشتے جن کے نام نصاریٰ دیہود اور مسلمانوں کی کتابوں
 میں مذکور ہیں۔ اس گنبد کی چھت پر دکھائے گئے تھے۔ چونکہ اُن کا نہ منہ بنایا
 گیا ہے نہ سر۔ اس لئے یہ تصویریں محو کئے جانے سے بچ گئیں۔ باقی جو تصاویر
 اس گرجے میں تھیں وہ سب مٹا دی گئی ہیں اور دو تین جو مٹ نہیں سکتی تھیں۔
 وہ ترکیب سے ڈھانپ دی گئی ہیں۔ تاکہ مانع نماز نہ ہوں۔ یہ تصویریں محض رنگ
 و روغن سے بنی ہوئی نہیں بلکہ موزائیک کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ فن اطالیہ میں کثرت
 مروج ہے۔ پتھر کے چھوٹے چھوٹے رنگین ریزے اس خوبی سے چھنے
 جاتے ہیں کہ انسانی صورتیں۔ گل بوٹے۔ کوہ و دریا جو چاہو درو دیوار پر نمایاں
 ہو جاتا ہے اور دیوار کا جزو بن جاتا ہے۔ دیوار ٹوٹ بھی جائے تو اس کے
 رنگ میں فرق نہیں آتا ہے۔ اور اس کے ٹکڑے عجائب گھروں میں رکھے جاتے ہیں۔
 دیواروں کی زینت میں اسلام نے یہ اصلاح کی ہے کہ تصویروں کی بجائے
 اللہ و رسول کا نام بڑی بڑی لوحوں پر خوشخط تملیق حروف میں لکھوا کر لٹکا دیا ہو۔
 چاروں اصحاب کے نام نامی ویسے ہی علی حروف میں لکھے ہوئے لٹک رہے
 ہیں۔ محراب کی زینت دو بہت بڑی سوم ہتیوں سے ہو۔ جو محراب کے دونوں
 طرف استادہ ہیں۔ کوئی چار گز لمبی اور اسی نسبت سے موٹی ہیں۔ یہ بھی گرے



الغردون جامع الاصفهیر

۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰

11

کی آتش کا بقیہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ عیسائیوں کے گرجاؤں میں عموماً موم کی بڑی بڑی بتیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ محض روشنی کا ذریعہ تھا اور اس پر کوئی شرعی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے مسلمانوں نے اسے بحال رہنے دیا۔ رفتہ رفتہ ان بتیوں کا یہاں تک رواج ہو گیا۔ کہ اس کے بعد استانبول میں مسلمانوں نے جو مساجد خود بھی بنائیں ان میں بھی محراب کے پاس ایسی بتیاں استناد ہیں۔ لیکن یہ محض زیبائش کے لئے ہیں۔ شاید کسی نہایت ہی خاص موقع پر جلتی ہو۔ عام طور پر روشنی کے لئے بڑے بڑے آہنی جھاڑ چھت سے لٹکے ہوئے ہیں۔ جن میں سے ایک ایک کے بیسیوں چھوٹے چھوٹے بتور کے چراغ آویزاں ہیں۔ جب کبھی یہ سب روشن کئے جاتے ہیں۔ تو عجب سماں ہوتا ہے۔

مسجد کا منبر نہایت بلند ہے اور دوسری مساجد میں جہی اس کی تقلید کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں منبر اس قسم کا نہیں ہوتا۔ اس کے زینوں کے تحت تمام پراکے غزوفی شکل کا مینار سا ہوتا ہے جس پر ہلال نشان اسلامی ہے۔ امام خطبہ پڑھتا ہے تو سب سے اوپر کے زینے پر یا اس سے ایک زینہ نیچے کھڑا ہوتا ہے اور اس کے دونوں جانب دو جھنڈے آویزاں ہیں کہتے ہیں۔ اب یک چاند برس پہلے ایام صوفیہ کا امام خطبہ کے وقت تلوار بھی ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ رسم نہیں ہے۔ منبر کی پہلی سیڑھی کے سامنے ایک دروازہ ہوتا ہے۔ جس پر یا سبز پردہ لٹکا رہتا ہے۔ یا دروازہ بند رہتا ہے۔ امام کا ایک لباس مخصوص ہے۔ جو وہ جمعہ کے دن پہنتا ہے۔ اور جس کے رنگ سے اس کے رتبے کی تمیز ہوتی ہے۔ ان سب رسموں میں عیسائیت اور اسلام اور مشرق اور مغرب دونوں کے

صدیوں تک ایک دوسرے کے پہلو پہ پہلو رہنے کے آثار ویسے ہی نمایاں ہیں جیسے ہندوستان کے مسلمانوں کی بعض عادات میں ہندو مسلمانوں کے تمدن کے میل جول کے ذریعہ اسلام جب پہلے گیتان عرب سے چلا تھا تو سادگی کی ہی زینت تھی۔ اور اسے عامے کے رنگ اور قبائلی وضع کے امتیازات سے کچھ بے نیاز کیا صوفیہ کا ذکر ختم کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حبشین کے زمانے کی تعمیر کے متعلق چند حکایات جو عیسائیوں میں مروج ہیں نقل کر دیں ان میں سے کئی درست ہیں اور کئی مفسر نے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر دونوں دلچسپ ہیں۔ جنوری ۱۳۳۵ء کی آتشزدگی کے بعد جب حبشین کو یہ گرجا دوبارہ بنانے کا خیال آیا۔ تو اس نے ارادہ کیا کہ ایسا گرجا بنے جس کی پہلے کبھی تعمیر نہ ہو جس دن سے عمارت شروع ہوئی۔ اس کی نگرانی کا کام اس نے اپنے ذمے لیا۔ دوپہر کو بجائے محلوں میں آرام کرنے کے وہ خود جا کر تعمیرات کا نگرانی کیا کرتا تھا۔ اور ایسی عقیدت سے آتا تھا جیسے زائر کسی مقدس مقام کی زیارت کو جاتے ہیں۔ گاڑھے کا ایک سادہ سا جامہ پہنے۔ سر پر ایک رومال باندھے اور عصا ہاتھ میں لئے قیصر حبشین دوپہر کی دُھوپ میں کام کی نگرانی کے لئے اکٹھا ہوتا تھا اور محاروں مزدوروں کی ہمت اپنی مثال سے بڑھاتا تھا۔ کسی کو انعام دیکر خوشش کرتا تھا۔ اور کسی کو زخمی گفتار سے گرویدہ۔ اس کوشش کے باوجود پانچ سال دس مہینے میں عمارت ختم ہوئی تھی۔ یہاں تک تو روایت تاریخی سب سے۔ لیکن اس کے ساتھ اس زمانے کے عقیدت مند عیسائیوں نے عجیب حاشیہ چڑھائے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ جب خزانے میں مصارف تعمیر کے لئے

روپیہ کافی نہ رہا۔ تو ایک فرشتہ سونے کی تھیلیاں مخپروں پر لا کر لایا اور بادشاہ
 کو دے گیا کہ باقی عمارت اس سے مکمل کرو۔ عمارت کا نقشہ بھی جسطین کے ایک
 فرشتے نے خواب میں بتایا تھا۔ یہاں تک تو مصالفاۃ نہیں۔ خواب کی حقیقت
 انسان کے لئے ایک رازِ سرستہ ہو۔ لیکن روپیہ تو فرشتہ خواب میں نہیں دے گیا۔ بلکہ
 بیان کیا جاتا ہے۔ کہ دن کو بیداری کے عالم میں لایا اور جسطین کے حوالے کر گیا۔
 انوس ایسے معجزات کا دروازہ اب بالکل بند ہو گیا۔ اور اب کسی کو یہ خوش قسمتی نیک
 سے نیک کام کے لئے بھی حاصل نہیں ہوتی کہ روپیوں کی بوریاں بندھی بندھائی
 آسمان سے چلی آویں۔ تاریخ کی رو سے یہ بوریاں رعایا کی محنت کی کمائی سے وصول
 کی گئی تھیں اور ہر ادنیٰ و اعلیٰ پر ایک خاص کس اس شاہی شوق کے لئے لگایا گیا تھا
 جسطین نے گو اس عمارت سے اپنے مذہب کی خدمت کی اور اس کی مستعدی اور
 سرگرمی اور موٹے کپڑے پہن کر اس کا درویشانہ اس خدمت کے لئے پھرنا یہ
 چیزیں گویا ظاہر کرتی ہیں کہ مذہب کی قوت اس سے یہ کام کراہی تھی۔ لیکن عمارت
 کی تکمیل پر جو کلمات اس کی زبان سے نکلے وہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ مذہبی
 عقیدت کے ساتھ نمود کا شوق بھی اس کے دل میں زور سے جوش زن تھا۔
 یہ دیکھ کر کہ اس عمارت کے ذریعے وہ حضرت سلیمان کے نام کی شان کو مات کرنا
 چاہتا تھا۔ اس کے مذہبی جوش کی قدر ادھی رہ جاتی ہے۔ تکمیل عمارت پر جو
 لفظ اس نے استعمال کیے وہ یہ ہیں :- خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ایسے
 بڑے کام کے انجام دینے کے لائق سمجھا۔ اے سلیمان! میں تجھ سے سبقت
 لے گیا ہوں۔“

اس زمانے میں اس بات کا اندازہ کرنا مشکل ہو کہ شان سلیمانی سے بہت پہلے
 کی کوشش میں جسطین نے کتنا روپیہ خرچ کیا۔ مختلف بیانات ہیں اور مختلف امیں
 بعض نے لکھا ہے کہ گرجے کی عمارت ابھی زمین سے دو ہاتھ بلند نہیں ہوئی
 تھی کہ پینتالیس ہزار پونڈ یعنی چھ لاکھ پچھتر ہزار روپیہ صرف ہو چکا تھا اور کل خرچ
 تین لاکھ بیس ہزار پونڈ یعنی اڑتالیس لاکھ روپیہ ہوا۔ یہ کچھ بیجا تخمینہ نہیں اور وقت
 اشرفی کو جو قیمت تھی اس کو ذہن میں رکھ کے حساب لگائیں تو آج کل کے حساب
 سے اس کی لاگت اس رقم سے کئی گنا زیادہ بڑھتی ہے۔ موجودہ صورت میں لاکھ
 اندازہ اقلًا دس لاکھ پونڈ یعنی ڈیڑھ کروڑ روپیہ کیا جاتا ہے۔

جسطین کو چند دفعہ اپنی رعایا کے بعض لوگوں سے اس عمارت کے
 واسطے جسے وہ پہلی عمارت سے زیادہ وسیع بنانا تھا۔ زمین حاصل کرنے کی
 ضرورت پیش آئی۔ اس کی تفصیل کی نسبت عجب وائتیں ہیں۔ ایک طرف ایک
 خواجہ سرائے کی زمین تھی۔ دوسری طرف ایک کفش دوز کی۔ تیسری طرف ایلیر کوں
 نامی دربان کا مکان اور چوتھی طرف ایک بیوہ بڑھیا کا گھر تھا۔ نقشہ جو تجویز ہو چکا تھا
 اس کے مطابق یہ سب زمینیں درکار تھیں۔ خواجہ سرائے نے اپنی خوشی سے
 اپنی ملک گرجے اور بادشاہ کی نذر کی۔ کفش دوز اڑ بیٹھا۔ کہ میں نہیں دیتا۔
 بڑی شکل سے اس شرط پر راضی ہوا کہ بادشاہ اصلی داموں سے دُگنے دام دے
 اور اس کے سوا گھوڑ دوڑ کے دن اسے یہ حق عطا کرے کہ اس کے داخل میدان
 ہونے پر اسی طرح خوش آمدید کے نعرے بلند ہوں جیسے خود قیصر کے لئے۔ قیصر نے
 یہ شرط منظور کر لی اور اس کا مکان لے لیا۔ دربان کی باری آئی تو اس نے بھی

بیچنے سے عذر کیا۔ اُس دربان کو گھوڑ دوڑ دیکھنے کا بھرتی تھا۔ بادشاہ کے ایک
 مشیر نے اُسے عین دوڑ کے وقت بند کر دیا۔ وہ منتیں کرنے لگا کہ مجھے جانے دیجئے۔
 مگر تفسیر نے حکم دیا کہ جب یہ مکان کے بیچ نامہ پر دستخط کر دے تو اسے جانے دیا جائے۔
 یہ مرحلہ بھی اس طرح طے ہوا۔ اب رہ گئی غریب بیوہ عورت۔ اس کے گھر کی قیمت کا اندازہ
 پونڈ کیا گیا اور بادشاہ نے اسے پیغام بھیجا کہ یہ رقم لیکر گھر خالی کر دے۔ اس نے
 کبک بھجوا۔ کہ میں بچپن نہیں چاہتی اور بھوش میں اگر پیام برکو کہا کہ پچاس شرفیاں تو
 کیا اگر تو پچاس قطار سونے کے لائے۔ جب بھی میں اپنا مکان نہ دوں۔ بادشاہ
 پیغام سن کر ناراض نہیں ہوا۔ بلکہ خود اس کے گھر چل کر گیا۔ اور اُس سے برکت
 کی درخواست کی کہ یہ زمین اس نیک کام کے لئے درکار ہے۔ مہربانی کر کے دیدے۔
 اس پر پیرزن ابیدہ ہو گئی اور اُس نے بادشاہ کے سامنے ادب سے دواؤں ہو کر
 عرض کی کہ یہ پانچیر جلد اذبحہ سے سعادت قبول کی جائے۔ اور اس کے عوض میں مجھے
 فقط یہ احسان ہو کہ میری قبر اس مقدس مکان کے ایک گوشے میں بنے۔ تاکہ مجھے
 اس کا انعام آخرت میں ملے۔ بادشاہ نے بخوشی اس شرط کو منظور کیا۔ اور کیا
 عجب ہو کہ ثواب کے دفتر میں اس غریب بڑھیا کا اثیار جملین کی لاکھوں شرفیوں
 کے ثواب سے سبقت لے گیا ہو ۵

اگر بریاں کند بہرام گورے
 نہ چوں پائے مرغ باشد ز مورے
 جہاں عیسائیوں میں اس واجب التعظیم مقام کی نسبت طرح طرح کے قصے مشہور ہیں
 وہیں مسلمانوں کے ہاں بھی طرح طرح کی روایات اس سے مربوط ہو گئی ہیں۔ ایک
 روایت یہ ہے کہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں تشریف لانے

کے دن صرف عجم میں قصر نوشیروان ہی نہیں بل گیا تھا۔ بلکہ مغربی دنیا میں اس عایشانِ بے کی بنا بھی کانپ گئی تھی اور اس کا ایک حصہ زلزلے سے گر گیا تھا۔ مسجد کی ایک دیوار میں سوراخ سا ہے۔ جس کی مٹی اُن پڑھ مسلمان عورتیں متبرک سمجھتی ہیں۔ میں نے چند فراہجہ پوش عورتوں کو اُس سوراخ میں انگلیاں ڈال ڈال کر اس کی مٹی آنکھوں سے ملتے دیکھا۔ اس کے علاوہ وہ ہاتھ جو حقیر کے ستون میں گڑا ہوا ہے اور جس کی نسبت عیسائیوں کی روایتیں بیان ہو چکی ہیں۔ اس کی نسبت عوام اہل اسلام جو سلطان محمد فتح کو قریب قریب ولی کامل مانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چونکہ رجا قبلہ رونہ بنا تھا۔ اس لئے اُسے جانب قبلہ کرنے کے لئے محمد فاتح نے زور سے ایک ہاتھ مار کے اُس کا صُخ بدل دیا۔ اور یہ نشان اُس ہاتھ کا ہے۔ گویا اُس ہاتھ کو سلطان فاتح کا ہاتھ بنانے میں مسلمان اور عیسائی دونوں کی روایات متفق ہیں۔ صرف یہ فرق ہو کہ مسلمان اس کی وجہ کچھ اور بتاتے ہیں اور عیسائی کچھ اور۔

محراب مسجد کے قریب بڑے بڑے قلمی قرآن مجید رطلوں پر دھرے ہیں۔ آنے جانے والے انکی زیارت کر سکتے ہیں اور بہت سے لوگ وہاں بیٹھے نہیں پڑھتے بھی رہتے ہیں۔ جس وقت میں اور میرے ہمراہی وہاں گئے۔ تو ایک غریب لڑکا حفظ قرآن میں مشغول تھا۔ ہم نے اُس سے کہا کہ ذرا قرأت تو سناؤ۔ اُس نے نہایت عمدگی اور صحت سے پڑھ کر سنایا جس سے ہم بہت محظوظ ہوئے۔

قرآن شریف کا جسے ہم سب حکمتوں کا خلاصہ مانتے ہیں۔ ایسا صوفیوں میں پڑھا جاتا ہے بہت معز و ن معلوم ہوا کیونکہ صوفیہ کے معنی یونانی میں دلنش و حکمت کے ہیں۔ اور یہ اگر جا حکمت کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ اب جامع اسلامی ہو گیا تو بھی قرآن مجید کی بذلت کا حکمت



خبریه جانان کادر دوازده

[illegible]

خزینہ و سرائے قدیم

ایاصوفیہ اگر مذہبی تاریخ کا خلاصہ ہو۔ تو سرائے قدیم قسطنطنیہ کی دنیاوی ہٹری کا لب لباب ہو۔ یہ پُرانا محل قیصروں کے زمانے میں بھی بادشاہوں کی سکونت کی جگہ تھا اور سلاطین عثمانی بھی مدتوں اس میں ٹھکن رہے۔ اگر وہ رونق وہ گہما گہمی جو سلطان محمود ثانی کے عہد تک اس سرائے کا حصہ تھی۔ یہاں سے منتقل ہو کر پہلے باسفور کے دوسرے کنارے قصر چراغاں اور طولمہ باغچہ میں چلی گئی۔ اور پھر وہاں سے یلدیز کے حصے میں آگئی۔ تو کیا ہوا۔ قدیم عظمت کے بہت سے نشان اب تک اس محل میں رکھے ہیں اور خزینہ ہمایوں اور خرقہ شریف کی بدولت اسے سلاطین عظام سے گارنٹعلق ہو۔ کیونکہ خلفائے عثمانی کی خلافت کی سندات گویا یہاں محفوظ ہیں۔ اور خلیفہ وقت کے لئے ہر سال ماہ رمضان میں ایک فقیہ یہاں آنا اور زیارات اور تبرکات کو کھولنا ایک فرض منصبی ہے۔

ہستانبول میں اس مقام کو محض سرائے یعنی محل کے نام سے یاد کرتے ہیں اور سرائے قدیم اس محل کو کہتے ہیں جو موجودہ سرعسکت کی عمارت کی جگہ واقع تھا۔ اور جہاں سلطان محمد فاتح رہتے تھے۔ لیکن چونکہ اب اس محل کی جگہ سرعسکت کی عمارت بن گئی ہے اور اس کے بعد اس سرائے سے پُرانا محل کوئی نہیں۔ کیونکہ اس کے کچھ بھی کسی

طولمہ باغچہ۔ اینٹیاں نشانہ محل ہو۔ اسے ترکی میں طائے کہتے ہیں۔ مرقعہ دولہ باغچہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اکثر فلک میں طے کا یہی تلفظ ترکی میں ہو۔ شاہی فرمان کے ذریعہ تھر کو دیکھ سکتے ہیں لیکن چونکہ یہ سرائے قیام میں نہیں تھی

حقہ سلطان محمد فاتح کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس لئے اسے سراسر قدیم کہنا بیجا نہیں۔
اس کے موقعہ اور ابتدائی تاریخ کا حال مختصراً اس بیان سے جو ایک جدید کتاب سے
منقول ہے۔ واضح ہو جائیگا :-

”جہاں باسفور کا پانی بحیرہ مرمر سے جاملتا ہے اُس نقطہ کے قریب ایک پہاڑ
چٹان اپنے سلسلے سے آگے بڑھ کر باسفور میں آگھسا ہوا جس سے ایک اس کی صورت
پیدا ہو گئی ہے۔ اس اس پر محل واقع ہے۔ شاہان بازنطائن کے محلات صد سال
تک اسی لفرب مقام پر رہے ہیں۔ اویہیں اُن کے بعد جب ترکوں نے یہ شہر
لے لیا تو سلاطین کی سکونت رہی۔ اس کا بیشتر حصہ شاہان بازنطائن کے محلات
سے گھرا ہوا تھا۔ اس کے گرد مضبوط دیواریں اور بلند برج بحر و بر دونوں طرف سے
اسے محفوظ بنانے کے لئے تھے۔ اور وہ دیواریں اور برج کسی قدر اب بھی باقی ہیں
قسطنطین اعظم۔ طبودوسیوس ثانی اور قسطنطین ان دیواروں اور برجوں کے بنانے والے
تھے۔ مگر موجودہ دیوار پالیو کوکوس نے اُس وقت بنوائی تھی جب اُس نے ۱۲۶۱ء
میں لاطینیوں سے اس پائیتخت کو چھین لیا تھا۔ اس چار دیواری کے اندر داخل ہونے
کے چار دروازے ہیں۔ ”دمیر قیو“ یعنی آہنی دروازہ جو ریل کے سٹیشن کے قریب ہے
”صعوق چشمہ قیو“ جو دفتر وزیر خارجہ کے متصل ہے۔ گل خانہ قیو جو ساحل بحیرہ مرمر پر
واقع ہوا و باب ہائوں جسے سلطان محمد فاتح نے بنوایا تھا اور جو مدت تک سلاطین کے
آنے جانے کے لئے محل کا بڑا دروازہ رہا۔ یہ سراسر آجکل دو حصوں میں منقسم ہے
خزینہ ہمایوں جس میں جانے کے لئے ارادہ سلطانی حاصل کرنا پڑتا ہے اور بیرونی میں

۱۵۰ کتاب مرقوفہ یونانی خود ستانوں کے ہنسنے والے سیاہیوں میں سیاہیوں کی شمع کرنے میں زبان گریزی کی ہے

جس میں کتب طیبہ شامہ - کتب صنائع - کمال - موزہ انطیق اور سینت ارین کا گرجا واقع
ہیں۔ جس دروازہ سے خزینہ والے حصے میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کے اور گرجے کے
درمیان ایک کھلا صحن ہے جسے مینی چری فوج کا صحن کہتے ہیں۔ اور اس صحن میں ایک
پُرانا چنار ہے جس پر قدیم زمانے میں بغاوت کے مجرموں کو جلا دھانسی دیا کرتا تھا
اور جس کے سائے تلے مینی چری فوج کی کئی سادشیں ہوئی تھیں۔

خزینہ ہمایوں محل کے جس حصے میں ہے اُس میں خزانے کے سوا کئی چیزیں
دیکھنے کی ہیں۔ مسجد جس میں عظم نبوی - خرقہ شریف - پہلے خلفا کی تلواریں اور دیگر
تبرکات مقفل رہتے ہیں۔ اسے باہر سے ہی دیکھنا ملتا ہے۔ کیونکہ یہ صرف پندرہویں
رمضان کو کھولا جاتا ہے۔ پُرانا شاہی کتب خانہ جس میں مشہور کتابوں کے عمدہ عمدہ قلمی
نسخے رکھے ہیں۔ دیوان خانہ جہاں سلطان سفرائے دول خارجیہ سے ملاقات کیا کرتے
تھے۔ بغداد کو شک اور حمید یہ کو شک۔ ان سب چیزوں کے دیکھنے کے لئے
مجھے اور میرے رفیق سفر کو فرمانِ سلطانی عطا ہو گیا تھا۔ اس لئے ہم قیودان حسام الدین
یافعی و مخصوص حضرت شہریاری کے ہمراہ وہاں پہنچے۔ حسام الدین بے ایک مغز خاندان

الہ انگریزی لفظ "موزیم" یعنی عجائب گھر کو فرانسیسی میں "موزے" کہتے ہیں اور ترکی میں یہ لفظ فرانسیسی سے
اگر موزہ بن گیا ہے۔ یہ لفظ اردو میں آسانی کھپ سکتا ہے۔ انطیق بھی انگریزی لفظ انٹلوٹی کی فرانسیسی
صورت جو ترکی اور جدید فارسی میں "واج" یا "جی" کے ترجمہ اردو میں ہم عمداً یا مشیاً قدیم کہتے ہیں۔
شیخ مشیر حسین صاحب قدوسی تعلق دار گدیہ ضلع بارہ بکی اویں ہم سفر تھے۔ اور ستانبول کی ساری بیسویں دہ
یرے شریکِ حال رہے۔

یہ لفظ کپتان کی ترکی صورت ہے۔ ایڈی کانگ کو ترکی میں یاد رکھتے ہیں۔

کے حکیم یافتہ نوجوان ہیں۔ وہ نہایت حسدِ لاق سے مجھ سے فرانسیسی میں باتیں کرتے گئے۔ راستے میں جابجا پولیس کی چوکیاں آئیں جن کے باہر سپاہی پہرہ پر رہتے ہیں۔ انہوں نے ہر جگہ قیودان صاحب کی وردی پہچان کر فوجی آداب سے سلام کیا۔ اسی طرح باب ہمایوں پر سپاہیوں نے سلام کیا اور بے روک ہیں اندر جانے دیا۔ پہلے صحن سے گدز کرب دوسرے دروازہ میں داخل ہوئے تو ایک سفید ریش بزرگ نے جن کا نام ادھم بے ہی اور جو وہاں خزانہ دار کا عہدہ رکھتے ہیں اپنے کمرہ سے نکل کر استقبال کیا۔ یادِ مخصوص نے فرمانِ شاہی اُنکو دیا۔ انہوں نے کھول کر پڑھا۔ میں غماض سے بٹھایا اور آدمی کو کہا قہوہ لائے۔ ہم ابھی قہوہ پی رہے تھے۔ کہ خزانہ ہمایوں کے ماتحت ملازمین کوئی بیس کے قریب خزانہ کے دروازہ کے سامنے قطار باندھ کر دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ خزانہ دار نے ہم سے کہا کہ چلتے۔ اور خود بڑھ کر خزانہ کی چابیاں نکالیں۔ یہ چابیاں ایک ریشمی بٹوے میں رکھی ہوئی تھیں۔ خزانہ کا دروازہ بہت پرانی وضع کا تھا اور اس کا قفل بھی نہایت پرانے نمونے کا اور بہت بڑا تھا۔ جب یہ دروازہ کھل گیا تو ایک اور قفل نظر آیا۔ خزانہ دار نے اُسے بھی کھولا۔ اس پڑ سب ملازمین کمرے کے اندر جا کر چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔ اور ہم نے خزانہ کو دیکھنا شروع کیا۔

پہلی چیز جس پر نگاہ پڑی تھی وہ جواہرات سے جگمگاتا ہوا ایک ٹا تختہ زر تھا۔ یہ تختہ سلطان سلیم اول کے عہد میں ایران سے آیا۔ شاہ اسماعیل کا تخت ہے۔ بیشمار بڑے بڑے نادر جواہرات اس میں جڑے ہیں۔ لعل و زمرد اور گہرائے آبدار کا مناسب ملاپ عجب حسنِ افزا ہے۔ اس تخت کے پیچھے ایک دیوے کے قریب

سلطان عبدالغزیر حرم کا ایک برنجی مجسمہ ہے۔ جس میں وہ گھوڑے پر سوار نظر آتے ہیں۔
 ترکی زرہ بکتر کے نمونے بھی اس کمرہ میں بکثرت ہیں۔ وہیں طرف شیشے کی ایک
 الماری میں پالیو کوکوس کی تلوار ہے۔ یہ باز نطن خان خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔
 بایں ہاتھ کی الماری میں زمرہ کے دستے ملتے شمشیر اور لولو و مرجان سے بھرے ہوئے
 سونے چاندی کے طاس رکھے ہیں۔ طلائی کام کی زینتیں اور صغیرین پوش بھی اسی کمرہ
 میں سجے ہیں۔ کمرہ کی اشیاء رنادرہ ختم ہو چکیں تو خزینہ دار صاحب عین اور گیلری
 میں لے گئے۔ وہاں ہم نے ایک اور تخت دیکھا جس کی ساخت عثمانی ہو اور ایرانی طرز
 سے بالکل جدا۔ عثمانی صنعت کا یہ نمونہ اپنی جگہ کچھ کم شاندار نہیں۔ یہ تخت گولکری کا ہے۔
 گولکری نہایت ہی گراں بہا صندل و آبنوس کی ہو اور قیمتی سیپ اور ہیرے موتی اس میں
 جڑے ہیں۔ اس کی چھت سے ایک بہت بڑا دانہ زمرہ آویزاں ہے۔ نہایت ہی خوش رنگ
 جس کا قطر چار انچ ہے۔ اس کے قریب ایک الماری میں سلطان مراد راج کا بڑا زرہ بکتر
 ہے جو انہوں نے ۱۶۳۸ء میں فتح بغداد کے وقت پہنا تھا۔ زرہ بکتر کے پسٹل کا
 منجر رکھا ہے۔ جس کا دستہ معہ میان کے ایک حصہ کے مرصع بہ الماس ہو۔

خزینہ کے تین کمرے ہیں۔ مگر سب سے قیمتی چیزیں اسی پہلے کمرے اور اسی
 گیلری میں رکھی ہیں۔ دوسرے کمرے میں نیچے روم۔ یونان۔ عرب اور روم کے سکوں
 کا ایک بہت بڑا مجموعہ ہے۔ اور اوپر سلاطین کے لباس کے نمونے ہیں۔
 سلطان محمد فاتح کے زمانے سے لیکر سلطان محمود مصلح کے زمانے تک سب سلاطین
 کے لباس اور ان کے تغییر و تبدل یہاں نظر آسکتے ہیں۔ اگر نہیں نظر آسکتے تو ان کے
 پہرے۔ کیونکہ کپڑے کے بت بنا کر انہیں شانہ لباس پہنا دیا گیا ہو اور ان کے

منہ نہیں بنائے گئے۔ بلکہ بجائے اس کے بڑے بڑے عمامے اُس حصے کو جہاں منہ ہوتے چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ لباس اعلیٰ بنائے جاتے ہیں اور نقادوں کا خیال ہے کہ اگر سب نہیں تو ان میں سے بعض لباس ضرور وہی ہیں جو فی الواقع اُن سلاطین نے پہنے۔ ہر عمامے پر ایک کلفی ہے جو بیش بہا جو اہر سے مصرعہ اور ہر مکر بند میں ایک خنجر بندھا ہے۔ جس کا جڑا دوستہ ایک سے ایک اعلیٰ اور صنعت کے امتبار سے نادر ہے۔ اب یہ سب صورتیں خوابِ خیال ہو گئیں۔ کبھی کبھی غزابیوں کوئی پُرانی وضع کا ترک وہ لباس پہنے ہوئے نظر آتا ہے۔ جس پر اُن سلاطین کے عہد میں امیر و غریب سب ناز کرتے ہونگے۔ کہ شاہی شین تھا۔ اب نیاز مانہ۔ نئے فیشن۔

تیسرے مکرمہ کا بیشتر حصہ اُن تحائف سے پُر ہے جو مختلف ملکوں کو تاجدار نے وقتاً فوقتاً سلاطینِ عثمانی کو بھیجے۔ یورپی تحفوں میں یہ بات شروع سے نظر آ رہی ہے کہ کم خراج بلائیں۔ کوئی گھڑی بھیدی۔ کوئی بندوق بھیدی۔ اپنی صنعت کا نمونہ دکھادیا۔ کُلّ جَدِیدِ لَدُنْہ کے لحاظ سے تحفے کی قدر بھی ہو گئی اور گرہ سے روپے بھی بہت نہ گئے۔ اس مکرمہ میں خلفائے بغداد کی بڑی بڑی تصویریں پُرانے وقتوں کی بنی ہوئی اور چند تصویریں سلاطین کی بھی تھیں۔ گرافٹوں کہ ہمیں پُرانی تصویروں کے نام علیحدہ علیحدہ نہ معلوم ہو سکے۔

خزینے سے کلکرم دیوان خانے میں آئے۔ یہ یسماں اول کے عہد کی یادگار ہے۔ یہاں وزیرِ اعظم بیٹھ کر مہتمات سُنا کرتے تھے اور سلطانِ سفرائے دُول سے ملاقات کرتے تھے۔ اس مکرمہ میں ایک پانی کی ٹونٹی دیکھ کر ہم کسی قدر متعجب ہوئے

مگر جو حضرات ساختہ تھے۔ اُن میں سے ایک نے بتایا۔ کہ جب سلطان کسی سفیر سے باتیں کرتے تھے تو یہ ٹوٹی کھول دی جاتی تھی۔ تاکہ اس کے شور سے آواز باہر نہ ہو۔ اُن سے اور کوئی شخص دروازہ پر کھڑا ہو کر کوئی سیاسی راز نہ معلوم کر لے۔

پس اس کے بعد کُتب خانہ دیکھا۔ یہ سلطان احمد ثالث کے وقت کا ہے اور اس میں سترہ سو کوئی تین ہزار عربی فارسی اور ترکی کتابوں کے قلمی نسخے ہیں۔ یہاں سلاطین کا مال بھی ایک مرقع تصاویر بھی رکھا ہوا اور قسطنطنیہ کی بعض دوکانوں میں جو پرانے سلطانین سے نظر کی تصاویر بچی ہیں۔ اُن میں سے اکثر اسی مرقع سے نقل کی گئی ہیں۔

کُتب خانے کے بعد ہمیں بغداد کو شک دیکھا گیا۔ بالکل مشرقی رنگ کی چیز ہے اور سامانِ ایشیائے مشرقی ہے۔ باسفور کا نظارہ اس کو شک سے مختلف نہایت لاجواب ہے۔ اس کے دروازہ پر ایک فارسی شعر لکھا ہوا جسے پڑھ کر بات فرزندِ مساختہ دل نے آئین“ اکہا۔ وہ شعر یہ ہے

کشادہ باد بہ دولت ہمیشہ این درگاہ
بحق اشھدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

بغداد کا سلطان مراد رابع نے اس کو شک کو فتح بغداد کے بعد آکر بنایا۔ کیونکہ وہاں پہلی بار انہوں نے اسی نمونے کا ایک شاہی مکان دیکھا تھا۔ جو انہیں بہت پسند آیا اور انہوں نے عہد کیا کہ اپنے دار الخلافہ میں ایسا ہی تیار کرائینگے۔

بغداد کو شک کے قریب مجید یہ کو شک ہے۔ یہ ایک جدید عمارت ہے۔ اس عمارت میں عموماً اُن لوگوں کی جنہیں یہ محل دیکھنے کی اجازت دی جاتی ہے بطور مہمانی سی بیٹھنے کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ خادم پرانے ڈھنگ سے قہوہ اور ترکی مٹھائی

اور فیس گنقد لاکر پیش کرتے ہیں۔ اور مہمان تھوڑی دیر آرام لیکر عنایت شاہی
کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوتے ہیں۔ ہم نے بھی مجید یہ کو شک میں بیٹھ کر
تھوڑی دیر پانی کا نظارہ دیکھا اور ٹھسائی کھائی۔ آخر اظہار تشکر کر کے اٹھے
اور بوڑھے خزانہ دار اور ان کے ملازمین نے ہم سے رخصت ہوتے وقت
نہایت خلوص سے انخوسا اسلامی کا اظہار کیا۔





ہرے قدیم کے
جو سلطان احمد
سیدیں اسلام
بخت نظر آتے
ست اور وضو فر
نہیں قاب ہو
ساجد خیر جاری کا
یہ ہے جو اور
سینہ پندہ ہیں
یہ میں طرف ٹو
نہا ہوں ہمشہور
سکھائی پیا
سے کے یہ
سے کے

چشمہ سلطان احمد

چشمہ امیر طور ولیم

سرائے قدیم کے باب ہمایوں کے مقابل ایک چھوٹی سی مگر نہایت خوبصورت عمارت ہے۔ جو سلطان احمد ثالث کی یادگار ہے۔ اسے چشمہ سلطان احمد کہتے ہیں۔ چشمہ اور سیلین اسلام کے اُن نشانات میں سے ہیں جو ہر مسافر اور رہگذر کو اس شہر میں بکثرت نظر آتے ہیں۔ اور ظاہر کرتے ہیں کہ یہ سستی ایسے لوگوں کی ہے جن کے ہاں مہارت اور وضو فرائض مذہبی کا رتبہ رکھتے ہیں اور جن کے ہاں پیاسے کو پانی پلانا داخل ثواب ہے۔ یہ چشمہ عموماً کسی کسی امیر نے اپنی زندگی میں بنوائے ہیں۔ کہ اُس کے بعد خیر جاری کا کام دیں۔ اکثر چشموں پر خوشخط عربی حروف میں کُل شے حَسْبُكَ مِنَ الْمَاءِ لکھا ہے۔ اور نیک نہاد بانیوں کے نام یا چشمے کی بنا کے تاریخی قطعے بھی دیواروں پر کندہ ہیں۔ ان کے علاوہ ہر مسجد کے احاطے میں ایک چشمہ ہوتا ہے۔ جس کے چاروں طرف ٹوٹیاں لگی ہوتی ہیں جن سے لوگ وضو کرتے ہیں۔ لیکن جو چشمہ خانقاہوں یا مشہور عمارتوں کے قریب یا بڑے بڑے رہگذروں میں بنے ہیں۔ اُن کے ساتھ پانی پلانے کی ایک سیل بھی ہوتی ہے۔ جس کے گرد ایک پتھر لگا ہوتا ہے اور اس کے پیچھے پانی پلانے والا حاضر رہتا ہے اور پانی کے آنچورے بکھر کر آئندہ روئند کے لئے موجود رکھتا ہے۔ بعض سیلیں سال بھر رواں رہتی ہیں اور

بعض اور رمضان میں کھلتی ہیں چشمہ سلطان احمد ان چشموں میں سے جہاں چشمہ اوسیل دیا
ہیں۔ مگر جو سال بھرواں نہیں رہتے۔ اُس پر ایک قطعہ تاریخ ترکی نظم میں لکھا ہوا ہے۔ جو
اس کے بزرگ مرحوم بانی کی طبع رسا کا نتیجہ ہے۔ عمارت متقیل ہے اور سفید سنگ
کی ہے۔ اور جو عبارتیں اس کی زینت ہیں وہ سنہری حروف میں سبز اور فیروزہ زین
پر لکھی گئی ہیں۔ تاریخ بنالہ ۱۲۷۷ھ ہے۔ جس وقت ہم نے اسے دیکھا اُس وقت سیل جاری
نہ تھی۔ لیکن جس آدمی کا فرض تھا کہ سیل کے رواں ہونے کے زمانے میں وہاں موجود
رہے۔ وہ حاضر تھا اور بوجہ فرصت دو چار شاگردوں کو قرآن مجید پڑھا رہا تھا ہمیں
پہلے لڑکوں کی قرآن خوانی کی آواز نے ہی خیال دلایا۔ کہ اس عمارت کے اندر جائیں۔
ورنہ سمجھتے کہ دروازہ بند ہوگا۔ دروازہ کھٹکھٹا کر ہم اندر گئے تو دیکھا کہ ایک غریب
بچوں کو پڑھا رہا ہے۔ وہ پچاس ہمارے جانے سے کسی قدر گھبرائے۔ کیونکہ انہیں
اپنے چھوٹے سے مدرسہ میں معلیٰ نے اور امتحان کی عادت نہ تھی اور ہم نے جا کر پوچھا
شروع کیا کہ کیا پڑھتے ہو اور کب سے پڑھتے ہو۔ مگر خیر جلد استاد شاگرد ہم سے
آشنا ہو گئے اور بے تکلف بات چیت کرنے لگے۔

اور چشمے بھی کم و بیش اسی وضع کے ہیں۔ لیکن سیاحوں کا اس رائے پر اتفاق
ہے۔ کہ چشمہ سلطان احمد سے زیادہ خوبصورت چشمہ قسطنطنیہ میں نہیں۔ اس لئے دوسرا
مشہور چشموں کے نام ہی لکھ دینے کافی ہیں چشمہ توپ خانہ چشمہ زینب سلطان
صعوق چشمہ سیل محمود ثانی۔ سیل عبد الحمید اول۔ اور سیل بنی والدہ سلطان۔
ایک نیا چشمہ البتہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے یعنی چشمہ ولیم۔ امپراطور ولیم
کے سلطان المعظم کی ملاقات کے لئے قسطنطنیہ آنے کی یادگار ہے اور اسی کے نام

سے مشہور ہے۔ چہنچہ سلطان احمد سے بہت دور نہیں۔ جامع ایاصوفیہ کے قریب جو پرانا میدان ہے۔ جس میں قیصر کے عہد میں گھوڑ دوڑ اور دیگر تماشے ہوتے تھے اور جسے اُس زمانہ میں ”ہیوڈروم“ اور اب ”اٹ میدان“ کہتے ہیں۔ اُس میں امپراطور جرمنی کی یراثانی گڑھی ہے۔ کہتے ہیں۔ اُس نے خاص طور پر یہ خواہش ظاہر کی تھی۔ کہ اُس کا بھی ایک چہنچہ شہر بن ہو۔ اس چہنچہ کی عمارت طرز جدید و قدیم کا مجموعہ ہے۔ گوجید رنگ اس میں غالب ہے۔ اس کے اوپر بھی دوسرے چہنچوں کی طرح ترکی اشعار ترکی حروف میں لکھے ہیں۔ مگر چہنچہ ایسی جگہ بنا ہے کہ سوائے اس کے کہ تماشائی اسے دیکھنے جائیں اور اس پر اپنے نام لکھ کر اس کی دیواروں کی خوبصورتی میں خلل ڈالیں۔ اس سے اور کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ اور اس کی سبیل روان نہیں ہے۔ کسی اور مقام پر بنتا تو شاید زیادہ مفید ہوتا۔ لیکن امپراطور نے ایاصوفیہ کے سامنے اپنا نقش قدم چھوڑنا چاہا۔ یہ اُس کی اُن ذومعنی حکمت عملیوں میں سے ہے جن سے وہ یورپ بھر میں محمود افران بنا ہوا ہے۔ بظاہر تو اُس نے اس خواہش کے اظہار اور اس یادگار کے ذریعہ سے اپنی بے تعصبی اور سلطان المعظم سے اپنی دوستی کا ثبوت دیا۔ لیکن سوچنے والے اس میں اور معنی بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایاصوفیہ کے سامنے ایک عیسائی تاجدار کا اپنا نشان چھوٹنا اس کے جوش عیسوی پر دلالت کرتا ہے اور جو کام بوجہ ایاصوفیہ اور قسطنطنیہ پر مسلمانوں کے قابض ہونے کے کوئی اور عیسائی تاجدار نہ کر سکتا۔ وہ یہ مدبرانہ جس تدبیر ہو گیا۔ سلطان المعظم سے امپراطور کی دوستی۔ اور اس کی مشہور موافق اسلام تقریر کے سوا اس کے بعض تازہ سیاسی احوال سے یورپ کے اکثر اخبار نویسوں نے خصوصاً فرانس اور انگلستان میں یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ وہ اصل میں پکا عیسائی نہیں اور مسلمانوں کا بڑا

رفیق اور اُن کی پوٹیکل ہستی کا محافظ ہے۔ اور اس لئے اُسے ہر بہانے سے نرا ہوا
گالیاں دیتے ہیں اور مسلمانوں میں اگر دنیا کے کسی حصے میں کسی خوش یا حرکت کے
آثار نظر آئیں تو انہیں امپراطور ولیم کی غلطیوں اور نامناسب حکمتِ عملی کا نتیجہ بتلاتے
ہیں۔ اور اسی طرح بعض مسلمان بھی اسے درحقیقت حامیِ اسلام سمجھتے ہیں۔ امپراطور
ان دونوں طبقوں کے خیالات سُن سُن کر دل ہی دل میں ہنستا ہوگا اور کہتا ہوگا
اے کاشش کسے ہر انچہ مہتمم داند

یورپ میں اسلام کی نسبت سینکڑوں برس سے ایسی بے بنیاد خیریں پھیل
گئی ہیں اور اس قدر غلط بیانیوں دہشتہ و نادہشتہ کی گئیں ہیں۔ کہ اول تو وہاں
کسی کا دلی خیر خواہ اسلام ہونا بہت مشکل ہے۔ اور اگر کوئی ہو بھی تو اس کے لئے
اپنے دلی خیالات کا اظہار آسان نہیں۔ تاجداروں کے لئے اور بھی زیادہ
مشکلات ہیں۔ وہ دل میں چاہے کچھ خیالات رکھتے ہوں۔ جانتے ہیں کہ ساری
رعایا عیسائیت کی نام لیوا ہے۔ اور وہ بغیر اپنے آپ کو معرضِ خطر میں ڈالنے
کے اسلام کی کوئی معاونت نہیں کر سکتے۔ ہاں کبھی حکمتِ عملی کا ایسا ہی تقاضا
ہو اور اپنے ملک کے لئے کسی معقول فائدہ کی اُمید ہو تو زبانی جمع خراج کے
لئے کیا خواص کیا عوام سب حاضر ہیں اور جلبِ منفعت کے لئے یورپ کا جدید
ضابطہ اخلاق ہر طرح کی نادرستی لئے مصالحت آمیز کی اجازت دیتا ہے۔ ابھی بہت
دن نہیں گئے کہ انگلستان میں اور دولتِ عثمانیہ میں گہری دوستی تھی۔ ہندوستان
میں جب انگریزی عملداری نہ تھی۔ اور روس و روم کی لڑائی میں انگریز روم کے
معاون تھے۔ اُس وقت خود انگریز افسروں نے عثمانیوں کی امداد کے لئے ہندوستان

میں چندہ کرایا۔ اور اُس زمانے کے انگریز ممبر اور مضمون نگار سلطان المعظم کی خلافت کے سب سے بڑے موید تھے۔ اب وہ پالیسی بدل گئی اور آج جرمنی کی باری ہے۔ ایشیائی روم میں ایل بنانے کا حق جرمنی نے نہایت ہی رعایتی شرائط پر حاصل کر لیا ہے اور خود دار الخلافہ میں جرمنی کے لوگ طرح طرح کے فوائد اٹھا رہے ہیں۔ دولت عثمانیہ بھی کیا کرے۔ یورپ میں اکیلی اسلامی سلطنت ہے۔ باقی سب قومیں عیسائی ہیں۔ ایک آدمی سے بنائے گئے ہیں اور رع زمانہ باتو نسا زد تو بازمانہ بہ ساز۔ پر ایل کے دن کاٹتی ہے۔ ورنہ دوستی جو اہل یورپ اُس سے کر سکتے ہیں ہو گیا ہے۔ یہی بنا پر میں چشمہ امپراطور ولیم کو نشان دوستی کی بجائے نشان زما د سازی سمجھتا ہوں۔ گو اس کی ایک خصوصیت قابلِ داد ہے۔ تقلید رسم اسلامی اس میں کھائی گئی ہے اور اس میں پانی موجود ہے مگر بے فیض۔ گویا یہ اہل یورپ کی طبع سیال سے خوب مشابہت رکھتا ہے۔ کہ جہاں جائیں وہیں کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور وہیں کے خیالات اور وضع کے مطابق ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے اہل ملک کے دل ہاتھ میں آجائیں۔ تانہوں میں چشموں کا رواج دیکھا تو امپراطور نے بھی چشمہ ہی کو اپنی بہترین یادگار قرار دیا۔



ات میدان

ات میدان اب صرف زمین کا ایک بڑا قطعہ رہ گیا ہے۔ جس میں دو ایک پرنس
مینار استادہ ہیں اور قریب قریب غیر آباد پڑا ہے۔ مگر عہد باز نطائن کے قسطنطنیہ
کی رونق دیکھنے کے لئے چشم تصور اس سے بہتر جگہ نہیں تلاش کر سکتی۔ اس میدان میں
کھڑے ہو کر ذرا آنکھ بند کیجئے۔ اور تاریخ میں جو حالات عہد باز نطائن کے پڑے ہوئے
اُن کا نقشہ آنکھوں کے روبرو آنے دیجئے۔ موجودہ ات میدان سے بہت زیادہ
وسیع ایک مستقل قطعہ زمین ہے جس کے ایک طرف نصف دائرہ کی صورت بنی ہے۔
طرز تعمیر روم کے بڑے سرکس کی نقل ہے۔ تماشائی نند مرد بکثرت جمع ہیں۔ دوسری طرف
ایک چھوٹا سا گر جا ہے۔ اس کے دیروں میں شاہی محلات کی خواتین ہیں۔ گرے
کے قریب گھوڑوں اور گاڑیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ بنی ہے۔ اور اس جگہ
کے اوپر قیصر کے بیٹھنے کا مقام ہے۔ جس میں داخل ہونے کے لئے محل سے ایک
تہ زینی رستہ ہے۔ اس تماشگاہ کا نام ہپوڈروم ہے۔ مستطیل کے دونوں طرف
تیس چالیس قطاریں سنگ مرمر کی سیڑھیوں کی ہیں۔ جو تماشائیوں کے بیٹھنے کے
لئے ہیں۔ جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی ہیں۔ وہاں ایک چوڑا راستہ بنا ہے۔ جس پر تماشائیوں
میں سے بعض ٹہل رہے ہیں اور فن سنگتراشی کے عمدہ عمدہ نمونے دیکھ رہے ہیں۔
جمع کیا ہے ایک میلا ہے۔ سب اپنے اپنے حلقہ احباب میں مہن بول رہے ہیں۔ عجب
چہل پہل ہے۔ اتنے میں کچھ لگا ہوں بتا بانہ میدان کے ایک گوشے کی طرف متوجہ

ہوئیں۔ وہاں کیا ہے ہاگڑیاں دوڑنے کو ہیں اور قطار باندھ کر کھڑی ہو رہی ہیں۔
 مجمع میں خاموشی پھیل گئی۔ جیسے کسی کا انتظار ہو۔ معلوم ہوا قیصر دوڑ دیکھنے کے لئے
 آ رہے ہیں۔ اُن کا اپنے بلند درتپکے میں جلوہ گر ہونا از سر نو شور کا متقاضی ہوا۔
 سب بلند آواز سے اُن کا نام پکار رہے ہیں اور نعرہ ہائے خوشی بلند کر رہے ہیں۔
 تھوڑی دیر میں پھر چپ چاپ۔ پھر وہی خموشی وہی انتظار۔ اتنے میں اشارہ ہوا کہ
 دوڑ شروع ہو۔ گاڑیاں چلیں۔ میدان کے قریب زنداں کی عمارت ہے۔ اس کے
 گرد کا چکر ان گاڑیوں کی دوڑ کے لئے مقرر ہے۔ سات دفعہ گھومنے میں جو گاڑی
 بڑھ جائے وہ بازی لے گئی۔ ہر چکر میں پہلے سے زیادہ رفتار تیز ہوتی جاتی ہے۔
 آخر گاڑیاں یہاں تک تیز چلتی ہیں کہ علیحدہ علیحدہ نظر شکل سے آتی ہیں۔ گویا ایک بڑا
 گول چرخ ہے جو خود بخود گھوم رہا۔ ایلو۔ وہ رفتار کم ہوئی۔ ایک گاڑی کا سوار
 اسے خوشی سے دوڑاتا ہوا میدان کی طرف بڑھا آتا ہے۔ یہ جیتنے والا ہے۔
 جو بادشاہ سے انعام اور ہجوم عوام سے داریے لینے آیا ہے۔ اور عوام اچھل اچھل کر
 اور کود کود کر اسے داد دے رہے ہیں۔ ایک گاڑی اُس دیوانہ وار دوڑ میں دوسری
 سے ٹکرا بھی گئی۔ اس کا پیہ ٹوٹ گیا اور سوار رُٹک کر باہر جاگرا۔ ٹوٹی ہوئی گاڑی
 اور گرے ہوئے سوار کو بھی کشاں کشاں اس طرف لا رہے ہیں۔ اور تماشا شائق نہیں
 دیکھ کر حید نہیں رہے ہیں اور خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ کہ یہ نظارہ ساری
 دوڑ میں مزے کار ہا۔ کوئی مرے کوئی سیتے۔ کوئی جیتے کوئی مارے۔ انہیں
 اپنی دل لگی سے کام ہے۔ آئے دو گھڑی جی بہلا گئے۔

یہی یہ تماشا ختم ہوا۔ تصور کے جادوگر نے تماشے کا پردہ بدل دیا۔ وہی ہجوم

ہے۔ وہی ہنگامہ۔ مگر قیصر اپنے درتپے میں رونق افروز نہیں۔ لوگوں کا جامہ تو زور کا ہے۔ مگر آج کسی درمناں کے آثار ہیں۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ اتنے میں وہ بدمذمت پانچویں نظر آتے ہیں۔ انہیں چار جلا دگسیٹے ہوئے لارہے ہیں۔ ساتھ تلواروں کا پہرہ ہے۔ میدان کے عین وسط میں ایک سولی گڑی ہے۔ اور اس کے قریب لکڑیوں کا ایک بڑا انبار ہے۔ لکڑیوں کے انبار کو آگ لگائی گئی۔ دھواں اٹھ کر آسمان کو جانے لگا۔ تماشاخی دم بخود دیکھ رہے ہیں۔ کہ اب کیا ہوتا ہے۔ سولی کے قریب ایک شامت کا مارا ہوا ساں کھڑا ہے اور دوسرا آگ کے قریب لاکر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اُس کا چہرہ زرد ہے۔ گروہ بے اعتنائی سے سر جھکائے ہوئے ہے۔ گویا اسے خبر ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے اور اس کے گرد جمع کیسا ہے۔ اس لئے اس کو دیکھ کر یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ لوہہ آگ کے شعلے اس کی طرف بڑھ بڑھ کر اپنی خوفناک اور مہیب زبانیں اسے دکھانے لگے۔ سب سے بڑا شعلہ اوپر کو اٹھ رہا ہے۔ گویا ایک جلتی ہوئی تلوار ہے۔ جو کسی کی جان لئے بغیر نہ بیگی۔ ایک افسر گھوڑے پر سوار میدان میں نکلا۔ اُس نے خونی لباس ملے جلا دوں کو انگلی سے اشارہ کیا کہ وقت ہے۔ دو مضبوط کڑیل جوانوں نے تسلیم و رضا اور استقلال کنی اُس سرنگوں تصویر کو جو آگ کے قریب کھڑی تھی۔ دھکیل کر آگ کے حوالے کر دیا۔ ایک آخری دنگہ ازاہ! اور ارد گرد کے بے حس گروہ کی ایک مہیب چیخ! اس بات کا اعلان تھا کہ وہ جیتی جاگتی ہستی راکھ کا ڈھیر ہو گئی۔

پھر نہ دیکھا کچھ بجز آگ شعلہ پڑتی و تاب
شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا

مہم ہوا کہ یہ دھن کا پکا شہید عقیدت تھا۔ اس کے عقائد چونکہ معتقدات عامہ کے خلاف تھے۔ پادریوں نے حکم دیا کہ اسے آگ میں جلا دیا جائے۔ جب یہ زندہ جین آگ میں جھونکا گیا۔ تو ایک سیاہ دھواں اٹھا۔ جس سے مطلع غبار آلود ہو گیا۔ دھوئیں کے سبب یہ نظر نہ آسکا۔ کہ دوسرے قیدی کا کیا حشر ہوا۔ ذرا ہوا صاف ہوئی تو سولی پر ایک جسم لٹکتا ہوا نظر آیا۔ جس کا کام چند دقیقے ہوئے تمام ہو چکا تھا۔ یہ پجارہ ایک سیاسی مجرم تھا۔

اس سین پر بھی پردہ گرا۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ مجمع پہلے موقعوں سے بھٹی باہر ہے۔ لوگ ہمتن گوش کھڑے ہیں۔ کسی اعلان عام کے منتظر ہیں۔ ایک افسر کی شاندار وردی پہنے محل سے نکلا۔ اس کے آگے تیغچے اور ہتھیار اپنی اپنی دریاں ڈانٹے آ رہے ہیں۔ ایک بلند چوڑے پر سب آکر کھڑے ہوئے۔ اور سب سے بڑے افسر نے بڑھ کر ایک اعلان پڑھنا شروع کیا۔ یہ اعلان ایک نئے قیصر کی آمد کی خبر دیتا ہے۔ پہلا قیصر منزل ہستی طے کر کے وہیں جا پہنچا۔ جہاں اس کے کئی فریادیوں اور داخواہوں کی روئیں اس سے پہلے موجود تھیں اور جہاں شریوں کی شرارت ختم ہو جاتی ہو اور سفر دنیا کے ٹھکے ماندے آرام کرتے ہیں۔ دوسرا قیصر اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اہل دربار نے بادشاہ کی خوشامد کرنے کو ویسے ہی مستعد ہیں جیسے پُرانے کے لئے تھے اور اس کے احکام کی خواہ وہ بجا ہوں خواہ بیجا ویسی ہی اطاعت کرنے کو تیار ہیں۔ گروہ عوام گھوڑ دوڑ کے دن اس کی آمد آمد پر ایسا ہی اچھلے کودے گا جیسا اس سے پہلے اچھلتا تھا۔ اور یہ اپنے آپ کو اسی طرح مختار کل سمجھیں گا۔ جس طرح وہ سمجھتا تھا جواب بے اختیار ہے۔ عبرت! عبرت! مگر انسان

کو چشمِ عبرت ہوتی تو وہ اُن بیشمار غلطیوں سے بچ جاتا جن کے تذکروں سے
اوراقِ تاریخ سیاہ ہیں۔

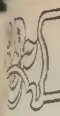
اس تماشے کے سین کہانتک دیکھیں۔ کون جانتا ہے کہ اس قطعہ زمین پر کیا
کیا واقعات عہدِ بازِ نطائن میں گذرے۔ ہم نے اُن کے چند نمونے جو دیکھ لئے
وہ کافی ہیں۔ صدیاں اسی طرح گذر گئیں۔ آخر زمانے نے کروٹ بدلی۔ نظر آبا کہ نہ
وہ ہیوڈروم ہے۔ نہ وہ گھوڑ دوڑ۔ نہ وہ مذہب کے نام پر لوگوں کو آگ میں
ہے نہ وہ ایک قیصر کے بعد دوسرے قیصر کا آنا۔ بالکل کایلیپٹ ہی۔ ہیوڈروم کا
کا نام اب ات میدان ہے اور اس میں ترک سوار اپنی نیزہ بازی کے جوہر دکھاتے
ہیں اور جبرید کھیل ہے ہیں۔ کچھ مدت اس حالت میں گذری۔ مگر زمانے کو
قرار کہاں۔ وہی ترک ہیں اور وہی اُن کی حکومت۔ لیکن جبرید اور دیگر مردانہ
ورزشوں کے وہ چرچے نہیں۔ جو لباس پرانے جبرید کھیلنے والوں کے تھے۔
اُن لباسوں کے پہننے والے بُت بن کر ایک عجائب خانے میں جا بیٹھے۔ جو پرانے
ہیوڈروم کے جنوب مغربی حصے میں بنا ہوا ہے۔ مینی چری فوج کی سب سے بڑی
بغاوت جو ۱۸۶۱ء میں سلطان محمود ثانی کے زمانے میں ہوئی تھی اور کشتِ خون
کے بعد فرو ہوئی تھی۔ اسی ات میدان کا واقعہ ہے۔ اب ہیوڈروم کی کچھ زمین
ایک مکتبِ صنائع اور دفترِ زراعت نے گھیر لی۔ ایک طرف کو جیلنا نہ بن گیا۔ دوسری
طرف کچھ اور سرکاری عمارتیں بن گئیں۔ ایک گوشے میں امپراطور ولیم اپنا یادگاری
چشمہ بنوا گئے اور عہدِ قدیم کی یادگار صرف دو پرانے مینار رہ گئے۔ جن کی تاریخ
سے انطوق پسند طبائع کے سوا اب کسی کو دلچسپی نہیں۔

ان میناروں میں ایک مصری مینار ہے جو ساٹھ فٹ بلند ہے۔ ٹیودوسیوس نے اسے
 یہاں رکھوایا تھا۔ اس کے اوپر سپوڈروم کے بعض سین کندہ ہیں۔ دوسرا مینار اثر دبا مینار
 کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی بلندی کوئی بیس فٹ ہے۔ پتیل کے تین اثر دبا ایک
 دوسرے کے گرد لپٹے ہوئے ہیں۔ جن کی دم نیچے اور منہ اوپر کوبنے ہیں۔ یہ
 مینار بہت پرانا ہے۔ ۶۹ء قبل مسیح میں جب یونانیوں نے ایرانیوں کے حملے
 سے نجات پائی تو منجملہ اوریادگاروں کے میں نار بنوایا تھا اور دلفی کے مشہور مند
 میں رکھوایا تھا۔ تینوں سانپوں کے سر کٹ چکے ہیں۔ مگر اس شکستہ حالت میں بھی یہ
 مینار آج سے دو ہزار چار سو برس پہلے کے واقعات یاد دلارہا ہے +



عجائبِ مینی چری

ات میدان کے جنوب مغرب میں یہ عجائب خانہ ہے۔ جہاں ات میدان کے
 پُرانے شہسوار بت بنکر جا بیٹھے ہیں۔ گویا حوادثِ زمانہ سے پناہ گزین ہیں۔ یہ عجائب خانہ
 اصل میں پُرانے لباسوں کی نمائش ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے سوہر سن پہلے
 تک ترکوں کا لباس کیسا تھا اور اس میں گذشتہ صدی میں کس قدر انقلاب ہوا ہے۔
 یہ بُت مٹی کے ہیں۔ جنہیں قدیم لباس پہنا دیئے گئے ہیں۔ مگر رنگ و روغن میں
 کاریگروں نے اپنی صناعی کے جوہر دکھائے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ عجائب خانہ
 مینی چری فوج کے اقتدار کے زمانے کی بولتی ہوئی تصویر ہے۔ بعض صورتیں تو ایسی
 زندہ نماں ہیں۔ کہ انہیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بولا چاہتی ہیں۔ یورپ کے
 سیاح اس عجائب خانے کو بڑے شوق سے دیکھتے آتے ہیں۔ کیونکہ یہ لباس آدمیوں
 نظر نہیں آسکتے۔ اور ترکوں کے پُرانے تمدن کا اندازہ لگانے کے لئے ان بتوں کے
 فوٹو لے جاتے ہیں۔ وہ ان مٹی کی صورتوں کی بہت تعریف نہیں کرتے۔ کیونکہ انکی
 نگاہوں میں لندن اور پیرس کے موم کے بنے ہوئے بُت سمائے ہوئے ہیں جن
 میں موجودہ زمانے کی ترقی فنون کی بدولت ہنرمندوں نے جان ڈالنے میں تھوڑی
 سی سرکھی ہے۔ موم کے بتوں کے اندر گھڑی کے سے پُرزے لگا کر جب انکی کل کو
 کوک دیتے ہیں تو مجسمہ میں تنفس کی سی حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر انہیں یہ یاد رکھنا
 چاہیئے۔ کہ عجائب خانہ مینی چری موم کے مجسموں کی نمائش سے پُرانا ہے اور جیتے جی



ی

جہاں سے

پناہ لیں

ہر کوئی ہے

کس قدر

میں۔

میں۔

بعض

لا جا رہی

کیونکہ

نے کہے

نہیں

ماتے

جان

لگا رہے

میں۔

پڑا



بیمہ غنیمت ہے۔

اس عجائب خانہ کا داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہی جو دروازہ پر بہت تھوڑی قیمت پر ملتا ہے۔ اور خاص عام کو اسے دیکھنے کی اجازت ہے۔ ایک سو کے قریب بُت اُس میں رکھے ہیں جو پندرہ گروپ میں منقسم ہیں۔ ہم ترتیب دار انہیں دیکھنا شروع کرتے ہیں۔

۱۔ اس میں حرم شاہی کے خواجہ سراؤں کا افسر۔ اور باش مابین موجود ہیں اور ان کے علاوہ چند بونے اور دیگر خدام ہیں۔ خدام حرم میں کچھ بونے رکھنا ترکی بادشاہوں کا ایک پُرانا دستور ہے۔

۲۔ دو فوجی افسر۔ فوجی مطبخ کا باورچی۔ اور سقا۔

۳۔ امیر البحر و ناظر صیغہ بحریہ۔ ترجمان وزارت۔ اور دیگر بحری افسران۔

۴۔ مینی چری فوج کا کمان افسر۔ شاہی تیغ بردار۔ بیشتر شرفیات اوشاہی کا رکھنے والی۔

۵۔ ناظر صیغہ خارجہ اور اس کا معین۔ باب عالی کا مفتی۔ سفیر عثمانی کا اردلی۔ ہرکارہ

اور سارجنٹ متیقنہ باب علی۔

۶۔ ناظر صیغہ داخلہ۔ باش کاتب۔ میر حلوس و کھا۔ اردلی وغیرہ۔

۷۔ شیخ الاسلام۔ قاضی عسکر روم اہلی۔ افسر عمامہ اران سبز پوش۔ قاضی انتہا ل قاضی مکہ معظمہ۔ سر ادیب مکاتب عثمانیہ۔ مؤذن۔ اردلی۔

۸۔ صدر اہم۔ افسر متیقنہ محلات۔ افسر دربانان۔ کاتب ثانی۔ سائیس۔ اردلی۔

۹۔ معین وزارت و دیگر اہلکاران محکمہ وزارت۔

۱۰۔ رئیس ملکہ۔ افسر محکمہ جاسوسی۔ افسر خفیہ پولیس وغیرہ۔

۱۱۔ نائب مہتمم توپ خانہ و دیگر اہلکاران توپ خانہ۔

۱۲۔ خواجه ہشتی - ہتم کمال وغیرہ۔

۱۳۔ تونچی - علم بردار - مگارد - مینی چسری سپاہی۔

۱۴۔ جلاؤ - مددگار جلاؤ وغیرہ۔

۱۵۔ عہد سلطان سلیم کی اصلاح شدہ فوج کے افسر اور سپاہی سلطان محمود کے وقت کے سوار اور پیادے۔

ان لوگوں میں اکثر بڑے بڑے علمے باندھے ہوئے ہیں گو عماموں کی بند میں ہر عہد میں کسی قدر تفاوت نظر آتا ہے۔ ان عماموں میں بعض پٹھانوں کے قدیم عماموں سے جو پنجاب کے چند شہروں میں کہیں کہیں اب بھی نظر آتے ہیں۔ بہت مشابہ ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم وسط ایشیا کی یہ وضع ہوگی۔ اور کچھ منسل کچھ پٹھان اسے ہندوستان لے آئے اور اُدھر ترک سے سرزمین یورپ میں لے گئے۔ جب یہ خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے صد ہا سال تک باوجود یورپ کی ہمسائیگی اور اہل یورپ سے معاملہ پڑنے کے اس وضع کو نہایت وفاداری سے بنایا۔ تو حیرت ہوتی ہے۔ صرف عمامہ اور لنیے تاتاری چوٹوں پر اکتفا نہ کر کے شلوار تک کو ترکوں نے مدت تک بحال رکھا اور جن ترکوں کی دلیری کی یورپ میں ایک عرصہ تک دھاک بندھی رہی۔ وہ اسی پُرانی وضع کے لوگ تھے۔ مہوڑ ترک کی لباس گو چست اور زمانہ کے رواج کے زیادہ مطابق ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ پُرانا لباس زیادہ شاندار تھا۔

ان تصاویر سے ایک اور بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ دائرہ ہی چٹ کرنے کا رواج ترکوں میں مدتوں سے چلا آیا ہے۔ عجب نہیں کہ وہ وسط ایشیا سے اس رواج کو



سپر کی منہ
 ہیں گوہر
 بعض فیض
 بی بی خورشید
 دیکھ کہ ہوش
 ترک سے
 سال تک بہم
 نہایت دلا
 غول پر گھنٹا
 کی دیکھ
 سے کہ گئے
 ہے۔ میں
 بی بی ملک
 شہید سے

سب کوں تکل ماوراء
بنے تھے خصوصاً
روزِ جمعہ منڈے
پوتہ اس سے
کے اپنے دلوں کی
پسے اس کا پڑنا
نے اسے اب بھی
... جو داڑھی
بابِ حرم سلطان
... بارِ جاری
نے ان کوئی تھیں
کے حالت پر غور
نہ سوئے فرہ پہننے
پسے سیاہ
اس کے وہ
... تھیں
... اور
... ہرگز نہ
... تھیں

پنے ساتھ لائے ہوں۔ علماء اور رؤساً تو داڑھی رکھتے تھے اور باقی لوگ اکثر اسے
 ناف کر دیتے تھے۔ خصوصاً فوج کے سپاہی۔ معمولی اہلکار ملازم اور شاگرد پیشہ
 ن تصادیر میں داڑھی منڈے نظر آتے ہیں۔ مچھیس بڑی بڑی اور بل کھائی ہوئی
 در داڑھی صاف۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اندنوں جو ٹرکوں میں ایک بڑی تعداد
 اڑھی صاف کرانے والوں کی ہے۔ وہ محض یورپ کی تقلید کا اثر نہیں۔ بلکہ بھارت
 اسے ان کے ہاں کا پرانا رواج بھی اس کی اجازت دیتا ہے۔ مگر مغزین میں
 اڑھی رکھنے والے اب بھی بکثرت ہیں۔ اور گو داڑھی نہ رکھنے پر بہت اعتراض
 میں کیا جاتا۔ تاہم داڑھی رکھنا مستحسن سمجھا جاتا ہے۔

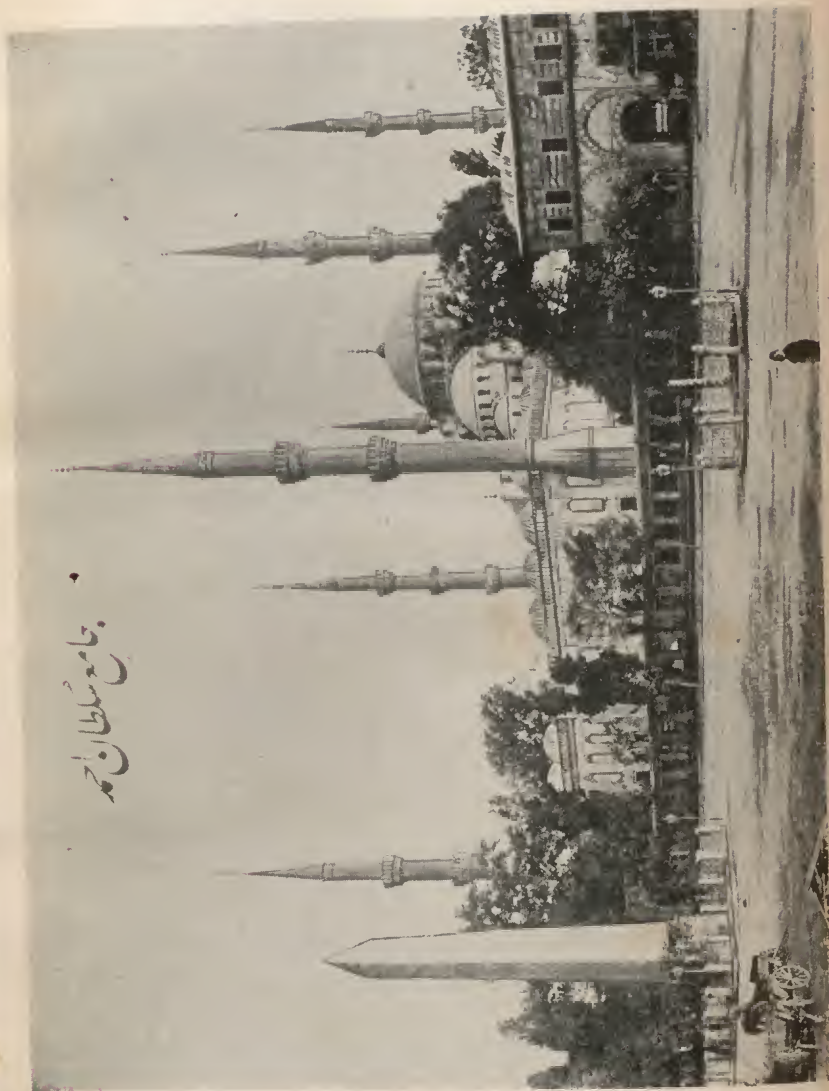
یہ عجائب گھر سلطان عبدالحمید مرحوم نے قائم کیا تھا اور اس میں لوگوں کی آمد
 رفت کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ جب ہم اسے دیکھنے گئے تو کئی ترکی عورتیں
 ہی دیکھنے آئی ہوئی تھیں۔ اور ہر گروپ کے مقابل دیر تک کھڑی ہو کر پڑنے
 مانے کے حالات پر غور کرتی تھیں۔ اور کہیں کہیں اظہارِ استعجاب کرتی تھیں۔
 جب دستورِ فرامہ پہنے ہوئے تھیں۔ مگر تصویروں کو اچھی طرح دیکھنے کے لئے
 انہوں نے اپنے سیاہ نقاب اپنے چہروں سے الٹ دیئے تھے۔ اور ان کو
 انہی مردوں کے وہاں موجود ہونے سے کچھ گھبراہٹ نہ تھی۔ میں نے جی میں
 کہا کہ اگر گزشتہ صدیوں کی بے جان صورتوں میں جنہیں یہ بغور دیکھ رہی ہیں
 جان پڑ جائے اور وہ اپنے بعد کی نسلوں کے لباس اور وضع اور رواج کی تبدیلیاں
 دیکھیں تو وہ ہرگز باور نہ کریں کہ وہ اپنے وطن میں ہیں۔ اسانوں اب وہ نہیں جوت
 اسوقت نقاب موت کی گہری نیند سے ان بہادرؤں کی آنکھیں منڈ گئیں +

جامع احمدیہ

مجاہد خانہ مینی چری کے متصل میدان سے مشرق کی طرف ایک عایشان چار
نظر آتی ہے۔ یہ سلطان احمد اول کی یادگار ہے۔ اس کے چھ مینار ہیں۔ وہ یہ ہے
کہ اس کے نامدار بانی کو عجب شکل کا سامنا تھا۔ اس نے اس کے لئے جگہ ایسی چن لی
جو جامع ایا صوفیہ کے قریب تھی۔ اب اس کے قرب وجوار میں کوئی عمارت بنے
تو وہ ایسی تو ہو کہ اس کے سامنے بالکل بے حیثیت نہ معلوم ہو۔ طرہ اس پر یہ کہ
جامع فاتحہ اور جامع سلیمانہ اسی شاندار مسجدیں اس سے پہلے شہر کے اوصاف
بن چکی تھیں۔ اس لئے سلطان نے میناروں کی تعداد میں اضافہ کرنے سے
ایک خوبصورت اثر پیدا کیا۔ استانبول میں لوگ کہتے ہیں کہ اور کہیں چھ مینار
کی مسجد اسلامی دنیا میں اس وقت موجود نہیں۔ مگر معظمہ میں تھی۔ مگر سلطان احمد
نے وہاں ایک ساتواں مینار بنوایا تھا۔ تاکہ اس مقدس مقام کی مسجد کا پس
ملحوظ رہے اور کوئی یہ نہ کہے کہ اس کی برابری کی کوشش کی ہے۔

مسجد کے چاروں طرف وسیع احاطہ ہے۔ جس میں بہت سے درخت
باعث زینت و آبادی ہیں۔ علوم عربیہ کے درس کے لئے مکاتب۔ طلبہ
کے لئے حجرے اور مطبخ حرم مسجد کے چاروں طرف بنے ہیں۔ حرم میں داخل
ہونے کے لئے ایک خوشنما دروازہ ہے۔ اور مسجد کا دروازہ عین اس کے
مقابل ہے۔ طول اور عرض میں مسجد کا اندرونی حصہ ۲۳۰ x ۲۱۰ فٹ ہوگا۔ مسجد

جامع سلطان احمد



اس کے ساتھ جو شا
نہیں کہیں جو ساجد کی
ہو زون ہیں۔ پور
نہیں ہوتے ہیں اور
سے یا جو فیہ کی عمار
کے طور پر ہم دو پور
بک فریسی سیاح کو
بڑے بڑے سن
بے نیلگوں
پسندیدہ نفس
کے گئے۔ یہ فقر
کے جاتے ہیں۔
نہیں ہو سہری حری
میں ہیں۔ حباب
کے سنگ سودا
ساق فریہ ہو۔
بک فریہ ہو۔
جو یہ ہو۔
بک فریہ ہو۔

(مکرر)

کے اندر سادگی کے ساتھ جوشان پیدا کی گئی ہے۔ اس کی خوبی کا اندازہ کرنے کے لئے مشرقی لگا ہیں جو مساجد کی تعمیر کی خوبیوں سے واقف ہیں اور پ کے سیاحوں سے زیادہ موزون ہیں۔ یورپ کے سیاح عموماً گرجاؤں کی ساخت کی خوبیاں مساجد میں ٹھونڈتے ہیں اور مایوس ہوتے ہیں۔ خصوصاً قسطنطنیہ میں جہاں اتفاق سے ایاصوفیہ کی عمارت میں وہ دونوں خوبیاں موجود پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دو یورپین رائیں جامع احمدیہ کی نسبت نقل کرتے ہیں۔ ایک فرانسیسی سیاح لکھتا ہے :-

چار بڑے بڑے ستون وسطی گنبد کو سنبھالے ہوئے ہیں جس کا قطر پچیس گز ہے۔ نیلگوں۔ سنہ اور سفید روغنی اینٹیں دیواروں کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔ جن پر پسندیدہ نقش و نگار ہیں۔ جو قدیم ہندی کپڑوں کے میل بوٹوں سے نقل کے گئے۔ نقش و نگار پرانے عثمانیوں کے بیش قیمت کاموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان کا اثر وسطی ستونوں کی گولائی اور آرائش سے بھی مترشح ہے۔ سنہری حروف میں آیات قرآنی ان کی نصف بلندی کے قریب لکھی ہوئی ہیں۔ محراب کے پتھر نادر اور قیمتی ہیں۔ مشہور ہے کہ ان میں تبرکات کعبہ کے سنگِ اسود کا ایک ٹکڑا بھی لگا ہوا ہے۔ منبر سنگ مرمر کے کام کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ دونوں طرف پتیل کے جھاڑ بڑی بڑی بیٹیوں والے ہیں۔ جنوب مشرقی گوشے میں داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ سلطین کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ جو بہت آراستہ ہے۔ چھ فانوس مرقع بہ زرد۔ زنجیر سے متعلق ہیں۔ یہ والی حبش کی طرف سے تحفے کے طور پر آئے تھے۔ قرآن کے

نہایت عمدہ قلمی نسخہ خوبصورت رطلوں پر دھرے ہیں۔ اور رطلوں پر سپیک کا مری
دیوار پر در کعبہ کا پردہ لٹکا رہا ہے۔ کیونکہ ہر سال جو کاروان کعبہ جاتا ہے وہ پچھلے
سال کا پردہ یہاں لٹکانے کے لئے لے آتا ہے اور نیا پردہ وہاں دے آتا ہے
ہر چند کہ یہ مسجد باہر سے بہت شاندار معلوم ہوتی ہے اور اس کے گنبد اور مینار
اسے بہت دلچسپ بناتے ہیں۔ مگر یہ شان زیادہ تر بیرونی ہو اور اس کی وسعت
ویکر مشتملات کے سبب ہو۔ اندر سے یہ کچھ دیکھنے کے قابل نہیں جس شخص نے
ایا صوفیہ دیکھی ہو اسے اُس کے اندر جانے کی تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ
بہت بھاری ہیں۔ روٹنی بھدی ہے۔ اور بجائے خدا کی عبادت کا مقام معلوم
کے اس کا بڑا مال دعوتِ جہش کا مال معلوم ہوتا ہے۔ تاہم یہاں کے لوگ اسے
بہت بے نظیر مسجد سمجھتے ہیں۔ یہ شاید اُس کے عمدہ موقع کی وجہ ہو۔ کیونکہ استانبول کے
ہر حصے سے یہاں بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں۔

دوسری رائے سٹرفرگسن نامی ایک انگریز کی ہے: ”اگر اس مسجد کو چار حصوں
تقسیم کریں۔ تو چاروں حصے بالکل یکساں معلوم ہوں گے۔ اسی لئے اس کا اثر دیکھنے والے
پر پھیکا سا پڑتا ہے۔ ہر دیوار کا نقشہ بھی ایک سا ہو۔ ایک ہی قسم کی کھڑکیاں ایک دوسرے
سے یکساں فاصلے پر دیواروں میں لگی ہیں۔ اور قبلہ کی جانب بھی دوسری دیواروں سے
کچھ زیادہ آراستہ نہیں۔ ہاں اتنی بات ہے کہ دو سو فٹ مربع کا مال جس کی پتھر کی گتہ
صرف چار ستونوں پر کھڑی ہے۔ اپنی جگہ ایک شاندار چیز ہے۔“

پہلے حضرت نے اندر کی خوبصورتیوں اور دلچسپیوں کا خود اعتراف کر کے
شاید ازراہ تعصب مسجد کو گھٹا کر دکھانا ضروری سمجھا ہے۔ تو دوسرے صاحب نے

میدان سرعسكرت



میں اس اصول
ہاں کے ہاں مروج
یہ جب سلمان
اور کاشق ہو
بہرہ بھی وہ دان
یک باقی تھی
سنگ مر اور رنج
سلمان اگر کاشق
سلمان سو یہ اپنا
ہے ہی لئے
مرد روزہ کے
ان کے رہا
بنا پنے دے
یک عالمشان
بخت میں تانہ
نک لئے اسے
ہو کیا ہے
نک ایک
نکے رہا

اپنے اعتراض میں اس اصول سے چشم پوشی کی ہو۔ کہ مساجد کی زیادہ زینت قبلہ کی جانب
 بھی مسلمانوں کے ہاں مروج نہیں۔ مساجد کو جس خوبی پر نیاز رہا ہے وہ اُن کی
 سادگی ہے۔ جب مسلمانوں میں بڑے بڑے بادشاہ ہوئے اور اُن کو بڑی بڑی
 نہی عمارتوں کا شوق ہوا۔ تو اتنی ظاہری شان اور بلندی بھی مساجد میں پیدا
 ہو گئی۔ مگر پھر بھی وہ دانستہ اُن کو سادہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور جو
 خوبی پیدا کی جاتی تھی۔ وہ مصالح کی عمدگی۔ درو دیوار کی بلندی۔ محراب کی
 فراخی۔ سنگ مرمر اور رنگارنگ کے پتھروں کے انتخاب سے ہوتی تھی۔ نہ کہ
 کسی اور سامان آرائش سے۔ رہا جامع احمدیہ کی دیواروں اور دیچوں کے بالکیاں
 ہونے کا معاملہ۔ سو یہ اپنا اپنا مذاق ہے۔ مشرقی مذاق عموماً کیساں ہونے کو پسند
 کرتا رہا ہے۔ اسی لئے کئی بڑی عمارتوں میں محض اس اصول کے نباہنے کے لئے
 ایک کارآمد دروازہ کے جواب میں ایک پیکار دروازہ بنا دیا جاتا ہے۔ تاکہ یکنگی
 میں فرق نہ آئے۔ ہمارا تو خیال ہے کہ جامع احمدیہ کے بانی نے وہ مشکل کام جو
 اُس نے اپنے ذمے لیا تھا۔ یعنی ایاصوفیہ کے قریب اور جامع فاتح و جامع سلیمان
 کے بعد ایک عالیشان مسجد بنانا۔ بڑی کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اور جامع
 احمد حقیقت میں استانبول کی قابل دید چیزوں میں سے ہے اور کم از کم مسلمان
 سیاح کے لئے اسے اندر سے جا کر دیکھنا کبھی باعث مایوسی نہیں ہو سکتا۔
 بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان احمد مرحوم کو اس تعمیر کے متعلق یہاں تک شغف تھا
 کہ ہفتے میں ایک دن وہ خود عمارت کے کام میں شریک ہوتے تھے اور معماروں کا
 ہاتھ بٹاتے تھے۔ دلی ارادت کا یہ ثبوت اس حسن عقیدت کے ثبوت سے بھی

ایک درجہ بڑھ کر ہے۔ جو جہنمین نے ایسا صوفیہ کی تعمیر کے وقت دیا تھا۔ اس مسجد کو ایک قبولیت خاص حاصل ہو۔ مولود شریف کے لئے جس زور کا مجمع یہاں ہوتا ہوا کہیں نہیں ہوتا۔ پہلے بادشاہ مولود شریف کے دن۔ اور حاجیوں کے کاروان کی روانگی کے موقعہ پر اور عیدین کے لئے یہیں آیا کرتے تھے۔

اس مسجد کے اوقاف کی آمدنی دو لاکھ غنہ یعنی پچیس ہزار روپیہ سالانہ ہے جس سے سینکڑوں طلبہ مستفید ہوتے اور بانی وقف کو دُعائے خیر سے یاد کرتے ہیں۔ صحن باغ کے ایک گوشے میں بانی مرحوم کا مزار ہے اور سلطان عثمان ثانی اور مراد رابع بھی اسی کی خواجگاہ کے قریب آرمیدہ ہیں۔



مشہور مسجدین

استانہول مساجد کی کثرت کے لئے مشہور ہے۔ دوسو سے کچھ اوپر جامع مسجدیں اور پانچ سو اور چھوٹی مسجدیں اس شہر میں بتائی جاتی ہیں۔ جامع مسجدوں میں جو بڑی بڑی اور زیادہ مشہور ہیں۔ انکی زیارت ہم نے کی۔ مگر ان سب کا مفصل ذکر کرنا خالی از طوالت نہیں۔ صرف جامع ایوب بہ وجہ ان روایات کے جو اس کی بنا کے متعلق مشہور ہیں اور جن کے سبب وہ خصوصیت سے متبرک گنی جاتی ہو علیحدہ بیان کی مستحق ہو۔ باقی جامع کا محض تھوڑا تھوڑا بیان کافی ہوگا۔

جامع محمد فاتح۔ استانہول میں مسلمانوں کی بنا کردہ مساجد میں سب سے پرانی جامع مسجد یہ ہے۔ اسے دیکھ کر اس عالی دماغ شخص کی عظمت دلنشین ہوتی ہے۔ جس کے نام سے یہ مشہور ہے۔ یہ مسجد مدت سے علوم قدیمہ کی بڑی درس گاہ چلی آتی ہے۔ اور آٹھ درس مع قیام گاہ طلبہ اس کے احاطے میں موجود ہیں۔ انہوں نے اس کی پرانی عمارت اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہ سکی اور سلطان مصطفیٰ ثالث کے عہد میں لرزلے سے اسے بحید نقصان پہنچا۔ اور موجودہ صورت اس زمانے کی مرت شدہ حالت ہے۔ نہ کہ اصلی حالت جو بہت زیادہ شاندار تھی۔ محراب اور منبر سفید سنگ مرمر کے ہیں۔ مسجد کے گرد جو باغ ہے۔ اس میں سلطان حبیب مکان محمد ثانی کا مزار

مقام خلافت

ہے۔ جو لوگ اس جامع شریف کی زیارت کو آتے ہیں وہ مرحوم فاتح کے مزار پر بھی ضرور فتح پڑھتے ہیں۔ شہر کا وہ حصہ جہاں جامع فاتح ہے اور طلبہ کا مرکز ہے۔ اس حصے میں یورپی تمدن کا اثر بہت کم نظر آتا ہے۔ مسجد کے گرد و کائیں زیادہ تراشیداری نمونے کی ہیں۔ اور قہوہ خانے بھی پرانی قسم کے۔ ان میں سینکڑوں عمامہ پوش طلبہ بیٹھے نظر آتے ہیں۔ لہجہ پیراہن۔ اور ترکی ٹوپی کے گرد سفید کپڑا لپیٹا ہوا جو عمامے کا کام دیتا ہے۔ جامع سلیمانیا۔ خالص عثمانی تعمیرات میں یہ جامع مسجد سب سے خوبصورت سمجھی جاتی ہے۔ اور اس تعریف میں مغربی نقاد بھی شریک ہیں۔ حرم جامع ایک تسطیل قطعہ زمین ہے۔ جس کے گرد حجرے بنے ہیں۔ چھت پر چوبیس چھوٹے گنبد ہیں۔ حرم کا فرش سنگ مرمر کا ہے۔ اور تین طرف نشست کے لئے سنگ مرمر کی نشستیں بنی ہیں۔ وسط حرم میں وضو کے لئے ایک خوشنما چشمہ ہے۔ مسجد کا اندرونی حصہ طول اور عرض میں ۲۲۵ + ۲۰۰ فٹ ہے۔ ستونوں کے سہارے ایک گیلری بنائی گئی ہے جو عمارت کے چاروں طرف جاتی ہے اور اس کی خوبی میں اضافہ کرتی ہے۔ گیلری کا شمالی حصہ ہمیشہ بند رہتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کی بیش قیمت چیزیں از قلم زور جو اسر بطور امانت محفوظ رکھی جاتی ہیں جو وہاں امانت رکھتا ہے۔ اسے باضابطہ رسید دی جاتی ہے اور بغیر ضابطہ کی رسید اور کاغذات پیش کرنے کے کوئی اپنی امانت نہیں نکلوا سکتا۔ مسجد کا گنبد قطر میں ۸۶ فٹ اور بلندی میں ۱۵۱ فٹ ہے۔ مقصود یہ یعنی سلطان کے نماز پڑھنے کا حصہ سنگ مرمر کے کام کا نہایت نادر اور نفیس نمونہ ہے۔ دیرچوں میں رنگین شیشے لگے ہیں جو سلطان سلیمان اول کے عہد کے بہترین آئینہ ساز ابراہیم حسن خوش کی صنعت کی یادگار ہیں۔ مسجد کے

اوقاف کی آمدنی معقول ہے۔ تین لاکھ غرض یعنی ساڑھے سینتیس ہزار روپیہ کے قریب ہے اور اسی سے مسجد کے مدارس کا گزارہ ہوتا ہے۔ مدارس کے ساتھ ایک مٹھیاں اور ایک ہسپتال بھی ہے۔ سلطان سلیمان اور انکی ملکہ حرم کے مرقہ صحن باغ میں جامع کے مغربی حصے میں ہیں۔

جامعہ بایزید - سلطان بایزید ثانی کی یادگار ہے۔ حرم مسجد میں چنار کے چند سایہ دار درخت بہار دے رہے ہیں۔ ان درختوں پر اور مسجد کے گنبدوں اور میناروں پر کبوتروں کے جھنڈ کے جھنڈ بیٹھے رہتے ہیں اور اس مسجد کی ایک خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لئے اسے بعض اوقات کبوتروں والی مسجد بھی کہتے ہیں۔ اس کے اندر چند چھوٹی چھوٹی عارضی دکانیں ہتی ہیں۔ جہاں تسبیح، مسواک، سیر اور اسی قسم کی چیزیں بکتی ہیں۔ مسجد کے متعلق مگر احاطہ مسجد کے باہر ایک کتب خانہ ہے۔ جو دن بھر کھلا رہتا ہے۔ اور جس میں طلبہ اور دیگر شائقین کتابیں پڑھنے آتے رہتے ہیں۔ استانبول کے عام کتب خانوں میں یہی ایک کتب خانہ ہے جسے میں دیکھ سکا۔ یہ مسجد استانبول کے سب سے مشہور اور قدیم بازار کے عقب میں واقع ہے اور اس لئے آباد ترین مساجد میں ہے۔

والدہ جامعہ - یعنی والدہ سلطان کی مسجد۔ یہ مسجد سلطان محمد رابع کی والدہ نے ۱۶۶۵ء میں تیار کرائی تھی۔ اس کے مینار دوسری مسجدوں کے میناروں سے زیادہ خوبصورت ہیں اور ویسے بھی اس میں ایاصوفیہ کے نقشے کی عام تقلید کا اثر نظر آتا ہے۔

یمنی والدہ جامعہ - ایک چھوٹی سی خوش وضع مسجد ہے جسے سلطان عبدالعزیز مرحوم کی والدہ نے سن ۱۲۵۰ھ میں بنوایا تھا۔

جامعہ سلیمیہ۔ یہ بھی سلیمان اول کے کارناموں میں سے ہے۔ سلیمان اول نے
عثمانی تعمیرات میں دوسرے عثمانی سلاطین سے وہ نسبت ہے جو ہندوستان میں شاہجہان
دیکر شاہانِ مغلیہ سے تھی۔ اس نے صرف اپنے نام کی ایک بڑی عالیشان مسجد بنائی
پراکتفا نہیں کی۔ بلکہ کئی مسجدیں بنوائیں۔ ان میں ایک یہ مسجد اپنے والد بزرگوار
سلیم اول کے نام سے نامزد کی۔ قسطنطنیہ کے اُس حصے سے جسے پیرا کہتے ہیں۔
پہلے اسی کے بلند مینار نظر آتے ہیں۔ یہ سلیمانیہ کی شان کو تو نہیں پہنچتی۔ مگر اپنی جگہ
نہایت خوش نما ہے۔ کتب خانہ اور مدرسہ اس کے ساتھ بھی موجود ہیں۔ ہستنابول
کی مسجدوں کے ساتھ ایک معقول حمام اور ایک ”خان“ یعنی ہمانسراے بنائے
کا بھی دستور ہے اور یہ دونوں چیزیں مثل اوسماجد کے سلیمیہ میں بھی ہیں۔

شہزادہ جامع۔ اگر سلیمیہ جامع سلطان سلیمان اول کی سعادت مندی اور محبت
فرزندانہ کا ثبوت تھی تو شہزادہ جامع اس کی شفقت پرانہ کا اظہار ہے۔ اس کے
محنت جگر شہزادہ محمد اور شہزادہ جہانگیر اور انکی ایک بہن اس مسجد کے احاطے میں دفن
ہیں۔ اور ہستنابول کی بیشمار تربتوں میں ایسی خوبصورتی اور نزاکت سے آراستہ
تربتیں شاید ہی اور کہیں ہوں۔ شاہزادوں کے انتقال سے بادشاہ کے دل پر جو
چوٹ لگی۔ اُس کے اثر سے یہ مسجد قائم ہوئی اور بعد کو جب بیٹی کا صدر بھی لاپ
کو سہنا پڑا تو اسے بھی اُس کے مرحوم بھائیوں کے پہلو میں لٹایا گیا۔ یہ مسجد سلیمان
کے زمانے کی عمدہ ترین تعمیرات میں ہے اور شہر کے نہایت آباد حصے میں واقع ہے۔
مہر ماہ جامع۔ سلیمان اول نے اپنی چھٹی بیٹی مہر ماہ کی یادگار کے
طور پر یہ مسجد بنوائی تھی۔ افسوس کہ اب محض کھنڈر ہے۔ ۱۵۹۷ء کے شدید زلزلے

دستم پاشا جامع - مصری بازار کے قریب یہ مسجد بھی دیکھنے کی چیز ہے۔
سلطان سلیمان کے داماد - ہر ماہ کے شوہر نے بنوائی تھی۔ خوبصورت عمارت ہے
اور اندر سے نہایت آراستہ۔

عتیق علی پاشا جامع - ہر زمانے میں امرا اور وزرا بادشاہ کے مذاق کے
مطابق اپنے مذاق ڈھال لیا کرتے ہیں۔ یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ سلیمان اول کا عزیز
اپنے آقائے نامدار کے نقش قدم پر نہ چلے۔ چنانچہ یہ مسجد وزیر نے اپنی یادگار چھوٹی
نوری عثمانیہ جامع۔ استانبول میں اور بھی کئی ایک مساجد ہیں۔ جن میں
شاخ زین کے اُس پار کی جامع بشکطاش قابل ذکر ہے (جامع حمیدیہ کا ذکر پہلے
سرا ہے ہمایوں کے سلسلے میں آچکا ہے۔ گو وہاں اس کے نہایت خوبصورت
نقشے کی داد نہیں دی گئی۔ جو دوسری مساجد سے بالکل نرالا اور سلطان المعظم کے
ذاتی مذاق تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے) مگر استانبول خاص کی جس مسجد کے ذکر پر مساجد کے
اس مختصر بیان کا خاتمہ ہے۔ وہ نوری عثمانیہ ہے۔ سلطان محمود اول نے اُسے
بنانا شروع کیا تھا مگر اختتام کا سہرا اُس کے بھائی عثمان ثالث کے سر رہا۔ ساری
عمارت سنگ مرمر کی ہو۔ اسی لئے شاید اسے نوری کہتے ہیں۔ یہ مسجد اُسی بڑے
بازار سے ملتی ہے۔ جس کے عقب میں جامع بایزید یہ ہے اور چونکہ مسجد کے
دروازے سے نکل کر بازاریں آبائی داخل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے بازار کو ابھی دیکھ
لینا چاہئے۔

بازار مسقف

بغداد قدیم کی جو کہانیاں الف لیلہ میں ہیں۔ اُن کا نقشہ استنبول کے مسقف بازاروں کو دیکھ کر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ بازار کیا ہے بیسیوں بازاروں کی گلیوں کی ایک جھول بھلیاں ہی۔ اس کے گرد مضبوط دیوار ہے اور اوپر چھت ہے۔ اندر داخل ہونے کے لئے بہت سے دروازے ہیں۔ اور ہر دروازہ اور اس کے سامنے کا بازار ایک خاص تجارت کے لئے مخصوص ہے۔ کہیں زرگر ہیں۔ کہیں جوہری۔ کہیں برز ہیں۔ کہیں شال و قالین کے سوداگر۔ کہیں فرنگستان کا مال ہے کہیں ایشیا کا۔ ایک طرف بروہ کے ریشمی کپڑے اور خوبصورت توال رکھے ہیں۔ دوسری طرف ایران کے ظروف سستی اور دیگر مصنوعات۔ ہر قوم کے سوداگر اس بازار میں ہیں اور قریب قریب دنیا کی ہر زبان یہاں بولی جاتی ہے عرب عربی بولتے ہیں۔ ایرانی فارسی۔ ارمنی اور یونانی عیسائی اپنی زبانوں اور ترکی کے علاوہ ٹوٹی بھوٹی انگریزی۔ یا فرانسیسی یا جرمن بولتے ہیں بعض کئی کئی غیر زبانیں جانتے ہیں۔ روسی بولنے والے بھی موجود ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ مروج ترکی ہی ہے۔ اور اسے اس بازار میں کام کاج کرنے والے سب جانتے ہیں بازار کی چھت پتھر کی ہے اور بیشمار چھوٹے چھوٹے گنبدوں کا مجموعہ ہے۔ ان گنبدوں میں دریچے ایسی ترکیب سے لگے ہیں کہ روشنی صبح و شام بازار میں نہنچتی رہتی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا لوہے کی مضبوط سلاخوں سے ان گنبدوں کو سہارا دیا گیا ہے۔ کیونکہ

۱۸۹۲ء کے شدید زلزلے سے اس بازار کا ایک حصہ گر گیا تھا اور سینکڑوں جانیں تلف ہوئی تھیں۔ اس لئے احتیاطاً حرمت کے وقت اور لوہے کی کڑیوں سے چھت کو مضبوط کیا گیا۔ اور یہ بازار پھر ویسا ہی آباد ہو گیا جیسا زلزلے سے قبل تھا۔ لیکن مزے کی بات ہے کہ بعض لوگوں کو اب تک اس کے اندر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ملاقاتیوں میں ایک صاحب اس بازار سے بہت گھبراتے تھے اور گھبرانے کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ وہ زلزلے کے وقت بازار میں موجود تھے اور اتفاق سے بچ نکلے۔ مگر اُس دن سے پھر اس کے اندر نہیں گئے۔ ہم نے انہیں بار بار لیجانا چاہا۔ لیکن وہ جانے پر راضی نہ ہوئے۔

کہتے ہیں نسبت سابق اس بازار کی رونق میں کمی آگئی ہو۔ آج کل کچھ نویں اپنی چیزوں کے رواج سے یہاں گاہک کم آتے ہیں کیونکہ ترکی اُمر کا رجوع پیرا کی یورپی دوکانوں کی طرف ہو گیا ہے اور کچھ عام تول کی کمی کی وجہ سے بھی یہاں کی رونق پہلی سی نہیں رہی۔ جنگِ روس و روم کے وقت تک اس میں قیمتی اشیائیں کالین دین بے انتہا تھا اور ادنیٰ و اعلیٰ سب یہیں آتے تھے۔ ایک انگریز تاج جس نے اس بازار کو اُس زمانے میں دیکھا ہے۔ اس کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہے۔ دوکانوں کی یہ مستقیم قطاریں اگر سب جمع کر کے دیکھی جائیں تو میلوں لمبی ہونگی متیرے ستیاج کی آنکھ یکے بعد دیگرے ان خوش منظر گلیوں کو دکھیتی ہو۔ جہاں دُنیا بھر کی مصنوعات کی نمائش ہو۔ گھنٹہ بھر ان گلیوں میں گھومتے رہیں۔ تو ایک جگہ دو فوہ کنے کی ضرورت نہیں۔ اور اس سارے عرصے میں آنکھ کہیں ہیروں پر پڑتی ہو۔ کہیں سونے پر۔ کہیں کشمیر کے دو شالے ہیں اور کہیں چین کے ریشم۔ چمکتے ہوئے

اسلم۔ ہمتی ہوئی خوشبوئیں۔ مجلا آئینے اور مٹلا ظروف۔ زردوزی کے عجیب نمونے۔ حزن پاپوش۔ عنبر کے مہال مرصع جواہرات۔ سب یہاں رکھے ہیں۔ کسی چھوٹی سے چھوٹی قطار کی طرف بھی دیکھو تو دنیا کا ہر رنگ اُن اشیاء میں موجود ہے جو وہاں نظر آتی ہیں۔ غرض یہ بالکل نرالا نظارہ۔ اس کا شور۔ اس کی حرکت اور جلدت پہلے پہل انسان کو بالکل محو حیرت کر دیتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آج کل گراں بہا زردو جواہر اور بیشمنے اور دو شالوں کی زیادہ تر نئے اور سستے مغربی مال نے گھیر لی ہے۔ اور یہ بازار اُس تمام مال و متاع کا مالک ہونے کا فخر نہیں کر سکتا۔ جس کا بیان ایسی بے ساختہ قدر دانی سے اس کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن اب بھی اپنی قسم کے سب بازاروں سے جو بعض اور مقامات میں رونق پر ہے۔ قیمتی جواہرات۔ سونے چاندی کے برتن۔ ریشمی کپڑے اور کشمیری شال۔ زردوزی کے اعلیٰ نمونے۔ مٹلا اشیاء آج بھی اس میں مل سکتی ہیں۔ اور کئی دوکانیں جو بظاہر بہت چھوٹی اور کم حیثیت نظر آتی ہیں۔ لاکھوں روپیوں کا مال رکھتی ہیں۔ گاہک کے لئے اپنی جیب روپیوں سے بھر کر جانے اور باہر کینہہ آنے کے لئے اب بھی کافی سامان ہے۔ الوان گونا گون کی اب بھی وہی بہا ہے جو پہلے تھی اور آنے جانے والوں کی کثرت اور بھیڑ بھاڑ کا اب بھی یہ حال ہے کہ آدمی وہاں دن بھر بیٹھا سیر دیکھا کرے تو جی نہ بھرے۔ ہر وضع اور ہر لباس کے لوگ سامنے سے گزریں گے۔ عورتیں بھی فراجہ پہنے سودا سلف کرنے آتی ہیں۔ کہتے ہیں اب اُمرا کی عورتیں یہاں نہیں آتیں۔ کیونکہ اُن کے موجودہ استعمال کی چیزیں ان دوکانوں میں نہیں ملتیں۔ لیکن دُور سے آئے ہوئے مسافر کو اس سے کیا غرض۔ کہ

میں اسے نظر آتی ہیں طبقہ امرا میں سے ہیں یا نہیں۔ اس کی
 صاحب کا نگاہ تصور کی مدد سے اُسی منظر میں جو پیش نظر ہے۔ بغداد کی کہانیوں کی تصویر
 سب سے پہلی جگہ پر ہے۔ اور وہ حیران ہوتا ہے۔ کہ مشرقی زندگی کا یہ دلچسپ نمونہ بیسویں
 صدی کے کس کس سخت جانی کے ساتھ زمانہ کی زد سے اپنے آپ کو بچائے ہوئے ہے۔
 اس قسم کے بازار سب پرانی قوموں نے اپنے اپنے ماں بنائے تھے۔ روما
 اور یونان قدیم میں یہ رسم تھی اور قسطنطنیہ میں شاہانِ بزنطائن کے عہد میں بھی یہ
 بازار تھے۔ بازاروں نے اُسے اور رونق دی۔ اب گو مذاقِ زمانہ بدل گیا ہو۔ تاہم
 ایسے بازاروں کا شوق کسی نہ کسی صورت میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ لندن
 میں بھی سقف بازار دو ایک ہیں۔ جنہیں آرکیڈ کہتے ہیں۔ اور گو بہت لمبے
 نہیں۔ پھر بھی چھوٹے پیمانے پر اسی نمونے کی تقلید ہیں۔ یورپ کے بعض اور
 شہروں میں میں نے لندن سے زیادہ لمبے سقف بازار دیکھے ہیں۔ اس کے
 سوا یورپ کی بعض مقامی نمائشوں میں جو کئی کئی ہینے رہتی ہیں۔ اُسی اصول سے
 کام لیا جاتا ہے۔ جس پر یہ پرکھنے بازار قائم تھے۔ گویا یہ بازار اسی نمائش کا
 کام دیتے تھے۔ جو ہمیشہ جاری رہے۔ شمالی ہندوستان میں جو نوچندی کے
 میلے اور نمائشیں ہوتی ہیں۔ جہاں اسی طرح دوکانوں کی قطاریں صرف و ارگتی
 ہیں اور ہر پیشے کے لوگ ایک علیحدہ حصہ اپنے لئے مخصوص کرتے ہیں۔ ان کے
 وسیع میدانوں پر اگر ایک نہایت بڑا شامیانہ تھن کر عارضی سقف کا کام لیا
 جائے تو ایک صورتِ استانبول کے اس بازار کی اُن میں پیدا ہو جائے۔
 موجودہ زمانہ میں جو مارکیٹ ٹرے بڑے شہروں میں رہتی ہیں۔ وہ بھی اسی قسم

کی چیز ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مارکیٹ میں زیادہ تر روزمرہ کی ضروریات اور کھانے پینے کی چیزیں کچا فروخت ہوتی ہیں اور کیڑوں وغیرہ کے لئے کہیں کہیں ایک حصہ ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے ان بازاروں میں کیڑے اور زیور اور سامان کی چیزیں سب کچا جیتا ہیں اور کھانے پینے کے لئے چند دوکانیں ہیں جہاں اس بازار کے مشتری تفریح کی غرض سے جاتے ہیں۔

جس کسی کو استانبول کے خاص مذاق کی چیزوں کے چکھنے کا شوق ہو جنہیں عثمانی بہت شوق سے کھاتے ہیں تو بڑے بازار کی دوکانوں میں ان کے عمدہ نمونے مل سکتے ہیں۔ سونلج یعنی کھیر-جھلی یعنی فیڑینی کی کئی دوکانیں اس بازار میں ہیں۔ ہندوستان کے فالودہ یا فیڑینی نیچے والوں کی دوکانوں سے کسی تیز مزاجی جو مختلف ہیں۔ دوکان کے دروازہ پر ایک پردہ لٹک رہا ہے۔ اندر جائیں۔ تو کدو کے سنگ مرمر کے میز اونکے ساتھ گرہیاں یا مٹھی گدے دار بنچ موجود ہیں۔ آرام سے بیٹھ کر کھا سیتے۔ اگر زیادہ دیر بیٹھنا ہو تو دوکاندار ایک ادھر روزانہ اخبار بھی آپ کے دل پہلانے کو پیش کر دیتا ہے۔ کئی دوکانوں میں عورتوں کی نشست کے لئے علیحدہ کمرہ بنا ہے۔ وہ آتی ہیں اور اس کا پردہ اٹھا کر اندر چلی جاتی ہیں۔ یہ علیحدہ کمرہ بنایا گیا ہے۔ گویا مرد خریداروں سے علیحدگی ہے۔ ورنہ انہیں دوکاندار سے پردہ نہیں کیونکہ اندر وہ نقاب الٹ کر بیٹھتی ہیں اور کھاتی پیتی ہیں اور دوکاندار برابر ان کا جاننا رہتا ہے۔ جس سے اس صورت میں پردہ نہیں ہو سکتا۔

بازار کے وسط میں ایک حصہ ہے جہاں پر لے لے سلحہ اور دیگر اشیاء کی بکرت رکھی ہیں۔ اس حصہ کو بوسہ تان کہتے ہیں۔ اور اسی لئے اس بازار کو بکری

اوقات ترکی میں بوستان چارشی یعنی بوستان والا بازار کہتے ہیں۔ چارشی غالباً
وہی لفظ ہے جو فارسی میں چار سو ہے اور ہمارے چوک کا مترادف ہے۔
شام کو یہ اور اس قسم کے سب بازار بند ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان کی سیر کا
بہترین وقت دوپہر سے ذرا بعد ہے۔

اس بازار کے نواح میں جو کھلے بازار ہیں۔ وہ بھی بہت آباد ہیں۔ اور انکی
رونق کی زیادتی کا باعث ہیں۔ مگر بعض چھوٹے چھوٹے مسقف بازار اور بھی
اسی قرب وجوار میں واقع ہیں۔ ان میں ایک بازار ہے۔ جہاں پرانے کپڑے
اور اور اندازاں چیزیں فروخت ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن چھوٹے بازاروں میں سب سے
دلچسپ مہر چارشی ہو۔ جہاں مشک و عنبر و عطریات۔ یونانی دوائیاں اور ہر طرح
کے خشک میوے اور مصالح بکتے ہیں۔

اکثر بڑے بڑے مشرقی شہروں میں دوکانداروں کی جو عادت ہو۔ کہ اپنی اشیاء
کے دام اصل سے بہت بڑھا کر مانگتے ہیں اور مسافر کو دسٹے میں تامل نہیں کرتے۔
وہ یہاں کبھی موجود ہے۔ اس لئے ہر اجنبی کے لئے جو ان بازاروں سے کچھ
تحفے خریدنا چاہے لازم ہے کہ یا اپنے ساتھ کوئی باخبر رہبر رکھے جو ترکی زبان
بھی جانتا ہو اور یا کئی جگہ سے بہاؤ پوچھنے اور نرخ کے مقابلہ کرنے کے بعد
خریداری کرے۔ ان دوکانداروں میں بعض ارمنی اور یونانی خصوصیت سے ٹھکانے
دینے میں شائق ہیں اور ہر ایک کے اکثر تیلج جنہیں پیشہ ور صیانی رہبروں کی
وجہ سے زیادہ تر انہی سے سابقہ پڑتا ہے۔ تانہوں کے دوکانداروں کی نسبت اپنی راستے
انہی کی عادات کے مشاہدے سے قائم کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ نہیں دیکھتے کہ ان کی سیر کی

خان والدہ

بڑے مسقف بازار کے قریب ایرانیوں کی تجارت کا مشہور مرکز خان والدہ ہے۔ یہ پرانی کاروانسرا ہے۔ جس میں اب ایرانی تجارت مستقل طور پر مقیم ہیں۔ اور ان کا کاروبار ان کے اعتبار سے بہتر اسی احاطے کے اندر ہوتا ہے۔ استانبول کی خصوصیتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اس میں جو بازار ہیں کاروانسرائیں بکثرت ہیں۔ انہیں یہاں خان کہتے ہیں اور ان کی تعداد چھوٹی میں سے لے کر بڑی ملا کر دوسو کے قریب ہے۔ ان کے نام عموماً ان کے بانیوں کے نام سے لے کر ہیں اور ترکی کے گئے ہیں۔ اور یہاں زمانے میں استانبول کی تجارت کی ترقی کے اسباب میں ایک بڑی چیز ہے۔ اس بڑے سبب یہی تھا کہ مسافر تاجروں کو جو دنیا کے ہر گوشے سے اس بڑی منڈی کی طرف تشریف لے کر آتے تھے ان مکانات میں ہر طرح سے آرام ملتا تھا۔ ان کی ساخت اسی ڈھنگ کی ہے جو ہندوستان کی کئی پرانی سراؤں کی تعمیر میں برتا گیا ہے۔ یعنی چھوٹے چھوٹے حجرے کی قطار چاروں طرف ہے اور عمارت میں لکڑی سے کام نہیں لیا گیا۔ اینٹ اور گِل ہی سے بنے ہیں۔ چاروں طرف سے عمارت ہو۔ اور گنبد دار چھت ہے۔ وسط میں صحن ہے۔ ان کے دروازے کے سر اوں میں رہنے کے لئے مذہب و ملت کی کوئی قید نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ اور اس وقت بھی کئی سرائیں ایسی ہیں جن میں بخارا اور سمرقند تک کے لوگ ایشیا اور عرب اور حبشی افریقہ سے آکر مقیم ہوتے ہیں۔ ایک کوٹھڑی کرائہ پر لی۔ وہاں اپنے رکھا اور کھانا کھانے بازار چلے گئے۔ روسی مسلمان جو حج کو جاتے وقت ادھر سے گذرتے ہیں۔ ان میں بھی جو عرب طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں وہ انہی سراؤں میں قیام کرتے

ہیں۔ لیکن یہ عمارتیں آج کل زیادہ تر تاجروں کے گودام وغیرہ کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔
 دوران میں سے بعض تجارتی کارکن کسی خاص جماعت کے لئے مسجد نہیں ہو گئی ہیں۔ اس آخری
 قسم میں کوئی عمارت خان والدہ سے زیادہ آباد اور پُر رونق نہیں ہے۔

استانبول سے باہر لوگوں کو عام طور پر یہ معلوم نہیں کہ اس عثمانی پائے تخت میں ایرانی
 مسلمان آباد ہیں۔ انکی تعداد چالیس ہزار کے قریب ہے۔ اور سب اپنی اپنی جگہ
 پر اپنی حالت میں ہیں۔ جو بالکل غریب اور بے ہنر ہیں وہ مزدوری پیشہ ہیں اور تجارتوں
 اور کاریوں اور مزدوروں میں ملے جملے کام کرتے ہیں۔ یہاں رہتے رہتے ترکی سے سب
 کے انداز مشابہ ہو گئے ہیں اور ترکی ٹوپی پہنے رہتے ہیں۔ اس لئے آسانی سے تمیز نہیں ہو
 سکتے۔ لیکن کسی کو فارسی میں بات کرتے سُنیں تو خود بخود متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ان سے
 اس زبان اور جو طبقہ ہے۔ وہ خوبچے والے ہیں۔ کوئی میوہ بچتا ہے۔ کوئی مٹھائی۔ لیکن
 سب ان کے کھانے کا کام کرتے ہیں۔ ایک بڑی سی سادہ اور ہر وقت گرم رہتی ہے اور ایک
 بڑی کھانا میں چھوٹے چھوٹے بلوری گلاس دھرے رہتے ہیں۔ ان میں بے دودھ
 دہی کی چلے یہ لوگ بیچتے ہیں۔ ہر ایرانی مزدور صبح کو کام پر جاتے ہوئے ان کے پاس
 سے بیٹھ کر پیسے دو پیسے کی چاکے پی جاتا ہے اور یہ لوگ اس ذریعے سے اپنا معقول
 گزارہ کر لیتے ہیں۔ ان سے اوپر ایرانی دوکاندار ہیں۔ جن میں سے اکثر
 خشک پسا ہوا قہوہ بیچتے ہیں اور اس کے ساتھ بساطی کی دوکان کرتے ہیں۔
 لیکن اس گروہ کے سوا جسے استانبول کے ایرانیوں کا طبقہ عوام کہنا چاہئے۔
 ایک معقول طبقہ خواص ہے۔ جن میں کسی لکھ پتی تاجر ہیں۔ جن کی تجارت دُور
 دُور تک ہے۔ وہ ایران کا مال استانبول میں بیچتے اور استانبول کا مالک غیر

میں بھیجتے ہیں اور ہوتا ہول کی بیرونی تجارت کا وہ حصہ جو عیسائی اور یہودی
تجار سے بچ رہتا ہے۔ بیشتر انہی کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ عثمانیوں کو بحال
تجارت سے کچھ مناسبت نہیں۔ ایرانیوں کے لئے یہ بات بیشک قابل توجہ
ہے۔ کہ وہ وطن سے اتنی دُور محنت اور سعی سے معقول روزی پیدا کرتے
ہیں۔ اور اپنے آپ کو اور اپنے بھائیوں کو نفع پہنچاتے ہیں۔

خان والدہ کے اندر جائیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دفعۃً روم سے
ایران میں جایں۔ ایرانیوں کی حب وطن نے اسے ایران کا ایک چھوٹا سا
خلفہ بنا رکھا ہے۔ ذہین اور خوش مذاق تو یہ لوگ بالطبع ہوتے ہیں۔ اور ان کا
مذاق ان کی طرزِ بود و باش سے نمایاں ہے۔ ہر ایک نے اپنے کمروں کے
آگے درخت لگائے ہیں۔ انگور کی سیلوں سے برآمدے چلے ہیں اور موسم
گرمایں شام کے قریب چھڑکاؤ وغیرہ کرا کے ان درختوں کے سائے میں
ہر ایک اپنی اپنی محفل گرم کرتا ہے۔ یہ لوگ گرے بھی کھاتے۔ کیکڑے
نہیں اور نہ روپیہ حاصل کرنے کی دھن میں دنیا کے اور سب شوقوں سے
بے پروا ہیں۔ تباہ ہیں۔ مگر ذی علم اور علم دوست۔ شام کو جب کاروبار سے
فارغ ہو کر بیٹھتے ہیں۔ تو ان کے ہاں علم و فن اور شعر و سخن کا چرچا ہوتا ہے۔

مجھے خان والدہ میں جانے کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا۔ محض شوقِ سیر تو ایک
دفعہ لیجاتا۔ مگر مزاحسن اصفہانی معتمد التجار اور حاجی زین العابدین مراغہ کی ہوتا
کشش کئی بار لے گئی۔ مجھے ان بزرگوں سے ملنے کا اتفاق دولتِ عالیہ ایران
کے سفیرِ عالیجناب پسر ارفع الدولہ کے ہاں ہوا۔ شاہ ایران کی سالگرہ کے جشن کے

دن میں شریکیتِ شین ہونے کو مدعو تھا اور اُس دن استانبول کے سبکدوش برساتِ خا
 میں جمع تھے۔ مینے وہاں اثنائے گفتگو میں جو اتحادِ اسلام کا ذکر کیا تو مجھے دیکھ کر
 بے انتہا مسرت ہوئی کہ جلسے کے بعد اکابرِ ایران میں سے کسی اصحاب نے بڑے
 زور سے اس خیال کی تائید کی اور یہ کہا کہ موجودہ زمانے میں اسلام کی حفاظت اسی
 صورت میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کے سب فرقتے اپنے جزوی اختلافات کو بھلا کر ایک
 دوسرے کی بھلائی کے لئے سعی ہوں۔ اور بھلائی بھائی ہو جائیں۔ حاجی
 زین العابدین ایک مَسْ بزرگ ہیں۔ جنہوں نے مدت سے اپنی تحریروں میں آزادانہ
 خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور جن کی روشن خیال تحریروں سے سینکڑوں لوگ
 ایران میں روشن خیال ہو گئے ہیں۔ مرزا محسن اصفہانی نوجوان ہیں۔ اور حاجی صاحب
 کے ہم خیال۔ ان دونوں صاحبوں نے مجھ سے میرا پتہ نشان دریافت کیا اور
 دوسرے دن ہوٹل میں مجھے ملنے آئے۔ اس کے بعد میں باز دید کو گیا۔ پھر
 ایک دن معتمد التجار نے خان والدہ میں شام کے کھانے پر بلایا اور اُس دن اہل
 ایران میں سے پندرہ بیس اور سرکردہ لوگ وہاں موجود تھے۔ اُس شب کی
 مجلس نریک نہ بھولے گی۔ اسی طرح وہ مجلس بھولنے کی نہیں جو پھر ایک دن جاتی تھی
 کے ہاں دعوت کے موقعہ پر ہوئی۔ لیکن وہ خان والدہ سے باہر تھی۔ اس مجلس میں
 علماء بھی تھے اور روسا بھی۔ نئی روشنی کے لوگ بھی اور پرانی تعلیم کے تربیت یافتہ
 بھی۔ نہ ہی تمدنی سیاسی سب قسم کے معاملات پر گفتگو ہوتی رہی اور نہ مجھے دیکھ کر
 کہ سب مسائل پر ان اصحاب کے خیالات معقول اور مناسب تھے۔ بہت خوشی ہوئی
 اور میں نے دل میں کہا کہ اگر ایران میں اہل ایران کا کوئی معتد بہ حصہ ان خیالات

میں رنگا جاکھا ہے تو سمجھنا چاہئے کہ ایران کے بعلے دن آئیوالے ہیں۔

ہمارے معزز میزبان اور حاجی صاحب کے سوا جو اصحاب اس مجلس میں حاضر تھے۔ اُن میں چند کے نام مجھے یاد ہیں۔ یہاں لکھے دیتا ہوں۔ مولانا سید عبد الجواد محدث پھرانی مولانا سید علی اشرف امام سفارت ایران و قزوین جو پھران کے نامور اطباء میں ہیں اور جنہوں نے پیرس میں تحصیل طب کی ہے۔ وہ اپنے بھائی کو ملنے وائنا (پایہ تختِ آسٹریا) گئے تھے اور وہاں سے واپس آئے ہوئے استانبول ٹھہرے۔ حاجی سید احمد آغا جو پھران کے ایک بڑے جوہری ہیں۔ اور اپنے کاروبار کے لئے سفر یورپ کو آئے تھے۔ مرزا رفیع برادر مرزا حسن جو بیروت میں تعلیم پاتے ہیں اور تعطیل کی وجہ سے آئے ہوئے تھے۔ ایرانیوں میں تجارت کرنے اور پڑھنے لکھنے کے لئے گھر سے نکلنے کا شوق اُن کی میراث کا نشان ہے۔ نہ ہی تمدنی اور سیاسی معاملات پر اُن آراء کا خلاصہ جو میں نے اس مجلس میں سنیں نہیں مختصر جملوں میں ہو سکتا ہے:-

۱۔ سستی اور شیعہ کا جھگڑا اب ختم ہو جانا چاہئے۔ ورنہ دونوں مٹ جائینگے۔ اپنے اپنے عقائد پر ہر کوئی اپنے اپنے گھر عمل کرے۔ لیکن دنیاوی ترقی اور باہمی حمایت اور مروت کے راستے میں عقاید کو حائل نہ ہونے دے۔

۲۔ تمدن میں بعض اصلاحات ضروری ہیں۔ لیکن اُن میں اعتدال اور میاندازی سے کام لینا چاہئے۔ مثال کے طور پر سیکہ تعلیم نسوان لیجئے۔ اس پر بہانہ کہ تو نے پُرانے سب متفق تھے۔ کہ تعلیم نسوان لا بد ہے۔ صرف اس بات میں اختلاف تھا کہ کس حد تک تعلیم نسوان ہونی چاہئے۔ کثرتِ رائے یہی تھی کہ مردوں کے مساوی

تعلیم ضروری نہیں۔ کیونکہ مرد اور عورت کے فرائض حبہ اگانہ ہیں۔

۳۔ سیاسی معاملات میں رعایا کے حقوق کی حفاظت اور رعایا کی انتظامیہ ملک میں شرکت اس زمانے میں نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی قوم دیگر اقوام متہذہ کے مقابلے کی تاب نہیں لاسکتی۔ اس بارے میں وہ سب ایران میں ٹیپٹ کی بنیاد پڑنے پر خوش تھے اور اس کی کامیابی کے ساتھ اپنی ترقی کی سب اُمیدیں وابستہ سمجھتے تھے۔

سب سے ضروری اور حوصلہ بڑھانے والی بات وہاں یہ دیکھی۔ کہ علمائے خیالات سے موافقت کرتے تھے اور فخر یہ یہ کہتے تھے کہ ایران میں جو سیاسی آزادی کی ابتدا ہوئی ہے اس کے بانی اور بڑے محرک علمائے ہی ہیں اور یہی لوگ رعایا کی طرف سے حقوق مانگنے کے لئے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہوئے حقیقت میں علمائے اور خصوصاً ایران کے علمائے کی حالت میں یہ انقلاب کچھ معمولی انقلاب نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے۔ کہ اگر یہ یا اثر طبقہ کسی خیال یا رائے کے موافق ہو جائے تو اصلاح میں کس قدر آسانی ہوتی ہے۔

خان والدہ کی صحبتوں کی یہ گرمی ماہ مبارک محرم میں مبدل بہ مجالس عبادی ہو جاتی ہے۔ صحن کے وسط میں ایک مسجد ہے۔ اس کے قریب شامیانے لگا کر عزا خانہ بنایا جاتا ہے اور اس میں محرم میں مرثیوں کی مجالس کے علاوہ پُرجش ماتم ہوتا ہے۔ جس سے دیکھنے والوں کے دل ہل جاتے ہیں۔

معزز ایرانی عموماً استانبول میں بھی اپنے ملک کا لباس پہنتے ہیں۔ یا اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم ٹوپی ایرانی ہوتی ہے۔ یعنی اونچی دیوار کی سیاہ بانات کی

ٹوپی۔ جو ہمارے ہاں ہندوستان میں بھی بعض جگہ مروج ہے۔ اور خالی اندوہیں
 کئی پرانی وضع کے ایرانی اپنے گھیرے دار چٹے ہوئے کوٹ بھی پہنے نظر آتے
 ہیں۔ شہر کے اس حصے میں کئی ایرانی نان پر بھی رہتے ہیں جو ایرانی روٹیاں
 بیچتے ہیں۔ غرض اس قدیم عمارت کے اندر اور اس کے قرب و جوار میں ایران کا
 سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ افسوس کہ پرانی ہونے کے سبب اس کے بعض حصے
 اب خطرناک ہیں۔ چنانچہ ایک حصہ ہمارے قیام استانبول کے زمانے میں ایک
 رات کو اچانک گر گیا۔ رات کو چھ نکلے لوگ وہاں کم رہتے ہیں۔ اور وہ حصہ اتفاقاً
 سے خالی تھا۔ اس لئے یہ خیریت رہی کہ جانوں کا نقصان نہیں ہوا۔ اب جب
 از سر نو بنایا جائیگا تو نئی عمارتوں کی طرز پر بنے گا۔ زمانہ اسی طرح ہر دور میں
 ہر جگہ تبدیلیاں کرتا رہتا ہے۔ جو پرانی چیزیں باقی ہیں وہ غنیمت ہیں۔ اگلی
 دیکھ کر عہد رفتہ کی کہانیاں یاد آتی ہیں اور اس وقت کے تمدن کی ایک
 جھلک کھائی دیتی ہے۔



جامع ایوب ہفت برج

شہر کی بڑی بڑی عمارتوں سے فارغ ہو کر فصیل قدیم کے باہر کلیں تو سب
 مقدّم قابل دید جامع ایوب ہی حضرت ایوب انصاری سامقرب صحابی حبس قطیف میں
 کے میں مدفون ہو۔ اس سے جو ارا دت مسلمانوں کو ہونی چاہئے وہ ظاہر ہے۔ انکا
 عربوں کے حملہ اول کے ساتھ۔ شہر کے گرد محاصرہ کئے پڑے رہنا اور آخر میں
 بیمار ہو کر رحلت فرما تا تاریخوں میں مذکور ہے۔ لیکن فتح قطنطنیہ سے پہلے
 عثمانیوں کو ان کے مزار مبارک کا ٹھیک نشان نہیں معلوم تھا۔ اتنا سننے
 تھے کہ شہر کے باہر فصیل سے تھوڑے فاصلہ پر فلاں گوشے میں مدفون ہیں۔
 شیخ شمس الدین (ابض) نے جو عہد سلطان فاتح میں لئی کامل مانے جلتے
 تھے۔ سلطان کو فرودہ فتح دیا اور کہا کہ حضرت ایوب انصاری کے مزار کا نشان
 انہیں خواب میں دیا گیا ہے۔ اس نشان کے مطابق سلطان محمد فاتح نے مزار
 تعمیر کرایا اور اس کے ساتھ ایک شاندار مسجد بنائی۔ اور یہ مسجد باوجود شہر سے
 دور ہونے کے استانبول کی آباد ترین مساجد میں ہے اور اس مزار کی وجہ
 سے جو فروغ اور شہرت اسے حاصل ہے وہ مزید برآں۔ ہر روز ایک میلہ سا
 لگا رہتا ہے اور جمعہ کے دن تو زائرین کی جن میں ہر طبقے کے زن و مرد موجود
 ہوتے ہیں۔ بہت ہی کثرت ہوتی ہے۔

استانبول میں ہر کہ وہ اس مقام کو مقدّس سمجھتا ہے۔ اسی تین اور تبرک

کے خیال سے سلاطین عثمانیہ کی تاج پوشی پر ہر نیا بادشاہ یہاں آتا ہے اور بانی
خاندان سلطان عثمان غازی کی تلوار اپنے کمر بند میں لٹکاتا ہے۔ اس احاطے کے پُرانے ہو۔
میں اور اس کے قریب مدفون ہونے کی سب کو آرزو رہتی ہے۔ اور جن لوگوں
کو اس قبرستان میں اپنے خاندان کی قبروں کے لئے محفوظی سی زمین
مبستر آجائے وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ پُرانے زمانے
کے وُڑا اور اراکین دولت بیشتر اسی قبرستان میں سو رہے ہیں۔ اور
اس سبب سے یہ علاقہ مسلمانوں کو اور بھی عزیز ہو گیا ہے۔ اس کے گرد
چھوٹی سی آبادی ہے جو شہر سے جدا ہے۔ یہ آبادی ساری مسلمانوں کی ہے۔
کیونکہ اس مزار اور جامع کی تعظیم یہاں تک کی جاتی ہے کہ غیر مذاہب کے
لوگوں کو نہ مسجد میں آنے کی اجازت ہو۔ نہ اس علاقہ میں زمین یا مکان
خریدنے کی۔

استانبول سے جامع ایوب کو جانے کے کئی راستے ہیں۔ مگر سب
آسان اور مقبول راستہ یہ ہے کہ بڑے پل سے کشتی میں بیٹھ گئے اور عین
جامع ایوب کے سامنے جا اُترے۔ اُترتے ہی ہندوستان کے مشہور
اولیا کی درگاہوں کا نظارہ یاد آتا ہے۔ احاطہ مسجد کے باہر ایک بازار
بن گیا ہے۔ جہاں دورویہ کچھ عارضی کچھ مستقل دوکانیں لگی ہیں۔ نان بانی
نان اور کباب بیچ رہے ہیں۔ کہیں دودھ دہی کی دوکان ہے۔ کہیں سستی
مٹھائی کی۔ کہیں میوہ فروش جس پر کہیں گل فروش۔ زائر آتے جاتے ان
دوکانوں میں بیٹھ کر آرام کرتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ جمعہ کے دن بیٹروں

اور دُنوں کے گٹے بھی اس جگہ کے قریب کھڑے رہتے ہیں۔ کیونکہ اکثر لوگ اُس دن کسی نہ کسی آرزو کے پورا ہونے کی منت بڑھاتے اور قربانی کرتے ہیں۔ گوشت وہیں غریب اور فقرا میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ سالوں کی بھی ویسی ہی کثرت رہتی ہے جیسے ہندوستانی خائفوں پر۔ اور چونکہ ہر شخص یہاں خیرات اور عبادت کے لئے تیار ہو کر آتا ہے۔ اس لئے سائل عموماً یہاں سے محروم نہیں پھرتے۔

یہیں اس مزار مبارک اور اس جامع شریف کی زیارت کو ایک جمعہ کے دن گیا۔ اس مزار پر کئی تربت دار متعین ہیں۔ اور اُن میں سے ہر ایک اپنے اپنے دن باری کی نماز باری حاضر رہتا ہے اور اُس دن کی فتوحات اس کے حصے میں آتی ہیں جس دن غیر مسلم وہاں گئے اُس دن حافظ علی حلمی آفندی کی نوبت تھی۔ وہ نہایت التفات سے پیش آئے۔ ایک کنواں مزار کے ایک گوشے میں ہے۔ جس کا پانی عورتیں آنکھوں کو لگاتی ہیں اور لوگ تبرکاً لیجاتے ہیں۔ حافظ صاحب موصوف نے اپنے ہاتھ سے وہ پانی ہمیں پلایا۔ قرآن مجید کے قلمی نسخے جو وہاں رکھے ہیں دکھائے۔ اور ہماری التماس عا پر ہاتھ اٹھا کر دیر تک دعا کی۔ اس کے بعد جامع مسجد میں جانے دیکھا کہ اس مسجد میں شکر کی عورتیں نماز کے لئے بکثرت آتی ہیں اور بعد نماز مسجد کے ایک گوشے میں جو لوہے کی جالی کے ذریعہ باقی حصے سے علیحدہ کیا ہوا تھا۔ عورتوں کی ایک جماعت وعظ سننے کے لئے بیٹھ گئی اور وہاں ایک مولوی صاحب دیر تک وعظ کہتے رہے۔

استان بول میں جا بجا آبادی کے ہر حصے میں نئے زمانے کے رسم و رواج کی قبولیت کے آثار نظر آتے ہیں۔ اور یورپ کا رنگ کم و بیش ہر طبقے پر اپنا اثر دکھارہا ہے۔

مگر حصّہ اس اثر اور اُن نشانات سے خالی ہے۔ یورپ کے اس کو نے میں ایشیا کی قدامت اپنا لازوال ہونا ثابت کر رہی ہے۔ یورپ کے سیاح جب یہاں کے ہجوم دیکھتے ہیں۔ یا اس علاقہ کے ارد گرد کے شہر محوشاں کی سیر کرتے ہیں تو وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

پیر لوئی اپنے جدید ناول میں جا بجا قبرستان ایوب کا تذکرہ کرنے سے اس اثر کا اظہار کرتا ہے۔ اُس کی خیالی عورتوں میں سے ایک اپنے فرانسیسی دوست انڈرے کے جس سے وہ قبرستان میں گفتگو کر رہی ہے۔ کہتی ہے۔ ”میں نے جبکہ اس لئے منتخب کی کہ تجھے بھی اس سے اُنس ہے اور میں بھی۔ کیونکہ جب ہمارا وقت آئے گا تو ہماری یہی آرزو ہوگی کہ ہم اپنی آخری نیند کے لئے یہیں کی خاک کو اپنا بستر بنائیں۔ اس فقرہ کے سننے سے انڈرے کے دل میں جو خیالات گزرتے ہیں ان کی تصویر پیر لوئی یوں کھینچتا ہے:-

یہ فقرہ سن کر انڈرے حیرت سے اُن تینوں پر وہ دار عورتوں کو دیکھنے لگا اور دل میں کہنے لگا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس جوانی میں بیسویں صدی کے ان تازہ نوہالوں کو جن کے خیالات اکثر باتوں میں انتہا درجے کی جدت لئے ہوئے ہیں

لے فرانک کا ایک مشہور ناولسٹ جی۔ اس کے تازہ ترین ناول ”دیناں شانتے“ میں استانبول کے دلچپ نقشے ہیں۔ ناول کا منشا یہ ہے کہ فرانسیسی مغیرہ کی کتابیں پڑھنے سے جو آزاد خیالی عورتوں میں پیدا ہوئی جو۔ اس کا اظہار کیا جائے۔ اس کا فرضی ہیرو ایک فرانسیسی مصنف جی۔ اوجہ زینب اور ملک تین فرانسیسی پڑھی ہوئی لڑکیاں چوری چوری اس سے ملتی اور خط و کتابت کرتی اور اُسے کہتی ہیں کہ اپنے قلم کے ذریعہ سے انکی اور انکی بہنوں کی حمایت کرے۔

جن کی گفتگو پیرس کی نوجوان لڑکیوں کی گفتگو ہے۔ آخر اس متبرک جنگل میں بیٹھنے کی آمد وہ ہے۔ جہاں ساہاے ہجری کی گذشتہ صدیوں کے پُرانے یادگار بڑے بڑے علمے باندھے لیٹے ہوئے ہیں؛ کیا سچ مچ ایک دن ہمیں کہیں کسی سنگ مرمر کے مزار میں یہ اپنا دہانی قبر پوش اوڑھے لیٹی ہونگی اور کبھی کبھی اُن کے عزیز شام کو اُکرائنے سر ہانے دیا جلا یا کریں گے؟ یاے! یہ اسلام ہمارے لئے ہمیشہ ایک لازماً سب سے ہیگا اور اسی کے اثر سے یہ عورتیں اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک لیٹے ہوئے ہیں۔“

کشتی کے راستے کے سوا ایک اور راستہ جامع ایوب کو جانے کا ہے۔ جو پانی کے راستے سے زیادہ دلچسپ ہے۔ کشتی پر جانے سے اتنا لطف ضرور ہے کہ سمندر کے اُس بازو کا۔ خوشکی کی طرف پھیل کر استانبول کی رونق کا باعث ہوا ہے اور شاخ زرین کہلایا ہے۔ خیر تمام نظر آ جاتا ہے۔ لیکن خوشکی کے راستے جائیں تو یدِی قلہ اور شہر کی قدیم دیواریں اور کئی عمارتوں نے دروازے بھی دیکھے جاسکتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ راستہ قابلِ ترجیح ہے۔ یدِی قلہ خود تاریخی چیز ہے اور دیکھنے کے قابل۔ گو اب محض کھنڈر ہے۔ یہ بھی جامع ایوب کی طرح سلطان محمد فتح کی نشانی ہے۔ اور پھر اس سے آگے دیوارِ شہر کے ساتھ ساتھ چلیں۔ تو دائیں ہاتھ دیوار چلی جاتی ہے اور بائیں طرف قبرستان کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو برابر جامع ایوب تک چلا گیا ہے۔

اب جہاں یدِی قلہ ہے وہاں مسلمانوں کے عہد سے پہلے بھی ایک قلعہ خاندان مقلی جس کے پانچ بُرج تھے۔ فتح کے وقت وہ رستے کے قریب تھی۔ سلطان فاتح نے

اندر نوہاں ایک مضبوط عمارت بنائی جس کے سات بُرج تھے۔ اس عمارت میں خزانہ سرکاری رہا کرتا تھا اور پھر ایک مدت تک اس سے شاہی زندان خانہ کا کام لیا گیا۔ لندن میں جو کام لندن کے مشہور ٹاور اور پیرس میں وہاں کے ہائل سے لیا گیا۔ وہ کام قسطنطنیہ میں بدی قلعہ یعنی ہفت بُرج کے سپرد تھا۔ کئی مشتبہ لوہاں مقتدر رہے اور مارے گئے۔ ایک سلطان وہاں مقتول ہوا۔ مالک غیر کے لوگ وہاں مجبوس ہوتے تھے۔ ایک عرصہ تک یہ دستور رہا کہ جب ترکوں میں کسی دوسری سلطنت میں جنگ ہو جاتی تھی تو اُس دولت کا سفیر بدی قلعہ میں قید کر دیا جاتا تھا۔ آخری سفیر جو وہاں قید ہوا فرانسیسی سفیر تھا۔ لیکن پھر جب معاہدہ کی رو سے سفر ہر حالت میں ایسے سلوک سے بری قرار دیئے گئے تو یہاں سے بھی یہ دستور اٹھ گیا۔ اس عمارت کے تین بُرج گر گئے ہیں اور اب صرف چار باقی ہیں۔ مگر پرانا نام چلا جاتا ہے۔

ہفت بُرج پر گویا قدیم شہر کی حد ختم ہوتی ہے۔ شہر سے باہر کل کر فرار توپ کی طرف چلیں تو پُرانے دروازے بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ سب سے پہلے توپ قیو یعنی توپ والا دروازہ ہے۔ مسلمانوں سے قبل یہ رومانس دروازہ تھا۔ کیونکہ اس کے قریب سینت رومانس کا گرجا واقع تھا۔ اسی دروازہ پر محمد فتح کی بڑی توپ نے منواز گولہ باری کی تھی۔ توپ قیو کے بعد آؤرنہ قیو یعنی آؤرنہ دروازہ آتا ہے۔ توپ قیو سے لیکر آؤرنہ قیو تک کی دیوار نہایت شکستہ ہے۔ آؤرنہ شہر زلزلے نے اس مضبوط دیوار تک کی بنیاد ہلادی۔ اسی دروازہ کے اندر مہرماہ کی مسجد ہے جس کے زلزلے سے تباہ ہو جانے کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

لیکن ایک اور مسجد قابل دید اس دروازہ کے اندر ہے۔ جسے ہم دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا نام قعرہ مسجد یعنی نشیب الی مسجد ہے۔ یہ ہے تو چھوٹی سی۔ مگر کوئی یورپین سیاح ایسا نہ ہوگا جو اسے دیکھے بغیر جاتا ہو۔ کیونکہ پہلے یہاں گر جاتا تھا اور گر بے کے زمانے کی تصویریں سقف اور درو دیوار پر اب تک موجود ہیں۔ تصویریں موز ایک کے کام کا عمدہ نمونہ ہیں۔ اندرونی حصے کی تصویریں جہاں نماز پڑھی جاتی ہے لکڑی کے تختوں سے ڈھانپ دی گئی ہیں لیکن باہر کے حصے میں جو اب ڈیوڑھی کے طور پر مستعمل ہے تصویریں کھلی رہتی ہیں حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی تصویروں کے علاوہ کئی تصویریں انجیل کے عہد عتیق یعنی توریت اور دیگر صحف کے قصص سے لی گئی ہیں۔

غرض اس نواح میں مدی قلعہ سے لیکر جامع ایوب تک شہر کے درو دیوار تاریخی حکایات کا ذخیرہ ہیں۔ اور فضیل شہر کے باہر ایک ستانا اور ہوکا عالم ہے۔ وہاں وہ لوگ لیٹے ہیں۔ جو ان تاریخی انقلابات کے معرکوں میں شریک تھے۔ اب وہ مصائب دنیا سے فارغ ہو کر چین کی بنید سورہے ہیں۔ اور بلند قامت سروانگی پاسبانی کر رہے ہیں۔ ہر راگز پر فرض ہے کہ مسلمان ہے تو بہ نظر ثواب یہاں فاتحہ پڑھتا جائے اور کسی اور ملت کا ہے تو ادب سے چپ چاپ گزر جائے کیونکہ سب کو ایک دن خاک میں ملنا ہے اور اس لئے خفتگان خاک جو ہم سے پہلے منزل پہنچ گئے ہیں۔ ادب کے مستحق ہیں۔ شاید یہاں کے قبرستانوں میں جو آرد درختوں کی جگہ سرو کے درخت لگانے کا رواج ہے۔ اس میں بھی یہی مصلحت ہو کہ سرو نہ فرقت خاموش ادب سے کھڑا ہے اور جب ہوا زور سے چلے تو بھی اسکی پتیوں میں کھڑکھڑاہٹ

نہیں ہوتی۔ شہر خوشاں کی خموشی استانبول کے ان بڑے قبرستانوں میں اپنا درجہ کیل
 چل کئے ہوئے ہے کہیں کہیں کسی خوش نصیب کی قبر پر پس ماندگان کی محبت نے
 پھول اُگا دیئے ہیں اور عالم خموشی میں اُس کی قبر زبانِ حال سے کہہ رہی ہے
 اے صبا بر برگہائے غنچہ پا آہستہ نہ
 پس بانند گلہا صائباً خواہند است



کاغذ خانہ

غم و شادی دُنیا میں تو ام ہیں۔ قریہ ایوب سے اگر زائرِ چشمِ عبرت پر آب لیکر
 نکلا ہو تو کچھ دُور جا کر اس کے دل پہلانے کا سامان موجود ہے۔ ایوب سے
 تھوڑے فاصلہ پر ایک سیرگاہ ہے۔ جہاں جمعہ کے دن عثمانی زن و مرد تفریح کے
 لئے جاتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی ندی جسے ترکی میں کاغذ خانہ صو کہتے ہیں۔
 اسی وادی میں بہتی ہے۔ اور اسے شاداب کرتی ہے۔ درختوں کے جھنڈ یہاں
 نظر کو لہاتے ہیں اور چاروں طرف لہلہاتے ہوئے کھیت آنکھوں کو طراوت
 بخشتے ہیں۔ ہوا صاف اور فرحت بخش ہے۔ اس ندی کے کنارے ایک محل شاہی
 بند ہے۔ جسے کاغذ خانہ کو شک کہتے ہیں۔ موجودہ فرماں والے روم اپنی زمانہ شہزادگی
 میں یہاں رہتے تھے۔ اُنکی عزلت پسند طبیعت نے اس گوشہ تنہائی کو اپنے لئے
 انتخاب کر لیا تھا۔ جہاں وہ شہر کے شور و غل سے محفوظ خوبصورت قدرتی مناظر
 کے درمیان زندگی بسر کرتے تھے۔ محل سے ملا ہوا ایک بڑا جنگل اُن کے شکار
 کے لئے تھا۔ اب بھی گرا اور بہار میں شاہی خاندان کے لوگ یہاں سیر و شکار کے
 لئے آتے ہیں۔ اس محل کے مقابل ندی کی دوسری جانب کھلا میدان ہے اس
 میدان میں موسم بہار میں تفریح کے شائقین کے ٹھکٹے ہوتے ہیں۔ اس کا مزا
 دیکھنے کے لئے مئی یا جون کے مہینے میں وہاں ہونا چاہئے۔ ہم نے اسے
 اگست میں دیکھا۔ اس وقت ندی سُوکھ چلی تھی۔ کیونکہ اس کا پانی تین چار مہینے

ہی رہتا ہے۔ چند کشتیاں پانی سے نکال کر کنارے پر رکھی ہوئی تھیں اور سامنے کے میدان میں کہیں کہیں کچھ تماشائی نظر آتے تھے۔ لیکن سنا ہی کہ بہار میں اتنا بڑا ہجوم کسی کے ہوتا ہے۔ کہ جو دیر سے آئے اسے بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ شوقین لوگ کشتیوں کے لے میں آتے ہیں۔ مقتدر اصحاب کے بیٹھے باہر میدان میں لگے ہوتے ہیں۔ خور و شراب کا ہمارا گاہ۔ ہر خوش کامان ہوتا ہوتا ہے۔ عورتیں کثرت آتی ہیں۔ دن بھر وہاں جاؤ تو بہت کچھ دیکھو اور ہے۔ شام کو میلہ ختم ہوتا ہے۔ کچھ پانی کے راستے کشتیوں پر کچھ گاڑیوں میں کچھ پیدل گھر کو واپس جاتی ہیں۔

یورپ کے لوگ اس سیرگاہ کے بڑے دلدادہ ہیں۔ کیونکہ اس مقام کی خوبصورتی کے علاوہ ترکوں کی معاشرت کا ایک ایسا پہلو انہیں یہاں نظر آتا ہے۔ جو وہ اور کسی طرح دیکھ نہیں سکتے۔ اس ندی کو انگریزی اور فرانسیسی میں شیرین پانی کہتے ہیں۔ یورپ کہتے ہیں۔ کیونکہ ایشیائی ساحل پر ایک آوندی گلوک صومالی کہتے ہیں۔ اور اس سے یورپ والے آب شیرین ایشیا پکارتے ہیں۔ وہ بھی نہایت خوش مقام ہے۔ اناطولی حصار یعنی سلطان محمد فاتح کے اس قلعہ کے قریب واقع ہے جو اُس نے ایشیائی ساحل پر بنایا تھا جس کے مقابل روم اپنی حصار یورپ کے ساحل پر بنا ہوا ہے۔

اس مقام کی سیر کے لئے گاڑی پر جانا ہو تو پیر اسے گاڑی ملتی ہو۔ وادی تک پہنچنے کے لئے جو سڑک ہے وہ اب تک بہت خستہ حالت میں تھی۔ لیکن حال میں اسے اور کچھ جو نئے شہر امین مقرر ہوئے ہیں انہوں نے سڑک کے درست کرانے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس لئے انگریزی عہدہ دار روم کے مقابل یہ عہدہ امین شہر کا ہے ۱۲

توجہ کی ہے۔ اور ہمارے سامنے نصف کے قریب سڑک بن چکی تھی۔ جب یہ سڑک
 تکلی ہو گئی تو سواری کے لئے قسطنطنیہ کے قریب سب سے اچھی سڑک ہو گئی۔
 اب بھی ہوا خوری کے لئے بہت لوگ اکثر اس طرف کل جاتے ہیں۔ پھر شام
 میں اگر وہاں مجمع ہو جایا کریگا۔ صرف رمضان شریف کے مہینے میں یہ مقام بالکل
 بھر جاتا ہے۔ کیونکہ روزہ دار شام کو افطار کی فکر میں ہوتے ہیں اور ویسے بھی اس
 مہینے میں دن کا وقت تفریح کی بجائے عبادت یا قرآن خوانی یا دیگر مذہبی شغل
 میں گزارتے ہیں۔

اگر کسی کے پاس وقت وافر ہو تو وادی آب شیریں کی سیر کے علاوہ اس
 فوج کے اور قابل سیر حصے جو اسی طرف مگر ذرا فاصلے پر ہیں۔ دیکھ سکتا ہے۔
 کاغذ خانہ سے باغچہ کوئی اور بیوک درہ کو رستہ گیا ہے اور یہ دونوں مقامات نہایت
 سیر حاصل ہیں۔ بعض سیاح قریہ بلغراد کے جنگل تک جاتے ہیں۔ لیکن وہاں کے لئے
 سارا دن صرف کرنا پڑتا ہے اور ہم وہاں نہیں جاسکے۔ باغچہ کوئی کے قریب سلطان محمود
 اول کا مشہور ایکوئی ڈکٹ یعنی راہ آب ہی۔ جو ۱۳۷۷ء میں پیرا۔ غلط اور شکستاش
 میں پانی بہم پہنچانے کے لئے بنایا گیا تھا۔ سر زمین میں نہہ کا پانی دو بڑے حوضوں
 میں جو باغچہ کوئی سے میل بھر کے قریب بلندی پر واقع ہیں جمع کیا جاتا ہے۔ اور
 وادی بیوک درہ سے ہوتے ہوئے اس کوئی ڈکٹ کے ذریعے جو طول میں پانچویں
 ساٹھ گز ہے اور اکیس محراب رکھتا ہے۔ شہر میں تقسیم ہوتا ہے۔ جہاں پانی بٹنا
 شروع ہوتا ہے۔ اس مقام کا نام تقسیم پڑ گیا ہے۔

بلغراد کا جنگل اپنی وسعت اور پانی کے حوضوں کی کثرت کی وجہ سے مشہور ہے۔

آس پاس کے دیہات میں اور شہر کے بعض حصوں میں پانی وہیں سے جاتا ہے۔
 رستا بنول کے عیسائی سیر و تفریح کے لئے اس گاؤں اور اس جھگل کے گھنے
 سایے کو ترجیح دیتے ہیں اور گرمی میں گروہ درگروہ یہاں آتے ہیں اور اس
 جگہ کا نام انہوں نے "نفع غم" رکھا ہے۔ ان کے لئے "بلغراد" وہی دیکھی جگہ
 ہے جو ترکوں کے لئے کاغذ خانہ۔ معلوم نہیں شروع میں اس ندی کے
 پاس کے گاؤں کو کاغذ خانہ کس عہد سے کہا گیا۔ لیکن اب کاغذ خانہ۔
 ہنسی کھیل کے مقام کا مترادف ہو گیا ہے۔ ایک زمانہ میں بادشاہ کے حضور
 میں ایک مشہور نعتیہ لطائف و ظرائف کے لئے بہتا تھا جسے کاغذ خانہ
 امامی کہتے تھے +



بونغاز و اطلر

استانبول میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بحر و بر کا جامع ہے۔ جب جنگل اوپر^ط کی سیر سے جی اُگتا جائے تو باسفور حاضر ہے۔ ترکی میں باسفور کو بونغاز کہتے ہیں۔ باسفور یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں "راہِ گاو"۔ قدیم یونانیوں میں ایک قصہ مشہور تھا کہ جو پیٹر دیونائے آئیو کو اپنے اعجاز سے بھڑا بنا دیا تھا اور وہ بھڑا اس پانی میں سے پیر کر گزرا۔ غالباً اسی تہوار سے یونانیوں نے اس کا نام باسفور رکھا۔ ترکی لفظ بونغاز اس سے بالکل جدا ہے۔ اس کے معنی ہیں دو پہاڑوں کے درمیان کا درہ۔ اور چونکہ ساحل ایشیا کی پہاڑیوں اور ساحل یورپ کی پہاڑیوں میں حدِ فصل ہے۔ اس لئے اُسے بونغاز کہتے ہیں۔ سب تیاغ متفق اللفظ ہو کر یہ کہتے ہیں کہ بونغاز سے زیادہ خوش منظر جگہ دُنیا بھر میں ملنی مشکل ہے۔ ہم نے کئی دفعہ بونغاز کی سیر کی۔ اُن میں دو موقعے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک دن جب سفیر انگلستان کی مُلاقات کے لئے ترائیہ گئے اور دوسرے جس دن جلوسِ ہائیوں کی رات بونغاز کے چراغان کی سیر کی۔

سرائے قدیم کے قریب شاخِ زرین اور بحیرہ مرمر سے اس مشہور آبائے کا مقام اتصال ہے۔ یہ آبائے طویل میں اُتیں میل ہے۔ اس کا عرض زیادہ سے زیادہ بیوک درہ کے قریب بقدر دو میل کے ہو اور کم سے کم روم ایللی حصار کے سامنے ہے۔ جہاں اس کی چوڑائی کوئی آٹھ سو گز ہوگی۔ بڑے پل سے مخصوص کمپنی کے جہاز

دن بھر بوزغاز کو آستہ جاتے رہتے ہیں۔ ان جہازوں کے دو درجے ہوتے ہیں۔ اور ان کا ایک حصہ عثمانی مستورات کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اُس کے سامنے پردہ پڑا رہتا ہے۔ عورتیں فراجہ پہنے اور چار شرف منہ پر ڈالے آتی ہیں اور پردے کی دوسری طرف جا بیٹھتی ہیں۔ چونکہ بوزغاز کے دونوں طرف کے خواجہ مکانات عموماً امرا کے ہیں۔ اس لئے ان جہازوں پر عثمانیوں کے طبقہ اعلیٰ کی مستورات کثرت سوار ہوتی ہیں۔ راستے میں جا بجا جہازوں کے سٹیشن آتے ہیں کچھ لوگ اتر جاتے ہیں۔ کئی نئی سواریاں جو منتظر کھڑی ہوتی ہیں۔ سوار ہو جاتی ہیں۔ بوزغاز کے دونوں کناروں پر کل اٹھائیس سٹیشن ہیں۔ پندرہ ساحل یورپ پر اور تیرہ ساحل ایشیا پر۔ سارے جہاز ہر سٹیشن پر ٹھہرنے والے نہیں ہوتے بعض تیز و صرف ضروری مقامات پر ٹھہرتے ہیں اور بعض ہر جگہ رکتے ہوئے جاتے ہیں۔

تراپہ تک جاتے ہوئے ساحل یورپ پر کسی ضروری مقامات نظر آتے ہیں۔ پہلے نکلتے ہی توپ خانہ کی عالیشان عمارت ہے۔ جس کے سامنے ملی ہوئی دو شاخ نظر آتی ہیں۔ جامع سلطان محمود اور جامع قلیچ علی۔ توپخانہ کے احاطہ میں اس کا ایک بڑا کارخانہ ہے اور اس کے پیچھے بازار کی طرف وزیر توپ خانہ کا دفتر اور ایک جنگی مدرسہ ہے۔ کچھ آگے بڑھ کر گاس کا کارخانہ ہے اور اس کے بعد قصر طولہ باغیچہ جس میں تخت والا کمرہ نہایت شاندار بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بشکطاش سٹیشن ہے۔ یہ محلہ خیر الدین پاشا مرحوم کے مزار کے سبب مشہور ہے۔

یہ ریشمی نقاب جو عموماً سیاہ ہوتا ہے۔ گونجی گونجی کسی اور رنگ کا بھی ہوتا ہے ۱۱

اس کے لفظی معنی ہیں۔ گہوارہ والی پہاڑی۔ اور یہ نام اس لئے دیا گیا کہ خیر الدین پاشا کے مزار کی صورت مہد کی سی ہے۔ خیر الدین وہی نامور امیر البحر ہے جس نے سلطان سلیمان کے عہد میں یورپ کی اُس زمانے کی مجموعی بحری افواج کو شکست فاش دی تھی جس نے اجڑا اور ٹیونس کو فتح کیا تھا اور جس کے نام سے اُس زمانے میں یورپ کے لوگ کا پنتے تھے اور اُسے خوفناک بار بڑسا کہتے تھے۔

بشکطاش سے آگے بڑھیں تو قصر چراغاں کی خوبصورت عمارت ہی سلطان عبدالعزیز مرحوم نے محل بنوایا تھا اور سلطان مراد یہیں نظر بند رہے۔ قصر چراغاں کے عقب میں ہی قصر لیدر بُندی پر واقع ہے اور اس کی عمارت کے کچھ حصے بھی جہاز پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے آگے سٹیشن آرتھ کوئی ہے۔ یہاں اچھے اچھے باغات ہیں۔ اورستانبول میں ان باغوں کے میوے اور پھول بکثرت پہنچتے ہیں۔ یہاں کنار آب چرخ و دار چوبی عمارتوں کی ایک قطار چلی گئی ہے۔ یہ مسلمانوں کے موسم گرما کے رہنے کے گھر ہیں۔ اس قسم کے گھروں کو ترکی میں یالی کہتے ہیں۔ اور نو کوئی اور بیک کے سٹیشن اس کے بعد آتے ہیں۔ ہربانی زخدیوہ اور ان کی والدہ اور اقارب کے محلات ان سٹیشنوں کے قریب ہیں اور ان کے گرد کے باغات اور پانی سے ملی ہوئی سفید سنگ مرمر کی سیڑھیاں ساحل کے اس حصے کی زینت کا باعث ہیں۔ بیک کے بعد روم ایللی حصہ سٹیشن آتا ہے۔ اس مقام کی تبدیلی اہمیت کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس کی ساخت میں ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے بیچ پہاڑی شیبہ فراز پر اس ترکیب سے بنائے گئے ہیں۔ کہ دیواروں کے ساتھ ملکر ان سے لفظ حتمل پیدا ہوتا ہے اور دور سے دیکھنے والے کو

یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مبارک نام دیوقامت حروفِ حجر سے لکھ کر اعلان کے طور پر
ہوا میں شائع کر دیا گیا ہے۔ یہ سلطان محمد فاتح کی ایجاد پسند طبیعت کی ایک ادا
تھی۔ قلعہ کے اوپر کچھ فاصلے پر ایک نئی عمارت انگریزی قسم کی نظر آتی ہے۔ جو
گرد و پیش کے منظر سے کچھ مناسبت نہیں رکھتی۔ یہ عیسائیوں کا ایک بڑا کالج
ہے۔ جسے مسٹر رابرٹ نام ایک فیاض امریکن نے قائم کیا ہے۔ عین پہاڑی
کی چوٹی پر کالج کی عمارت سے بھی اوپر حاجی بکتاش ولی کا تکیہ ہے۔ جہاں اس
مشہور فرقے کے درویش رہتے ہیں۔

روم اہلی حصار سے گزریں تو یہی کوئی سٹیشن ہے۔ یہاں یونان اور آسٹریا
کے سفر کے تابستانی مکانات ہیں اور آبادی زیادہ تر ارمینی اور یونانی لوگوں
کی ہے۔ اس کے بعد تراپیہ ہے۔ برطانیہ۔ جرمنی۔ فرانس اور اطالیہ کے سفر کرنے
اس مقام کو گرما کی اقامت کے لئے انتخاب کیا ہے۔ اور شاید یہ کہنا مناسب نہ ہو
نہیں کہ انہوں نے یہاں کے متعدد و خوبصورت مقامات میں سے بہترین مقام
چھانٹ لیا ہے۔ لب دریا ان کے بلند مکانات آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ بالکل
مکانوں کے گرد نہایت عمدہ باغات ہیں۔ اور یہ لوگ بڑی شان سے رہتے ہیں۔
ہیں۔ سرنکولس اوکانر سفیرِ برطانیہ کو ہم نے نہایت خوش خلق پایا۔ اور ان کی
جہان نوازی سے ہم متمتع ہوئے۔ کھانے پر ہمیں لیڈی اوکانر سے بھی ملاقات
کا موقع ملا۔ وہ اخلاق میں اپنے شوہر سے بھی بڑھی ہوئی ہیں۔ باتوں باتوں میں
معلوم ہوا کہ انہیں شطرنج کا بہت شوق ہے۔ شیخ مشیر حسین جو میرے رفیق تھے۔
شطرنج کے بہت شائق ہیں اور اس میں عمدہ مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے

کہا کہ کھانے کے بعد ایک بازی رہے۔ لیڈی صاحبہ نے خوشی سے منظور کیا۔ کھانے کے بعد ہم سب ایسے کمرے میں بیٹھے جہاں درتپے سے سمندر کا پانی لہریا مارنا نظر آتا تھا۔ لیڈی اوکانزا اور شیخ مشیر حسین نے شطرنج شروع کی اور میں اور سر نکولس لہروں کا تماشہ دیکھنے لگے۔ میں نے فرصت غنیمت سمجھ کر پوٹیکل شطرنج کے اُس مشاق کھیلنے والے کو سیاسیات کی گفتگو کی طرف مائل کیا۔ اور چاہا کہ سلطان المعظم سے متعلق کچھ اس کے خیالات سنوں۔ وقت اوجالات کی تاثیر سے وہ بھی کسی قدر کھٹے۔ میں نے اُن سے کئی سوال کئے۔ وہ سوال اور اُنکے جوابات کا خلاصہ یہاں لکھ دیتا ہوں :-

سوال۔ انگلستان کے اخبارات بعض دفعہ لکھتے ہیں۔ کہ نصر شاہی میر ایک زبردست فریق ہے۔ اور بادشاہ اُن کے ہاتھ میں ہے۔ وزیر ایک مشورہ دیتے ہیں۔ اور وہ دوسرا۔ اور عموماً وہی رائے غالب ہوتی ہے جو اس فریق کی ہے۔ جواب۔ جو لوگ اس طرح لکھتے ہیں۔ وہ یہاں کے حالات سے بے خبر ہیں۔ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ سب کاروبار سلطان اپنے کف دست میں لئے ہوئے ہے۔ نظام سلطنت کو اگر ایک بنا ہوا کپڑا فرض کریں تو اس کے سارے تار سلطان کے ہاتھ میں ہیں۔ میرے نزدیک یہاں کی حکومت اس وقت شفقی حکومت کی ایسی مٹکل نظیر ہے۔ کہ اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نہیں ملتی۔ بڑے بڑے پاشا اور صاحب اور وزیر سب اپنی اپنی جگہ کانپ رہے ہیں اور کسی کو مجال نہیں کہ اپنے ارادہ سے ایک ذرا سا کام بھی کر سکے۔

سؤال۔ سلطان المعظم کو یورپ کے اخبار عموماً نہایت بُزدل اور ڈرپوک سمجھے جاتے ہیں۔ کیا ان ہوتا ہے آپ کا مشاہدہ اس خیال کی تائید کرتا ہے؟

جواب۔ نہیں۔ میں نے بار بار دیکھا ہے کہ اُن کی طبیعت میں جرات اور بے خجی طرح استقلال غیر معمولی ہوتا ہے۔ اور جب کسی خطرہ سے اُن کا سامنا ہوا ہے تو میں نے بعض لوگوں نے اُس کی طرف سے کامل بے پروائی دکھائی ہے اور بالکل مرغوب ہو کر رہے ہیں۔ ہر واقعی خطر کے سامنے یہ شخص شیر کی طرح کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن اُن کے اس میں شک نہیں کہ اُن خطرات سے جو سامنے نہیں۔ مگر جن کا امکان یہاں ہے کہ ہر وقت موجود ہے (مثلاً سازش۔ یا بغاوت) بچنے کے لئے احتیاطی تدبیریں اُن کے لئے کافی ہیں۔ انہوں نے پیش کی ہیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اول بڑے زلزلے کے موقع پر۔ جب اُن کے چند درباری جو اُن کے روبرو تھے۔ گھبرا کر بھاگنے لگے تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اُنکو روک دیا۔ خود اپنی جگہ سے نہیں اُٹھے اور اُن کو سمجھاتے رہے کہ گھبرانا نہیں چاہیے۔ اور بھاگنا مفید نہیں۔ دوم حال میں جو سلاطین کے دن جامع حمیدیہ کے باہر گولا پھینکا گیا۔ اور ہر شخص کا خیال تھا کہ شاید کوئی اور گولا ابھی چھپا ہو جو سلطان المعظم کے محل میں داخل ہوتے وقت پھوٹے۔ اس وقت انہوں نے نہایت حوصلہ سے کام لیا۔ اور خطرہ کی بالکل بے نیکی۔ معمول کے موافق گھوڑوں کی بائیں ہاتھ میں لیس اور گاڑی دوڑاتے ہوئے محل کو چلے گئے۔

سوال۔ میں نے یہاں کئی ایسی چیزیں دیکھی ہیں جن سے سلطان المعظم کا
رحل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ حالانکہ یورپ میں عموماً روایات اُن کے جبروت قدی
کی مشہور کیجاتی ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ طبعی طور پر ہر جیسی نہایت نرم دل
واقع ہوئے ہیں لیکن بعض بعض موقعوں پر جو اظہار سختی ہوا ہے وہ اُس طرز
حکومت کا لازمہ ہے جو یہاں قائم ہے۔ ورنہ اُن کا ذاتی میلان ہمیشہ مہربانی
اور سلوک کی طرف ہے۔

اس گفتگو کے بعد ہم سفارت خانہ انگریزی سے رخصت ہوئے اور پھر جہاز
میں سوار ہو کر ساحل کے نظارے دیکھتے شہر کو واپس آئے۔ مگر اس کے
بعد جب جلوس ہمایوں کی راست انہی مقامات کو پھر دیکھا تو جلوہ ہی اوجھلا
سلطان المعظم کی تخت نشینی کی سالگاہ ہر برس استانبول میں بڑی دھوم دھام سے
منائی جاتی ہے اور استانبول پر جو جو بن اُس تاج کورات کے وقت ہوتا ہے۔ اُس کا
بیان مشکل ہے۔ آنکھ ہی کچھ اس کیفیت کو سمجھ سکتی ہے۔ یوں تو تمام شہر میں چراغاں کی
رونق اور تماشائیوں کا ہجوم دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ مگر بوزغاز کی سجاوٹ آدمی کو
دنگ کر دیتی ہے۔ امراء دولت اور اقربائے شاہی کے مکانات ایک بقتہ نور نظر
آتے ہیں۔ ہزاروں چراغوں اور فدیوں کی روشنی کا عکس پانی پر پڑتا ہے اور عجیب
بہار دیتا ہے۔ مکانات کے پیچھے پہاڑیوں کی لمبندی پر آتش گلزار بنی ہوئی دکھائی
دیتی ہے۔ روشنی کرنے والے اپنی خوش مذاقی اور اپنی صنعت کے جوہر دکھاتے
ہیں اور ہر شخص آرائش میں حدت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ لوگ جہاز پر سوار ہو کر یہ تماشا

دیکھنے جاتے ہیں۔ ایک طرف آتشیں اور روشنی دیکھنے کو سب جھکتے ہیں تو کثرتِ نور سے جہاز اس کنارے کی طرف ڈھلوان بن جاتا ہے اور گمان ہوتا ہے کہ اب سب پانی میں جا رہینگے۔ اتنے میں دوسری طرف سے کوئی پکارتا ہے۔ آہ! ادھر دیکھو۔ دوسرے ساحل پر فلاں عمارت کیسی سچی ہے۔ سب ادھر ٹھکتا رہتے ہیں۔ رات کو دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جہازوں اور کشتیوں پر جو شہر ہوتی ہے۔ وہ اس کے علاوہ ہوتی ہی۔ کئی چھوٹی کشتیاں اس خوبی سے شہر کی جاتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بطِ آتشیں پانی میں تیر رہی ہے۔ جب چاروں طرف روشنی کا یہ عالم میلوں تک چلا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ منظر کیسا دلنوا ہوگا۔ حسن اتفاق دیکھتے کہ جلوس کے موقع پر شبِ ماہ ہمیں میسر آگئی۔ شبِ ماہ کو بوغاز کے پانی کا نظارہ نہایت ہی پیارا ہوتا ہے اور پانی میں بیشمار چراغوں کے عکس چاند کی دھیمی اور راحت افزا روشنی کے ساتھ مل کر عجب بہار دیتے تھے جیسے بوغاز میں شہر کے پل سے دس بارہ میل تک جہاز پر جانا بہت دلچسپ ہے۔ ویسے ہی دوسری طرف بحیرہ مرمر کی سیر اور چھوٹے چھوٹے جزائر کے اس مجموعہ کو دیکھنا جو اُس کے اندر دس بارہ میل جانے پر آتا ہے۔ نہایت پر لطف ہے۔ ترکی میں جزیرہ کو اٹھ کہتے ہیں۔ اور آرائشِ انجم ہے۔ پس اٹھ لڑے ہوئے۔ یہ جزائر تعداد میں آٹھ ہیں۔ لیکن آبا د صرف تین چار ہیں اور دو خصوصیت سے قابلِ دید ہیں یعنی پرنکیو اور ہلکی۔ پرنکیو کو ترک بیوک اٹھ یعنی بڑا جزیرہ کہتے ہیں کیونکہ یہ سب میں بڑا ہے۔ انگریزی میں ان سب کا مجموعی نام جزائرِ ہزار



کمیسیون سربازان

[illegible]

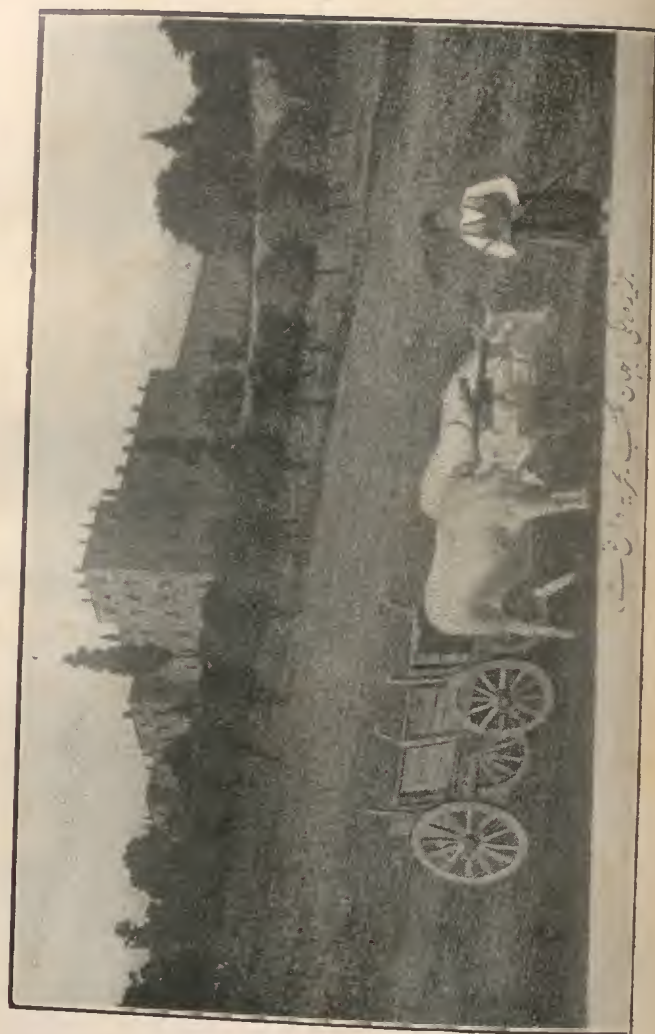
ہے۔ کہتے ہیں مسلمانوں کے عہد سے پہلے معتب شاہزادے یہاں مجبوس ہتے تھے۔ اس لئے یہ نام رکھا گیا۔ یہ یونانیوں کی بستیاں ہیں۔ یونانی عیسائیوں کے بادریوں کے رہنے کا مکان اور ان کے یتیم خانہ کی عمارت نہایت بلندی پر واقع ہے اور دُور سے نظر آنے لگتی ہے۔ پر نکپو میں ٹول بہت کثرت سے بنے ہیں اور جہازوں کے سٹیشن کے قریب سمندر کے کنارے کنارے چلے گئے ہیں سٹیشن کے پاس ہر وقت بہت رونق رہتی ہے۔ اور سمندر میں نہانے کی گاڑیاں بھی موجود ہیں۔

جزیرہ کا یہ حصہ یورپ کے ساحل بحر کی زندگی کا قائم مقام ہے اور استانبول سے نہ صرف عیسائی لوگ بلکہ متمول ترک بھی گرمی کے موسم میں وقتِ فرصت یہاں سیر و تفریح کے لئے آتے رہتے ہیں۔ سٹیشن سے اترتے ہی ہلکی ہلکی گاڑیاں سیر کرنے کو حاضر ہتی ہیں جو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں جزیرے کا چکر لگا سکتی ہیں۔ جزیرے کے گرد سڑک بہت عمدہ بنی ہے۔ جزیرے کے چاروں طرف پانی۔ وسط میں درختوں کے جھنڈ۔ کنارے کنارے سڑک۔ سڑک کے اوپر چھوٹے چھوٹے خوش وضع باغات اور باغوں کے پیچھے زنگارنگ کے جنگلے۔ یہ سب ملکر ایک ایسی تصویر بنتی ہے۔ کہ آنکھ اُس کے دیکھنے سے سیر نہیں ہو سکتی۔ یہاں گدھے کی سواری کا بھی دستور ہے۔ یورپین لوگ یہاں گدھے پر خوشی سے سوار ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایک تو انہیں یہ انوکھی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اور دُوسرے بعض چھوٹے راستوں میں جہاں گاڑی کی سڑک نہیں ہے۔ وہ اس سواری پر بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں۔ یورپ میں بھی بعض جگہ سمندر کے کنارے بچوں کے لئے گدھے کی سواری کا دستور ہے۔

لیکن یہاں معمر فرنگیوں اور بائگی بائگی فرنگیوں کو گدھے پر بیٹھے دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔

پرنکیو سے قریب ترین جزیرہ ملکی ہے۔ اور اس میں بحرِ کالج قابلِ دید ہے
 افسوس کہ ہم اسے اتر کر نہ دیکھ سکے۔ جہاز پر ہی سے اس کی عمارت کو دیکھا اور جہاز پر ہی
 مدرسے کے چند طلبہ سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ اس کے دیکھنے کے لئے ہمارا ارادہ
 پھر ایک روز آنے کا تھا۔ مگر وہ بہت سے ارادوں کی طرح ارادہ ہی رہا۔ مع
 بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے





بزرگمهری چون شب فریاد زار

بقدری سیر کرنے
 سے نفل کے واسطے
 کئے گئے ہر کیہ
 غنیمت پر پھیل
 کا کتاب ہے۔ م
 نفع و مصلحت ہے
 میں مین رہی۔
 ترک جانے کا
 بل کیسے جیتی ہے
 غلام کا گلوں ہے
 دیار ہے۔ کورخان
 ہے۔ کہ بہشت
 کے نجات پانچ
 سطور جو مری
 کا خانے کی
 سے اس نذر کو پکا

ہرکیہ

ہزار پر مختصر سی سیر کرنے کے لئے جیسے جزیرہ پر نکلو اور اس کے قریب کے دوسرے
جزائر اہل استانبول کے واسطے نہایت عمدہ موقعہ پر واقع ہوئے ہیں۔ ویسے ہی ایل
پیر کرنے کے لئے ہرکیہ ہے۔ کہ آدمی صبح کو استانبول سے چل کر اور دن کا ایک
معتدل حصہ نہایت دلچسپ طور پر اس خوبصورت مقام میں صرف کر کے شام کو
بسانی واپس آ سکتا ہے۔ مقام حیدر پاشا سے جو ایشیائی ساحل پر واقع ہے۔
ناطولی ریل شروع ہوتی ہے جو قونہ تک جاتی ہے اور اسی کے سلسلے میں آگے بغداد
تک ریل کی سڑک بن رہی ہے۔ شخص کو جو استانبول آتا ہو قدرتی طور سے اس ریل
پر تھوڑی دور تک جانے کا شوق ہوتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو کہ ایشیا میں ایک ایشیائی
دولت کی ریل کیسے چلتی ہے۔ اور اس مطلب کے لئے ہرکیہ موزوں ہے۔ ایک سبز
پہاڑ پر یہ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جو بسبب فہرکیہ مہایوں یعنی شاہی کارخانہ شال ابریشم
کے مشہور ہو گیا ہے۔ کارخانہ کے لئے جو موثر چٹنا گیا ہے۔ اُسے قدرت نے اس قدر
دل لگا کر سجایا ہے۔ کہ بہشت کا ایک چھوٹا سا قطعہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف سنہوش
پہاڑ اور ان کے شفاف پانی کے قدرتی چشمے۔ دوسری طرف سمندر۔ جسکی لہریں مہم
پہاڑوں کے قدم چوم رہی ہیں۔ دونوں کے درمیان دامن کوہ میں یہ خوبصورت
آبادی۔ اور کارخانے کی عمارتیں جن کے قریب مختلف چشموں کا پانی مل کر ایک نہر
بن گیا ہے۔ اس نہر کا پانی ایسا صاف ہو کہ اس کی تہ میں جتنے سنگریزے ہیں۔

ہر ایک کا رنگ متمیز نظر آتا ہے۔ فبریکہ کے قریب سایہ دار درختوں کے جھنڈ ہیں۔ جہاں اس کارخانے میں کام کرنے والی لڑکیاں تعطیل کے وقت غراؤں کی طرح دوڑتی پھرتی ہیں۔ کھیلتی ہیں۔ چھوٹے جھولتی ہیں۔ گاتی ہیں اور سہیلیوں کے لینے بھی اچھے ہیں۔ ساتھ دل بہلاتی ہیں۔ اُن کے چہروں سے سادگی اور معصومیت برستی ہے۔ کیونکہ اُن کے چال چلن کی یہاں ایسی نگہداشت کی جاتی ہے۔ جیسی ان کے والدین کرتے۔ یورپ میں باوجود سخت کوششوں کے ایسے کارخانوں میں سب سے بچے۔ بچے۔ بچے کرنے والی عورتوں کی زندگی نہایت مصیبت کی زندگی ہے۔ اُن کے زیرِ نگرانی ہیں اور جوش چہرے اور اُنکی کمزور اور خستہ حالت زبانِ حال سے ہر دیکھنے والے کو اپنی مثال آپ نہیں۔ یہاں اگر سنا ہے۔ لیکن یہاں اس پر نضا جگہ کے انتخاب۔ سکونت کے معقول انتظام اور کافی تعلیم ملتی اور شرح مزدوری کی خاص رعایت کے ذریعے غریب لاوارث لڑکیوں کی فکری اور جسمانی ترقی میں زندگی اس طرح بسر ہوتی ہے۔ کہ اُس پر بہت سی گھر بار والی لڑکیاں شکر مند ہوں۔ خواہ وہ کس قدر غریب ہوں۔

کارخانہ کا مختصر حال بیان کرنے سے پہلے ریل کا تھوڑا سا تذکرہ ضرور کرنا چاہیے۔ ریل کی معلوم ہوتا ہے۔ ہر یکہ جانے کے لئے ہمیں سویرے ہی اٹھنا پڑا۔ اور صبح کے سوا گھنٹے پہلے ساڑھے پانچ بجے گھر سے نکل کر چھ بجے حیدر پاشا کی طرف عبور کرنے کے لئے تھے۔ اس جہاز پر سوار ہوئے۔ جہاز کوئی بیس تھیں منٹ میں حیدر پاشا پہنچا دیتا ہے۔ یہاں کی شرائط یہ ہیں جہاں جرمن کمپنی نے جس کے پاس بغداد ریلوے کا ٹھیکہ ہے۔ بڑا عیشاں اور عزت دی ٹیشن بنایا ہے۔ لیکن ریل ہر یکہ تک جانے میں چار ساڑھے چار گھنٹے لیتی ہے۔ ہر ایکہ پر حالانکہ اگر معمولی رفتار سے چلے جس سے ہمارے ہاں مسافر گاڑیاں چلتی ہیں تو یہاں پیدا ہو

مٹنے سے زیادہ کا راستہ نہیں اور ہندوستان کی ڈاک گاڑی تو کوئی گھنٹے بھر
 میں اتنی مسافت طے کر لے۔ ریل کی گاڑیاں آرام دہ بنی ہیں۔ بالکل جرمنی کی گاڑیوں
 کا نمونہ ہیں۔ اور سٹیشن بھی اچھے ہیں۔ ریل کے اہلکاروں کا مسافروں سے
 سلوک بھی اچھا ہے۔ اور تیسرے درجے والے غریب مسافر کی وہ ذلت یہاں نہیں
 جو پورے ہندوستان کے مسافروں کے حصے میں آتی ہے۔ لیکن فٹار کی سستی
 بہت تکلیف دہ ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہی لوگ جو یورپ میں
 اتنے چست اور مستعد ہیں اور جو مشرق میں بھی جہاں کام بالکل اپنا ہونہایت
 چالاک دکھاتے ہیں۔ یہاں آکر اتنا سست ہونا کیونکر گوارا کرتے ہیں۔ یہ لوگ
 حکومت عثمانیہ کو اپنی معمولی حکمتوں سے خوش کر دیتے ہیں۔ سٹیشن پر کبھی تیار
 گنبد دار بنائی ہیں۔ جن میں مشرقی طرز تعمیر کی تقلید کی گئی ہے۔ ریل کے سب
 افسر خواہ وہ جرمن ہوں۔ خواہ کسی اور ملک کے رہنے والے۔ ترکی ٹوپی اوڑھتے
 ہیں۔ اور ان باتوں سے وہ حکام کا دل بٹھا لیتے ہیں۔ مگر ان کی گہری چال
 بے ڈھب ہے۔ اس ریل کی آمدنی کی ترقی کے لئے جو جو وسائل درکار ہیں اور جو
 جو ترغیبیں مسافروں کو کھینچنے کی ایسی اور کمپنیاں یورپ میں کرتی رہتی ہیں۔ ان سے
 وہ کام نہیں لیتے۔ اس لئے کہ اس سہل انگاری میں ان کا ہر دست کچھ نقصان
 نہیں۔ ٹھیکہ کی شرائط ایسی ہیں کہ حکومت کی طرف سے انہیں فی میل ایک مقررہ
 سالانہ آمد کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس طرح اگر آمدنی میں کمی رہے تو اسے
 پورا کرنے کا بار حکومت کے ذمے ہے اور اس ناقص شرط کے باعث کمی نقص
 اس ریل میں پیدا ہو گئے ہیں۔ گاڑیاں دن بھر میں بہت کم چلتی ہیں۔ حالانکہ

مسافروں کی تعداد خاصی ہے۔ عجیب بات ہے۔ کہ اس سڑک پر گاڑیاں رات کو بائیں نہیں چلتیں۔ دن میں جتنا فاصلہ طے ہو گیا ہو گیا۔ شام کے بعد حرکت موقوف رہتی۔ سٹیشن پر اتر پڑیں اور وہیں رات کاٹنے کا بندوبست کریں۔ باقی سفر کے لئے صبح پھر سوار ہوں۔ میرا قصد تھا کہ میں قونیہ تک اس سڑک پر ہوا۔ مگر اس سے کہ دو دن سے زیادہ کا سفر پڑتا تھا میں نے وہ ارادہ ترک کر دیا۔ رات کو حرکت نہ کرنے کا حکم دولت کی طرف سے ہوا اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ رات کا سفر محفوظ نہیں سمجھا جاتا۔ اگر کسی کے پاس وقت وافر ہو اور مجبوراً بار بار اُترنے چڑھنے کی تکلیف سے نہ گھبرائے تو راہ قابل سیر ضرور ہے۔ جتنا ٹکڑا ہم نے ہر یکہ جاتے تک دیکھا۔ اُس کے دونوں طرف کا منظر نہایت خوشنما تھا۔ دونوں طرف پہاڑ۔ درمیان میں سرسبز وادیاں باغات اور کھیت۔ پہلے چند سٹیشن قریب قریب پڑتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ جب گرمی میں اُمر اشہر سے نکل آتے ہیں تو عموماً ان مقامات میں ہنسنے ہیں۔ یہاں آبادی کی صورت جدید مذاق کے مطابق ہے۔ ہر شخص کا ایک خوبصورت بنگلہ ہے اور اس کے گرد راستہ باغ۔ اور یہ سلسلہ سیلوں تک چلا جاتا ہے۔ اس ریل سے سفر کرنے میں ایک مزایہ بھی ہے کہ بہت دُور تک بغداد کی پُرانی سڑک جس سے کاروان بغداد جایا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے ایک ہی وضع کے خوبصورت پُل پرانے زمانے کے بنے ہوئے جا بجا نظر آتے ہیں۔

صبح سے دوپہر تک راستے کی دلچسپیوں سے محفوظ ہوتے ہوئے ہم ہر یکہ پہنچے۔ اتفاق سے اُس دن عیسائیوں کا ایک تیمولہ تھا۔ جتنی عیسائی لڑکیاں

یہ فرض ہے کہ میں کام کرتی تھیں۔ وہ رخصت پر تھیں۔ اور درختوں کے نیچے بیٹھی آرام کر رہی تھیں۔ ان میں سے بعض کے لباس تو مغربی عیسائیوں کی طرح تھے۔ لیکن بعض بالکل ایشیائی لباس پہنے تھیں۔ چھینٹ کے شلوار کی طرز کے پاجامے اور رنگین کرتیاں پنجاب کے اضلاع سرحد کے رہنے والی عورتوں سے انہی کی وضع بہت ملتی تھی۔ صحت و مندرستی میں بھی انہی کی طرح تھیں۔ ان کی ملمان بہنیں کارخانے میں کام کر رہی تھیں۔ دونوں کے لباس میں زیادہ تمیز دوپٹے کی تھی۔ عیسائی لڑکیاں اکثر کھلے سر پھرتی تھیں۔ اور ملمان لڑکیاں سب دوپٹے اوڑھے ہوئے تھیں۔ مگر دوپٹے کچھ بہت بڑے نہ تھے۔ محض سر کو ڈھانکنا تھا۔ حاجی عاکف بے جو فہر یکہ کے مدیر عیسیٰ مہتمم ہیں۔ اس نے تشریف نہیں رکھتے تھے۔ ان کی جگہ ان کے معاون حاجی فیضی آفندی اور محمد علی آفندی کاتب محصولات نے ہمیں کارخانے کی سیر کرائی۔ یہ کارخانہ سلطان عبد المجید کے عہد سے قائم ہے۔ لیکن اس کی موجودہ رونق اور ترقی سلطان حال کے زمانے میں ہوئی ہے۔ پہلے سب کام ہاتھ سے ہوتا تھا اور اب تک ایک حصہ میں بعض نہایت نفیس نمونے ریشم کے ہاتھ سے ہی بنے جاتے ہیں لیکن سلطان عبد العزیز کے عہد میں چند کلیں بھی یورپ سے منگوائی گئیں اور رفتہ رفتہ کلوں کی توسیع ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اب زیادہ تر کام کل ہی سے ہوتا ہے اور ریشم اور قالین کے سوا اور بھی ہر قسم کا کپڑا یہاں بننے لگا ہے۔ ایک بڑا احاطہ بانات اور کشمیرے کی ساخت کے لئے ہے اور اس کے پاس ایک دوسری عمارت اس وقت بن رہی ہے جو ترکی ٹوپوں

کے کارخانے کے لئے ہے۔ ترکی ٹوپوں کا ایک بہت بڑا سرکاری کارخانہ پہلے بھی موجود ہے جو جامع ایوب کے قریب واقع ہے۔ لیکن چونکہ وہ بہت شوق سے کافی نہیں۔ اس لئے اس فبریکہ کے متعلق ایک حصہ ٹوپوں کے لئے بہت زیادہ اس کارخانہ تیار ہونا قرار پایا۔ یہ بہت مغنم ہے۔ کیونکہ ترکی ٹوپوں کی مانگ مالکہ کے کچھ لڑکیاں اسلامی میں روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور استانبول میں بہت سے ایسے ملازمین کارخانوں کی ضرورت ہے۔ تاکہ اسلامی مالک ان ٹوپوں کے لئے آسٹریا میں قائم کارخانوں کے محتاج نہ رہیں۔ اب تک تو خود استانبول میں باہر کی آئی ہوئی ٹوپیں اور لڑکیاں بہت بچتی ہیں۔ اہل یہ کہ جب تک خود عثمانیوں کی توجہ تجارت کی طرف مبذول نہیں۔ نہ ہوگی اور ان کے ذی استطاعت لوگ فرداً فرداً یا مشترکہ سرمایہ کے لئے لڑکیاں خریدیں۔ پر تجارتی کارخانے نہ کھولیں گے۔ اس وقت تک یہ کمی پوری نہ ہوگی جتنے آئی ہوئے کہانیاں ایسی چیزوں کا اہتمام کر سکتی ہو۔ اور اگر کرے بھی تو مشکل پڑا ہے۔ اور کہ شاہی کارخانوں کے شایانہ اخراجات ہوتے ہیں اور اس لئے مال داروں کے لئے کارخانوں کے تجارتی کارخانوں کی اشیاء سے قیمت میں مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لڑکیوں کے فبریکہ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس کا مال خوبی میں دنیا کے ہر حصے سے آتا ہے۔ مال سے لگا کھاتا ہے۔ مگر ازاں نہیں۔ کیونکہ ہو۔ اس کا ایک بڑا مقصد اس سے بچتیوں اور میواؤں کی پرورش ہے۔ اور یتیموں کی حفاظت کے لئے۔ یہاں کے عہدہ داروں کی ایک معقول جماعت یہاں ملازم ہے۔ یہاں کے عہدہ داروں کے لئے سب پیر مرد ہیں اور متدین۔ کیونکہ باوجود کارندوں کے ساتھ غیر معمولی ہر روزانہ کے اس کارخانے سے نفع ہوتا ہے۔ حکومت کو کچھ گردہ سے نہیں دیتا۔

اور اس کا مال دُور دُور تک جاتا ہے۔ خصوصاً امریکا والے یہاں کے قالین اور بعض
یشین کپڑے بہت شوق سے خریدتے ہیں۔

کوئی دو ہزار آدمی اس کارخانے میں کام کرتے ہیں۔ ان میں بارہ سو نو عمر
بیم ہیں۔ کچھ لڑکے کچھ لڑکیاں۔ مذہب و ملت کی کوئی قید نہیں۔ رعایا تے
سلطانی کے سب مذاہب اس میں داخل ہونے کا حق رکھتے ہیں اور داخل کئے
جاتے ہیں۔ یہاں قالین کا کام زیادہ تر عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے۔ قالینوں کے
صیغے میں جو عورتیں اور لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ اُن میں اس وقت اسی فیصد عسائی
اور سی فیصد عسلمان ہیں۔ لیکن کپڑا بننے کے صیغے میں مسلمان زیادہ ہیں۔ اور
عیسائی شاذ۔ لڑکیاں جو یہاں کام کرتی ہیں عموماً گرو نواح کے دیہات اور
پیابلی علاقے سے آئی ہوئی ہیں اور یہیں رہتی ہیں۔ اُن کے رہنے کے لئے
مذہب مکان بنے ہیں۔ اور اُن کی سکونت کا سارا خرچ کارخانے کے ذمے
ہے۔ لڑکوں کے لئے مکان علیحدہ بنا ہے جو لڑکیوں کے مکان سے فاصلے پر
ہے۔ اور لڑکیوں کے مکان میں کوئی مرد یا لڑکا نہیں جانے پاتا۔ یہ لڑکے لڑکیاں
جو مزدوری کرتے ہیں۔ وہ ان کے حساب میں جمع ہوتی رہتی ہے اور جب وہ جوان
ہو کر کارخانے سے نکلتے ہیں۔ یا اُن کی شادی ہوتی ہے تو جمع شدہ رقم انہیں
مل جاتی ہے۔ بارہ گھنٹے کا دن شمار ہوتا ہے۔ اور اس میں دوپہر کو ایک گھنٹہ کھانے
اور آرام کے لئے ملتا ہے۔ ریشم کے محکمے میں جو عورتیں کام کرتی ہیں اُنکی مزدوری
بالا وسط دو چکر روزانہ ہے۔ جو کاریگر مثال بنتے ہیں۔ اُنکی مزدوری چار چکر روز
سلہ چکر نغلی منی چو نغلی حصہ۔ ایک چاندی کا سکہ ہر چور چکر ایک اندھستان کے دس سکہ کے برابر ہوتا ہے

کے قریب ہو اور جو لڑکیاں قالین بنتی ہیں۔ انہیں ایک چکر روانہ ملتا ہے۔ اُن پر پڑاؤ ہوتا ہے۔ اُن میں اکثر بہت چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہیں۔ اور اُن کے لئے یہ بہت معقول مزدور تھی کہ ان کو کام لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لکھانے پڑبانے کا انتظام بھی یہاں کیا گیا ہے۔ یہاں کے رازدار اور کام سیکھنے کے زمانے میں وہ مدرسے بھی جاتے ہیں۔ ایک رُشدیہ مکتب پر پڑھاتے ہیں۔ لڑکوں کے لئے جہاں کوئی اڑبائی سولڑ کے پڑھتے ہیں اور ایک مکتب ایک فارسی تھے دوسرے مکان میں لڑکیوں کے لئے ہے۔ جہاں سو کے قریب لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ وہاں پر پڑاؤ ہے۔ ریل کے سٹیشن کے پاس ایک چھوٹی سی مگر خوبصورت عمارت ہے۔ وہاں پر پڑاؤ ہے۔ لڑکوں کا مدرسہ ہے۔ جب ہم گئے تو مدرسہ کا وقت نہ تھا۔ مگر وہاں کے معلم فارسی ہمیں مل گئے۔ اُن سے حالات سب معلوم ہوئے۔ نقشہ تقسیم اوقات انہوں نے ہمیں دکھایا۔ میں نے نمونہ ایک جماعت کی پڑبائی کے مضمون نقل کر لئے۔ معلوم ہو سکے کہ کیا کیا چیزیں وہاں پڑھاتے ہیں۔ اور تھیک کم درجے کی ہی نصف حسب ذیل ہیں :-

(جماعت سوم) جمعہ قرآن کریم۔ شنبہ کتابت۔ دوشنبہ منطق۔ سہ شنبہ فرانسیزہ۔ چہار شنبہ عقاید۔ پنج شنبہ موالید ثلاثہ۔ یہ ہوا ایک گھنٹے کا کام۔ دوسرے گھنٹے کا کام دنوں کی مندرجہ بالا ترقی کے ساتھ یہ ہے۔

نحو عربی۔ فارسی۔ موالید ثلاثہ۔ نحو عربی۔ تاریخ عثمانی۔ رسم۔

فارسی کے مدرسے راشد آفندی نے اتنا گئے گفتگو میں ایک فارسی رُباعی

پر جس کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ وطن کی قدر و قیمت میں آتی ہے۔ اور وہ رباعی یاد
 وطن سے بیتاب کرنے کو کافی تھی۔ وہ معمر آدمی تھے۔ علاقہ قفقاس میں ایک
 مقام ہے قتبہ۔ وہاں کے رہنے والے تھے۔ گزشتہ ہوئی آب و دانہ یہاں لے
 آیا۔ اور پھر گھر جانا نہیں ہو سکا۔ ہمارے ساتھ باب عالی کے ایک عہدہ دار
 تھے۔ وہ بھی قفقاسی تھے۔ انہیں دیکھ کر بوڑھے کے دل میں یاد وطن نے
 گدھی کی۔ اور وہ یہ رباعی پڑھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ خود بھی ٹریا اور
 میں بھی ٹریا گیا۔ واپسی پر راستہ بھر میں یہی دو شعر پڑھتا آیا
 در غربت اگر مرگم گیسر بدین من آیا کہ کنت دقبر کہ دوز کفن من؟
 ابوت مرا جائے بلندے بگزارید تاباد برد بوئے مرا بر وطن من



۱۔ جلال السنی بے مترجم باب عالی۔ صیفہ مطبوعات جنبہ جباب عالی سے ہماری حیات
 کے لئے ماورے تھے۔ اور جن کا ذکر ان اوراق میں کئی جگہ آئے گا ۱۲

مکاتب مدارس

ہر کیل کے چھوٹے سے مدرسے اور اُس کی ایک جماعت کے نصاب کی جو حالت بیان ہو چکی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ استانبول کے بڑے بڑے مدرسے کیسے آباد ہوں گے اور اُن کی تعلیم کیسی ہوگی۔ لیکن افسوس مجھے مدارس کی سیر کی حسرت ہی رہ گئی۔ جن دنوں میں وہاں تھا۔ وہ تعطیل کا دن تھا۔ سب مکاتب بند تھے۔ کہیں کہیں چند غریب طلبہ جو تعطیل میں کہیں نہیں سکتے تھے۔ مکاتب میں باقی تھے۔ تعلیم سے جو دل لاشی مجھے ہے اُس نے تقاضا کیا کہ اس حالت میں بھی کچھ تو دیکھنا چاہئے۔ مکتبوں کی عمارات میں بچھیں اور وہاں کے انتظام کا حال دریافت کیا۔ بعض معتمدین اور بعض مستحقین سے باتیں کیں۔ مکتب سلطانی۔ دارالشفقہ اور دارالخیرین مکاتب نمونہ دیکھی اور باقی کالجوں کو مجبوراً چھوڑنا پڑا۔ ان تینوں کا تھوڑا سا حال لکھنے سے پہلے استانبول کی عام تعلیمی حالت کا ذکر نامناسب ہوگا۔

ترکی کی تعلیم کو دو مختلف پہلوؤں سے دیکھ سکتے ہیں۔ اول یورپ کے اور پانہ تہذیب کے مقابلے میں۔ دوم دیگر اسلامی ممالک یا ایشیائی دُول کی نسبت سے۔ پہلی صورت میں یہ کہنا پڑیگا کہ استانبول یورپ کے اور پانہ تہذیب سے تعلیم کے لحاظ سے بہت پیچھے ہے۔ اول درجے کے مقامات مثل لندن و برلن و پیرس کا تو کیا کہنا۔ یورپ کے بعض چھوٹے چھوٹے پانہ تخت اپنی

میرہ یونیورسٹیاں اور ان کے متعلق کئی کئی کالج رکھتے ہیں۔ مگر استانبول میں ایک کئی یونیورسٹی نہیں۔ ہاں مختلف فنون کے متعدد دعوہ کالج ہیں۔ اور وہ بھی بیشتر ترقی یافتہ اور انسانی سامان نہ تھا۔ دوسری صورت میں دیگر اسلامی ممالک سے مقابلہ کرتے ہیں۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگر کسی اسلامی ملک نے ابھی تعلیم میں اتنی بھی ترقی نہیں کی۔ جتنی ترکی نے۔ اور ایشیائی دُول میں عروج یافتہ جاپان کو چھوڑ کر باقی کوئی اس کے مقابل موجود نہیں۔ اس لحاظ سے دولت عثمانیہ کی سعی قابلِ داد ہے۔ یہاں ہر ضرورتی تعلیم نے گزشتہ تیس سال میں نمایاں ترقی کی ہے۔ بلکہ ہر فن کے لئے ایک مستقل کالج قائم ہو گیا ہے۔ اور کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اور ان کالجوں کے مجموعے کا ترتیب سے ایک معقول یونیورسٹی با سانی پیدا ہو سکتی ہے۔

زبانِ ترکی میں کتب اور مدرسہ کے مفہوم میں فرق کیا جاتا ہے تعلیمِ جدید کے کسی شعبے کی جہاں پڑھائی ہو اُسے کتب اور علومِ عربیہ اور دینیات کی جہاں تعلیم ہو اُسے مدرسہ کہتے ہیں۔ مدرسوں کا ذکر مساجد کے متعلق آچکا ہے۔ ہر بڑی مسجد سے ملا ہوا ایک مدرسہ ہے۔ طلباء کا گزارہ بیشتر مساجد کے اوقاف پر ہے۔ لیکن کئی جگہ یہ مدان کے لئے مفتقی ہیں۔ اس لئے وہ تعطیل کے زمانے میں اور خصوصاً ماہِ رمضان میں دیہات سے ہر کچھ زکوٰۃ وغیرہ حاصل کرتے ہیں اور اس پر گزارہ کر کے اپنی تعلیم مکمل کرتے ہیں۔ علومِ دینی کے طلبہ کی یہ حالت ایک بڑی اسلامی سلطنت کے زیرِ ساءہ۔ اور صفینہ دینیات کی قدر کے باوجود حیرتناک ہے۔ کیونکہ انہی طلبہ میں سے بہت سے میں ضروری امتحانات دیکر قاضی اور مفتی بن جاتے ہیں۔ اور ترقی کر کے حاکم کا رتبہ پاتے ہیں۔ شرعی عدالتوں میں وکیل بن سکتے ہیں۔ اور بعض اوقات بہت بڑے

مناسب پر پہنچ جاتے ہیں۔ اگر اس طبقہ کے اکابر علماء کے اقتدار کی حفاظت کے لئے
سے ان غریب طلبہ کی مدرسے کے لئے مدرسوں میں روپیہ دیں اور انہیں مانگے اور زکوٰۃ
بننے کی ذلت سے بچائیں تو بہت اچھا کام ہو۔

مدرسہ کی تعلیم ہمارے ہاں کے دینی مدرسوں سے بہت ملتی جلتی ہے۔ نہ
اُسی قسم کا ہے۔ عربی۔ فارسی پڑھائی جاتی ہے۔ مگر شاذ ہے کہ ان طلبہ میں سے کو
عربی یا فارسی میں گفتگو کر سکے۔ میں نے جامع محمد فتح کے والانوں میں درس
بھی دیکھا۔ ایک جماعت حدیث اور ایک جماعت فقہ پڑھ رہی تھی۔ اُستاد پڑھ
جاتا تھا اور کہیں کہیں تشریح کرتا جاتا تھا۔ طالب علم کتابوں پر کہیں کہیں یاد
لکھتے جلتے تھے۔ طلبہ لباس کے اعتبار سے ہمارے ہاں کے دینی مدارس
بہتر حالت میں تھے۔ سب کے لینے مولویانہ چوغے اور عامے بھلے معلوم
اب نئی تعلیم کے مکاتب کو لیجئے یہ تین درجوں پر منقسم ہیں۔ ابتدائی رشتہ
اعدادی۔ یہ قریب قریب ہندوستان کے پرائمری۔ مڈل اور ہائی سکول کا جواب
اعدادی مدارس میں کتب سلطانی واقعہ غلط سب سے بڑا ہے۔ یہ مدرسہ سلطان علی
کے زمانے میں قائم ہوا۔ اکثر یوپی زبانیں یہاں پڑھائی جاتی ہیں اور ہر طالب علم
اختیار ہے کہ جو زبان چاہے انتخاب کر لے۔ زیادہ میلان فرانسیسی کی طرف ہے
اس کے بعد جرمن۔ کوئی کوئی انگریزی بھی سیکھتا ہے۔ علوم مروجہ سے سمولر سائنس کے
واقفیت یہاں ہو جاتی ہے۔ اور یہاں سے نکل کر طالب علم اپنے اپنے مذاق سے
موافق کسی کسی کالج میں جاتا ہے۔ بعض جو دفاتر کی ملازمت کے شائق ہیں وہ ہیر
فراغت پاتے ہی دفتروں میں نوکر ہو جاتے ہیں اور جو اعلیٰ درجوں کی ملازمت

ہتے ہیں ڈاکٹربلیکیشا بانہ (سول سروس کالج) میں جا داخل ہوتے ہیں۔ جو کیل بننا چاہتے ہیں۔ وہ ڈاکٹربلیکیشا میں پڑھتے ہیں اور جو ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں وہ ڈاکٹربلیکیشا میں چلتے ہیں۔ ڈاکٹری کے فن میں عثمانیوں نے نہایت قابل تعریف ترقی کی ہے۔ اور استنبول کے ڈاکٹربلیکیشا کے پڑھے ہوئے ڈاکٹر یورپ کے کسی ڈاکٹر کالج کے فارغ التحصیل طلبہ سے اپنے فن میں کم نہیں ہوتے۔ طب کی اعلیٰ درجے کی کتابیں ترکی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اور ڈاکٹربلیکیشا کے طالب علم فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی واقفیت کے باعث اور بہت سی کتابیں جن کا ترجمہ نہیں ہوا پڑھ سکتے ہیں۔

کات و اسباب جدید سے جدید ہتیا ہیں اور عثمانی کم از کم اس ایک صیغے میں اپنے معاصرین یورپ کے جلد برابر ہو جائینگے۔ یہ صیغہ کئی وجہ سے مقبول بھی ہے۔ اول تو فوج کی کثرت کے سبب فوجی ڈاکٹروں کی ایک بڑی تعداد ہر وقت مطلوب رہتی ہے۔ دوسرے سرکاری شفا خانوں کی ملازمت کے سوا خاصہ میں اپنے طور پر لوگوں کا علاج معالجہ کرنے والوں کی معقول کمپت ہے۔

کتاب سلطان کی جس وقت ہم نے دیکھا۔ اس وقت تعطیل کے سبب بیشتر طلبہ باہر جا چکے تھے۔ مگر پھر بھی کوئی دو سو طالب علم موجود تھے۔ اور انتظام کا ڈھنگ دیکھا جاسکتا تھا۔ اس مدرسہ میں طلبہ کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ جن میں سے آٹھ سو بیرونیجات کے ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔ اُن کے سونے کے لئے کتب کے کمروں کے اوپر بڑے بڑے کمرے ہیں۔ جن میں میز پر کھانا چٹا جاتا ہے اور وہ بچوں پر پیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے کے کمروں کی کشتی اور صفائی کا مکمل خیال رکھا جاتا ہے۔ فیس مع خرچ سکونت پچاس روپیہ ہوا کرتا ہے۔

قریب ہے۔ لیکن دو سو غریب طلبہ مفت تعلیم پاتے ہیں۔ اس مکتب میں ہر ملت و مذهب نظر رکھا گیا
 کے طلبہ موجود ہیں اور سلطان کی عیسائی یہودی اور مسلمان رعایا سب اس سے یکساں تہہ و تمیز کو فروغ
 مستفید ہوتے ہیں۔ مکتب کی ایک خاص وردی ہے۔ جسے سب طالب علم پہناتے ہیں۔ ہندی کے
 خواہ مکتب میں ہوں۔ خواہ سیر کے لئے نکلیں۔ سیاہ بانات کا سوٹ اور ترکہ پہناتے ہیں۔ وہ مذہب
 ٹوپی۔ کوٹ کے کار پر مکتب کا نام۔ یہ دستور یہاں تمام بڑے بڑے مکتب میں
 مکتبِ سلطانی کے بعد ہم نے دارالشفقہ دیکھا۔ یہ مکتب تعلیم کے درجے کے
 اعتبار سے مکتبِ سلطانی کے برابر ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ یہ نیتا ملی کے لئے
 مخصوص ہے۔ اور اس میں معمولی تعلیم کے علاوہ تار برقی کا کام سکھایا جاتا ہے۔
 اور عثمانی ڈاکخانوں اور پولیس کے ملازم اس مکتب سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔
 اس میں آٹھ سو کے قریب طلبہ ہیں۔ جن کے سب مصارف مکتب سے ادا کئے
 جاتے ہیں۔ دو بڑی بڑی دو منزلہ عمارتیں اس احاطے میں ہیں اور ان کے گرد
 ایک باغ ہے اور کچھ سادہ زمین ابھی خالی پڑی ہے۔ اس مکتب کی تاریخ دلچسپ ہے
 استنبول بھر میں یہ ایک ہی مکتب ہے۔ جس کی بنیاد کوئی چالیس سال ہوئے
 عام چندے سے ڈالی گئی تھی۔ یہ جو شل اصلاح کا زمانہ تھا۔ جدید تعلیم کا چرچا نیا
 شروع ہوا تھا۔ ایک طرف انتظامِ سلطنت فرانسیسی سانچے میں طویل رہا تھا۔ دوسری
 طرف قومی تعلیم اسی سانچے میں ڈھلنے لگی۔ یورپ کے یتیم خانوں میں اکثر لڑکے
 اور لڑکیوں کے لئے ایک ہی احاطے میں جگہ ہوتی ہے۔ اس کی بھی یہاں
 تقلید کی گئی۔ فرانس میں۔ یتیم لڑکوں میں سے اکثر کی تربیت ملکی
 خدمات یا اشاعتِ مذہب کے لئے کی جاتی ہے۔ وہ

خیال یہاں بھی پیش نظر رکھا گیا۔ ایک عمارت لڑکوں کے لئے بنی اور ایک لڑکیوں کے لئے۔ یتیم لڑکوں کو مختلف زبانیں سکھا کر اور علوم مروجہ پڑھا کر دیگر ملک میں اسلامی مشنری کے طور پر بھیجنے کا ارادہ تھا۔ لیکن اتفاقاتِ زمانہ سے وہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ وہ مدرسہ بدل گئے۔ مدرسے کے بانی جہان سے اٹھ گئے۔

اب یہ اُن کے جو شیلہ ارادے کی یادگار باقی ہو اور اپنی جگہ پر مفید کام ہے۔ لڑکیوں کے لئے آخر مکان علیحدہ تجویز ہوا اور اس مکان کے دونوں حصے لڑکوں کے لئے استعمال ہونے لگے۔ کچھ عرصہ تک مدرسے کا انتظام بگڑا رہا۔

طلبہ کی بغاوتیں ہوئیں۔ استاد بدلے گئے۔ اب چند سال سے عمدگی کے ساتھ چل رہا ہو۔ موجودہ مدیر مکتب علی رضا باب ہیں۔ جو بہت قابل اور منتظم آدمی ہیں۔ ہم ایک دن وہاں گئے تو بسبب تعطیل وہاں کوئی نہ تھا۔ اتفاق سے

ڈاکٹر عبد الاحد داؤد جو پہلے کیتھولک مذہب کے پادری تھے اور اب شریعہ اسلام ہو کر اس مکتب میں معلم ہیں۔ آنکھ۔ وہ انگریزی جانتے ہیں۔ اُن سے بات چیت ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ کمرے تو میں بھی آپ کو دکھا سکتا ہوں۔ لیکن اگر آپ پھر کسی دن آسکیں تو میں پرنسپل صاحب (مدیر) کو اطلاع

کردوں اور وہ تشریف لے آئیں تو آپ اُن سے ملکر بہت خوش ہونگے۔ ہم نے کہا بہت اچھا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے انتظام کر کے ہمیں اطلاع دی

جب ہم گئے تو پرنسپل صاحب مع اپنے نائب اور چند معلمین کے ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے مکتب کے نصاب کے متعلق کچھ چھبے ہوئے کاغذات

ہمیں دیتے۔ ہمارے مکتب اور یتیم خانوں کا حال بہت تجسس سے پوچھا۔

اور یہ کہا کہ اگر ہندوستان کے کوئی عربی فارسی پڑھے ہوئے طالب علم پورپی نہیں
 سیکھنے یا ترکی کے ذریعے علوم جدیدہ پڑھنے کے لئے استانبول آئیں تو ہم بہت
 خوش ہونگے اور ان کے لئے ترکی جلد سیکھنے کا ہم عمدہ انتظام کر دیں گے۔ اوسط
 درجے کا خراج انہوں نے پانچ پونڈ یعنی پچھتر روپیہ ماہوار بتایا اور کہا کہ ایسے طلبہ
 کو وظیفہ دیکر بھیجنا چاہئے۔ تعلیمی معاملات پر اس قسم کی اور گفتگو کے بعد انہوں نے
 ہمیں سارے کتب کی سیر کرائی بعض طلبہ چھوٹی جماعتوں کے موجود تھے۔ ان کا
 سبق سنوایا۔ اس کتب میں سبق الاشیاء کے لئے ایک معقول میوزیم نظر آیا۔
 یورپ کے ہر مدرسے کے ساتھ ایسے میوزیم کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔
 میں نے ان سے کہا کہ ہندوستان کے اکثر مدارس سے آپ اس بارے
 میں اسچھے ہیں۔ کیونکہ وہاں یہ رسم ابھی عام نہیں ہوئی۔ گو ہوتی جاتی ہے۔
 ایک کمرہ علم طبعیات اور کیمیا کے تجربوں کے لئے تھا۔ ایک نقاشی کے لئے
 جس میں نقاشی کے کام کے اچھے اچھے نمونے طلبہ کے ہاتھ کے بنائے ہوئے
 رکھے تھے۔ علم نباتات اور علم معدنیات کی بھی ابتدائی تعلیم کا سامان اس کتب میں
 ہے اور اس حصے کے بڑھانے کی تدبیر ہو رہی ہے۔ اوپر کی منزل میں لڑکوں کے
 رہنے کے کمرے ہیں اور نین کرے شفا خانہ کے ہیں۔ جن میں ایک میں وائیاں
 رکھی ہیں۔ اور دوسرے میں ڈاکٹر صاحب بیٹھے اور مریضوں کو دیکھتے ہیں تیسرے
 کمرے میں مریضوں کے پٹنگ تھے۔ یہاں یہ دستور عام ہے کہ ہر مدرسے کے بورڈنگ
 کے ساتھ ایک مکمل شفا خانہ موجود ہے اور ایک قابل ڈاکٹر کے سپرد ہے۔
 دارالخیر ایک بات میں دارالشفق سے ملتا ہے اور وہ یہ کہ یہ بھی یتیمی کے لئے

کھولایا ہے۔ سلطان المعظم کو جو توجہ اپنی رعایا کے غریب حق پر ہے اور جو
کوشش اُن کے وقت میں یتیم اور لاوارث بچوں کو قابل اور ہوشیار بنانے
کے لئے کی گئی ہے۔ یہ مکتب اس کی بہترین نظیر ہے۔ جس مکان میں مکتب واقع
ہے۔ وہ پہلے ایوان شاہی تھا۔ لیکن سلطان المعظم نے نہایت فیاضی سے اسے
بنائی کو دیدیا۔ اب یہ اُنکا مکتب ضائع ہے۔ یہاں وہ پڑھتے بھی ہیں اور صنعت
بھی سیکھتے ہیں۔ اور اسی ایوان شاہی میں اُن کے رہنے کے کمرے بھی ہیں۔
اُن کی خوش قسمتی دیکھتے۔ جھونپڑوں سے نکل کر محلوں میں جگہ پائی۔ بابا چھین
گئے تھے۔ تو شفقتِ شامانہ اُن کے سر پر سایہ فلک ہوئی۔ اُستادوں کو خاص
ہدایت ہے کہ وہ ان بچوں کو کسی طرح یہ محسوس نہ ہونے دیں۔ کہ وہ یتیم ہیں۔
جب کسی نہ کسی ہنر میں مشاق ہو جائیں تو بعض کو سرکاری کارخانوں میں جگہ
مل جاتی ہے اور بعض اپنے طور پر علیحدہ دوکانیں کھولتے ہیں۔ اُس وقت انہیں
اُن کی مزدوری کا اندوختہ آغاز کار کے لئے مل جاتا ہے۔ ساڑھے تین سال
ہوئے ہزالی نس فرید پاشا موجودہ صدرِ عظم نے اپنے آقائے نامدار کے
حکم سے اس مکتب کی رسم افتتاح ادا کی۔ اس وقت اس میں تین سو طلبہ تعلیم پاتے
ہیں۔ جو صنائع یہاں سکھائی جاتی ہیں۔ اُن میں موسیقی بھی شامل ہے۔ اور موسیقی
سیکھنے والے فوجی باجے کے لئے تیار کیے جاتے ہیں۔

اور بہت سے مکاتب ہیں جن کے دیکھنے سے تعطیل نے ہمیں محروم کیا۔
وہ سب نہایت مفید کام کر رہے ہیں۔ مکتب صنائع۔ مکتب ہندسہ (انجینئرنگ کالج)
مکتب اللہان۔ اور مکتب فنون لطیفہ۔ یہ آخری مکتب ہز کسنسی جی بی ہنر

موزہ الطین کی سعی سے جاری ہوا ہے اور عثمانیوں کے لئے بالکل نئی چیز ہے۔ لیکن طلبہ کے کام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عثمانی فنون لطیفہ سے بھی باسانی مناسبت پیدا کر سکتے ہیں۔ اور اہل یورپ کا یہ خیال کہ وہ فقط جنگجو قوم ہیں اور سوائے فنونِ حرب کے اور کسی کام کے لئے موزوں نہیں غلط ثابت ہوتا جاتا ہے۔ یہ سب مکاتب فنونِ صلح سے متعلق ہیں۔ مگر فنونِ صلح کے لئے کسی ملک اور قوم کو فرصت میسر نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ وہ فنونِ جنگ سے ماہر نہ ہو اور جنگ کے لئے پوری طرح تیار نہ رہے۔ لڑائی زمانہ حال میں دو قسم کی ہے۔ بحری اور بری اور ان کے جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے اس وقت عثمانی صیغہ بحریہ میں نہایت کمزور ہیں۔ مگر بحریہ کی خیر بحری تعلیم ان کے ہاں مروج ہو اور صرف یہی ایک جگہ دنیا بھر میں ہو جہاں سلطان انہیں بحری تعلیم مکمل یا نامکمل جو کچھ بھی ہو۔ پارہے ہیں۔ یہاں کی بری فوج کسی دوسری اور پشتر دولت سے پیچھے نہیں اور اس کی وجہ کچھ تو ترکوں کی سپاہگری اور فداکاری ہو اور انہیں میں کچھ مکاتبِ حربیہ کی برکت۔ سلطنت عثمانیہ ولایتوں پر منقسم ہو۔ اور ہر ولایت کے صدر مقام میں ایک مکتبِ حربیہ موجود ہے۔ ان مکاتب سے تعلیم پاکر اعلیٰ حربی تعلیم کے لئے لڑکے استانبول آتے ہیں اور مکتبِ حربیہ شامانہ میں داخل ہوتے ہیں۔ خود استانبول میں بھی کئی ابتدائی مکاتبِ حربیہ ہیں۔ جو بڑے مکتب کی شاخیں ہیں۔ مکتب کی عمارت شاندار ہو اور اس کے قریب ایک وسیع میدان قواعد اور چاند ماری وغیرہ کے لئے ہے۔ اس میں جنگی تعلیم کے ساتھ ساتھ السنہ کی تعلیم بھی ہے اور طب اور طب حیوانات کی جماعتیں بھی ہیں۔ چونکہ میں نے اس مشہور مکتب کی جماعتوں کو تعلیم پاتے نہیں دیکھا۔ اس لئے ان کی تعلیم کی تفصیل لکھنے سے

قائم ہوں۔ ہاں اس کالج کے پڑھے ہوئے کئی اصحاب سے ملا ہوں۔ اُن کی تعلیم و تربیت ہر اعتبار سے معقول نظر آئی۔ ہمارے قومی خطیب مولانا نذیر احمد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مسلمان طلبہ کے لئے مناسب ہے کہ مدارس سے تیج دوم یعنی سپاہی اور اہل قلم بن کے نکلیں۔ میں نے مکاتبِ حریمہ کے پڑھے ہوئے ترکوں کو عین اس قول کے مصداق پایا اور وہ اپنے عہدوں کے کام بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ علومِ جدیدہ میں طبیعیات اور کیمیا کی تعلیم اس مکتب میں جاری ہو اور ان کے پڑھانے کے لئے بڑے بڑے ذی مرتبہ فوجی ڈاکٹر متعین ہیں۔ دیگر مکاتب کی طرح یہاں کے طلبہ بھی بورڈنگ میں رہتے ہیں۔ پنجشنبہ کے دن انہیں گھر جانے اور عزیزوں سے ملنے کی اجازت ہوتی ہے اور اُس دن وردی پوشش سچیلے نوجوان جو جو نکلتے ہیں۔ بعض دفعہ یونہی کے طلبہ کے گرد ہوں میں جو شور و غل ہوتا ہے۔ اس سے یہ قطعاً پرہیز کرتے ہیں۔ نہایت سلیقے اور متانت سے چلتے پھرتے ہیں اور اُن کے وقار سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اگہی ہے کہ ٹانگ اور قوم کے ناموں کی حفاظت کا بوجھ اُن کے ذمے ہے۔

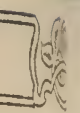


حمید خستہ خانہ اطفال

طب جدید میں عثمانیوں کی جس ترقی کا ذکر مکتب کے ضمن میں کیا گیا ہے اُس کا نمونہ قسطنطنیہ کے ہسپتال ہیں۔ انہیں یہاں خستہ خانہ کہتے ہیں۔ ہم متعہ عثمانی ہسپتال دیکھے۔ ہر ایک کو مصفا آرام دہ اور تازہ ترین سامان سے آراستہ پایا۔ اُن کا اہتمام بالکل عثمانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ مکتب طبیبیہ کے فارغ التحصیل ڈاکٹر ان میں کام کرتے ہیں۔ سلطان العظم کے عہد میں سب صوبوں میں حمید خستہ خانہ قائم ہوئے ہیں لیکن جن خستہ خانہ پر توجہ شاہی سب سے زیادہ ہے وہ اطفال خستہ خانہ حمید ہے۔ جو قسطنطنیہ کی قابل دید چیزوں میں ہے۔ پیرا سے مکتب کی طرف جو سڑک جاتی ہے۔ اُس پر چلیں تو مکتب حریہ سے تھوڑے فاصلے پر اس خستہ خانہ کا ایشان دروازہ آتا ہے۔ یہ عمارت بلندی پر واقع ہے۔ اور اس کے عقب میں ایک خوشنما وادی ہے۔ اور کوئی اور عمارت اس کی طرف ہوا کی آمد و رفت رکے کے لئے موجود نہیں۔ اس کا موقع بہ لحاظ صحت کے بہت عمدہ چنا گیا ہے۔ اور اس کے وسیع احاطے میں کئی عمارتیں ہیں جو مختلف مطالب کے لئے مقرر ہیں۔ ایک عمارت جراثیم امراض کی تحقیقات کے آلات سے پر ہے۔ اور دوسرا ایک لائق مہر فن اس کے متعلقہ تجربات کرتا رہتا ہے۔ رائجین کی شائع سے بھی امراض اندرونی کی تحقیقات کا کام یہاں لیا جاتا ہے۔ ایک عمارت حال میں تکمیل ہوئی ہے۔ جو دق اور سل کے مریضوں کے لئے مخصوص ہے۔ اور اس میں نائزہ حال



مجلس مایون هیئت مفتون حضرت ملائیپناهیک اوتورنخی سنه ددریمسنه مصادف بوم مسعوده « جمعیه » الطول خسته نهه نالیسنده خناری احرا قلانی
 المذاک و المری ایله پر لکده خسته نهه نالی بالجهسنده آکین فلووگرانداری



کے مطابق علاج
میں میں تھے
میں کے لئے
میں کا امتحان
میں سے انہوں
میں یہ عورتیں
میں اہل بی ہر
میں اور جب
میں زور پڑے
میں ہو جاتی ہیں
میں کے ادا کر
میں ایک باغیچہ
میں دہاں کی
میں کھلتے پھر
میں بیٹھے اور
میں کہ سنسی ابر
میں کتہ لیں
میں خاندان
میں ہمیشہ کے

کی تحقیق کے مطابق علاج کا پورا تہیہ کیا گیا ہے۔ کئی وارڈ معمولی امراض کے لئے ہیں۔ اور ان میں ننھے ننھے مریضوں کی آسائش کے لئے ہر طرح کا اہتمام ہے۔ ان کی خبر گیری کے لئے عورتیں مقرر ہیں۔ یہ گو یورپ کے ہسپتال کی طرح سنگ (یعنی بیمار داری) کا امتحان پاس کئے ہوئے تو نہیں ہیں۔ لیکن امتحان پاس کی ہوئی عورتوں سے انہوں نے کام سیکھا ہے۔ چونکہ یہاں مریض اکثر مسلمان ہیں۔ اس لئے عورتیں بھی مسلمان ہیں۔ اور ہمارے ہاں کے غریب مسلمانوں کی طرح پردہ سے بالکل بری ہیں۔ یہ پہرہ پر کچھ نقاب وغیرہ نہیں رکھتیں۔ سفید دوپٹے اوڑھے رہتی ہیں اور جب ڈاکٹر صاحب یا کوئی اور مرد ان کے وارڈ میں معائنہ کو آتے ہیں تو دوپٹے سے اپنی پیشانی کسی قدر ڈھانپ لیتی ہیں اور ادب سے ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہیں۔ بچوں کی نگہداشت بڑی محنت سے کرتی ہیں اور اپنے فرائض کے ادا کرنے میں کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ بچوں کے وارڈ کے سامنے ایک باغچہ ان کی ہوا خوری اور تفریح کے لئے ہے۔ مریض بچے کرسیوں پر بیٹھے وہاں کی تازہ ہوا لیتے ہیں اور جو قریب بہ صحت ہوں وہ اس میں ہنستے کھلتے پھرتے ہیں۔ وسط صحن میں ایک خوبصورت عمارت ڈاکٹروں کے بیٹھنے اور عملیات جراحی وغیرہ کرنے کے لئے ہے۔ اسی عمارت میں طبیب ہر کلسنسی ابراہیم پاشا کا دفتر ہے اور ایک چھوٹا سا مگر نہایت آہستہ کردہ بادشاہ کی تشریف آوری کے لئے مخصوص ہے۔ کہ اگر وہ آئیں تو اس میں بیٹھیں۔ چہستہ خانہ چند سال ہوئے سلطان المعظم نے ایک شانہزادی کی یادگار میں جو انہیں ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئی۔ قائم کیا ہے اور الحاق

یہ بچوں کے علاج کے لئے مخصوص ہے۔ اب ایک عمارت اس میں اور بن رہی ہے جو ولادت خانہ ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ غریب عورتیں جن کو گھر میں زچگی کے اخراجات میسر نہ ہوں۔ وہ جنسنے سے پہلے یہاں آجائیں۔ اور بہترین ڈاکٹر اور نرسیں ان کے علاج اور ہوشیار قابلہ ان کے لئے یہاں مہیا ہوں۔

ہم نے دومرتبہ اس خستہ خانہ کو دیکھا۔ پہلی مرتبہ ڈاکٹر سلیمان نوری نے جب اس کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ خانہ کچھ بڑا اچھا ہے اور اس میں بہت سی چیزیں ہیں۔ اور خستہ خانہ کے طبیب و مہم ہیں۔ ہمیں سب چیزیں مل رہی ہیں اور نہایت توجہ سے دکھاتے رہے۔ وہ انگریزی بولتے ہیں۔ اس لئے ہم ان سے بات کرتے ہوئے کہانی سب باتیں ترجمان کی مدد کے بغیر پوچھ سکتے تھے۔ ہم نے خستہ خانہ کے کمرے کے دروازے کے متعلق چند بڑے بڑے آدمیوں کی رائے بھی پڑھیں۔ جو ایک کتاب میں درج ہیں اور اس کتاب میں یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ سرکلوسل و کانسیفر انگلستان اور بعض دیگر سفر لے کر آئے ہیں اور ان کی رائے بھی درج تھیں۔ جنہوں نے بعد معائنہ اس ہسپتال کو یورپ کے عمدہ ہسپتالوں کی طرح کہا کہ ہم تم پر قیاس کر رہے ہیں اور اس سے اس کے بانی کے رحم دل ہونے کا غیاں ثبوت سمجھا رہے ہیں۔ جب ہم فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہونے کو گئے تو معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ ایک پانچ طبیب اول جو خاص معالج شاہی بھی ہیں۔ دفتر میں تشریف لے آئے ہیں۔ یہ کہنے سے ان سے ملاقات ہوئی۔ پچاس سے اوپر برس ہو گا۔ مگر طبیعت جوانوں کی طرح مینا ہسپتال میں آئی ہے۔ ہر بات سے چستی اور چابکی ٹپکتی تھی۔ انہوں نے ہمیں سال گذشتہ کی بہتر باتیں بڑے رپورٹ دی۔ جو مفصل اور بالتصویر ہے اور نہایت خوبی سے چھپی ہوئی ہے۔ اور اس قدر قوت پائی ہے کہ اس سال حال کی رپورٹ بھی ہمیں بھیجی جائیگی۔ اس رپورٹ کی رونق گردانی کرتے ہوئے مجھے ایک عجیب تصویر نظر آئی۔ صحن خستہ خانہ میں ایک فوارہ ہے۔ اس کے

کہ ایک گروہ چھوٹے چھوٹے لڑکوں کا ایک ہی قسم کا لباس پہنے کھڑا تھا۔ سب کے لیے
بے کڑے اور سر پر لمبی پھینڈنے والی ٹوپیاں۔ میں نے پوچھا یہ کس موقع کی تصویر ہے
وہ انہوں نے کہا کہ یہ رسم ختنہ ہے۔ جو ہر سال جلوس ہمالیوں کے دن یہاں اوجھڑ
دیگر ہسپتالوں میں ادا ہوتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تعداد لڑکوں کی ہمیں ہوتی ہے۔
جب وہ ختنہ کے بعد گھر جانے لگتے ہیں تو سب کی مجموعی تصویر بطور یادگار
کے لیے لی جاتی ہے اور اس رپورٹ میں شامل کی جاتی ہے۔ میں نے کہا یہ
نظارہ بھی عجیب ہوتا ہوگا۔ انہوں نے کہا۔ ہاں بہت دلچسپ ہوتا ہے۔
اگر آپ جلوس کے دن تک قسطنطنیہ میں رہے تو ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ
آپ ضرور آئیں اور اس مبارک جشن میں شریک ہوں۔

روزِ جلوس آیا تو ہم یہ رولف دیکھنے گئے۔ جو دنیا بھر میں زالی ہے۔ کیونکہ
اور کہیں سرکاری طور پر اس مذہبی رسم کے لئے اہتمام نہیں ہوتا۔ استانبول میں
سب ختنہ روز جلوس کے منتظر رہتے ہیں اور اس دن کے عام جشن کی شادی
میں یہ گھر گھر کی شادی ایک اضافہ ہوتی ہے۔ اور لطف یہ کہ لڑکوں کے والدین
اس تقریب کے خرچ سے بچ جاتے ہیں۔ اور سب ضیاع بادشاہ کی طرف سے ہوتا
ہے۔ ہسپتالوں میں اس دن کی آمد آمد کے لئے کئی دن سے تیاریاں ہوتی
ہیں۔ چند بڑے بڑے کمرے اس تقریب کے لئے خالی کئے جاتے ہیں ان
میں پینک قطار در قطار بچھ جاتے ہیں۔ ہر پینک پر صاف سفید بستر اور ایک
نئی رضائی اور تیکے ہوتے ہیں۔ ہر لڑکے کے لئے لباس ختنہ ہسپتال کی طرف
سے تیار ہوتا ہے۔ یعنی کھلا اور لمبا چھینٹ کا کرتا اور پھینڈنے والا ٹوپی۔ لڑکوں

کے والدین اور شہنشاہ دار نہیں ساتھ لیکر آتے ہیں۔ دروازہ کے قریب ایک کھڑکی سے ہرنچے کو ٹکٹ ملتا ہے۔ ٹکٹ لیکر اندر آتے ہیں تو پہلے وہ ختنے کا لباس پہن دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے کپڑے اتار کر یہ لباس پہن لیتے ہیں۔ پھر ختنے کے کمرے میں جاتے ہیں وہاں بڑے بڑے نامور ڈاکٹر جو جراحی میں خاص شوق رکھتے ہیں اپنے ہاتھ سے ختنہ کرتے ہیں اور ختنے کے بعد زخم پر فوراً ایک مرہم لگا دیتے ہیں۔ اگر کوئی لڑکا ختنے کے وقت یا بعد رو پڑتا ہے تو دروازہ سے نکلتے ہی ہنسنے لگتا ہے۔ کیونکہ باہر نقل ہنسانے والے لباس پہنے کھڑے رہتے ہیں اور دف وغیرہ بجا کر بچوں کا دل بہلاتے اور انہیں ہنساتے ہیں۔ ہرنچے کو جو فارغ ہوتا جاتا ہے لاکر پلنگ پر لٹا دیتے ہیں۔ اُس وقت بعض عزیز اُن کے پلنگ کے قریب آ بیٹھتے ہیں۔ اُن کے پلنگ پر لیٹے ہی پہلے ایک شربت آتا ہے۔ اس کے بعد نہایت مکلف کھانا اُن کے لئے تیار رہتا ہے چند کھانے کے بعد ایک کو کھیلنے کے لئے ملتے ہیں اور ختنے کے ایک گھنٹے بعد ان بچوں کو قسط اولیٰ دو گھنٹے در قطار چپ چاپ بیٹھے یا ہنستے بولتے اور کھلونوں سے دل بہلاتے دیکھ کر عجب مسرت ہوتی ہو۔ کچھ عمل جراحی کی خوبی اور کچھ عمدہ علاج اور مرہم کی بدولت یہ حیرت خیز ہے۔ کہ ختنے کے دوسرے روز یہ لڑکے اُٹھ کر باسانی چلتے پھر لگتے ہیں اور ہمارے ملک والوں کی طرح دفوں لیٹے نہیں ہتے۔ چلتے وقت انکی تصویریں کتب خانوں میں لی جاتی ہو۔ اور ہر ایک کو چند روز کے لئے پینے کو دوا اور لگانے کو مرہم اور کچھ دینے میں سلا دیکر خصمت کیا جاتا ہے۔ ایک دن اور ایک رات وہ خستہ خانہ میں مہمان رہتے ہیں کہ ختنے کے ہیں اور اُس ایک دن رات میں انکی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا ان کا گھر

روزِ جلوس کو جب ہم وہاں پہنچے تو باہر دُور تک ہجومِ خلاق تھا۔ لوگوں کو با ترتیب اندر لیجانے اور کٹ دلانے کے لئے پولیس بھی حاضر تھی۔ صحنِ خانہ میں ترکی با جاج رہا تھا۔ گرجا کے سب ساز یورپی تھے۔ بجانے والے وردی پوش طالب علم تھے۔ اور اُن کے سامنے موسیقی کی کتابیں اسی طرح کھلی ہوئی تھیں جیسے انگریزی بابے والوں کے آگے ہوتی ہیں۔ استانبول کے بڑے بڑے اخبارات کے نامہ نگار بھی اس جشن کی کیفیت دیکھنے آئے تھے۔ ڈاکٹر سلیمان نوری بے اُس روز بہت مصروف تھے۔ مگر انہوں نے اپنے اجزا جی باشی (ہیڈ کیسٹ) کو کہا کہ ہمیں سب کمروں کا انتظام دکھاؤ اور پھر کھانے پر لیجائے۔ تاکہ ہم دیکھ لیں کہ بچوں کے لئے کیسا کھانا پکایا گیا ہے۔ جب ہم کھانے کے کمرے میں گئے تو وہاں اخبارات کے نامہ نگار بھی مدعو تھے اور ہم نے ایک مینیر پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور ہم سب اس دن کے انتظام کے عمدہ اور مکمل ہونے پر متفق الٹے تھے۔

ہمیں کوئی دو گھنٹے خستہ خانہ میں لگے۔ پھر ہم تو چلے آئے۔ لیکن وہاں لوگوں کی آمد و رفت۔ ساز و سرود۔ خور و نوش کا سلسلہ شام تک جاری رہا اور دوسرے روز اخبارات سے معلوم ہوا کہ تین سو کے قریب بچوں کا خستہ خانہ اطفال میں ہوا۔ اسی طرح اور خستہ خانوں میں کہیں سو کہیں ڈیڑھ سو۔ کچھ نہیں تو ہزار ڈیڑھ ہزار بچوں کا خستہ جلوس کے دن استانبول میں ہوا ہوگا۔ ایک ضروری اسلامی رسم کو رعایا کے لئے اس قدر آسان کر دینے میں سلطانِ المعظم کی فیاضی کی جس قدر داد دیں بجا ہے۔ ہمارے ہاں کئی لوگ بچوں کے خستے کی تقریب پر بیحد خج کر دیتے ہیں اور کبھی کبھی روپیہ پاس نہ ہونے پر ان کی زیر باری اٹھا کر گھر بچھونک تماشا دیکھتے ہیں۔ اُن کے مقابل میں ہمارے عثمانی بھائی

مقام خلافت

کی حالت قابل رشک نظر آتی ہو۔ کہ اُن کی گرد سے کچھ نہیں کھلتا اور یہ بوجھ اُن کے سر سے اُتر جاتا ہے۔ لیکن ایک بات میں وہ ہم پر رشک کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہ آزادانہ حق حاصل ہے کہ جب چاہیں کسی بچے کے تختے کرالیں۔ ہستانبول میں یہ ممکن نہیں۔ کسی اور موقع پر اپنے گھر ڈاکٹر بلانے کے لئے خاص اجازت شاہی حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اہل حالات کے ہر جو سوائے بڑے آدمیوں کے ہر ایک کو نہیں مل سکتی اور متوسط طبقے کے بعض لوگ اس قید سے سخت گھبرا رہے ہیں۔ لیکن غم نہ کرنا کہ اس سے بڑھ کر بدترین حالت ہے سہولت خیال میں نہیں آ سکتی۔ جو اس شفقت شاہانہ کی بدولت انہیں میسر ہے۔



دار العجزہ

عہدِ حمیدی کے احداثات میں دار العجزہ نہایت قابلِ تحسین بنیاد ہے۔ کوئی
 دس گیارہ سال ہوئے اس کی بنیاد رکھی گئی اور روز بروز اس کے اندر پناہ لینے
 والوں کی تعداد میں ترقی ہے تنکے ماندے ضعیف اپنی زندگی کے آخری دن
 کو ان حوادث کی زد سے بچ کر اس مقامِ امن و عافیت میں گزارتے اور سلطانِ معظم
 ان جان و مال کو دعا دیتے ہیں۔ خستہ خانہ اطفال اگر بچوں کے لئے خزانہِ صحت
 تھا تو دار العجزہ بوڑھوں کے لئے سرمایہِ راحت ہے۔ گویہ گھر بھی بچوں سے
 خالی نہیں۔ بہت سے ننھے ننھے یتیم اور لا وارث بچے یہاں پرورش پاتے
 ہیں اور یہاں کے پروردہ باشندوں کی مُندی ہوئی آنکھوں کا نور اور اُن کے
 دیوں دلوں کا سرور ہیں۔ شہر سے دُور ایک نہایت وسیع احاطے میں دار العجزہ کے
 مکانات ہیں۔ چاروں طرف کھلا میدان ہے۔ ہوا تازہ اور صحت بخش ہوا اور
 مکانِ مستحضرے اور پُر آسائش ہیں۔ یہاں ایک ہزار کے قریب عیسویوں کو کھانا
 ور کپڑا دیا جاتا ہے۔ اور اُن میں جو بیمار ہوں اُن کا علاج کیا جاتا ہے۔ جو اپنا بچ
 ہیں اُن کو سوائے آرام کے کچھ کام نہیں۔ لیکن جن کے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں وہ
 کسی نہ کسی کام میں لگے رہتے ہیں۔ اُن کا دل بھی بہلا رہتا ہے۔ اور دار العجزہ کے
 کارخانے بھی چلتے رہتے ہیں۔

دار العجزہ کے مدیر اور اُن کے معاون اور ڈاکٹر صاحب جن کے سپرد وہاں کا

شفاخانہ ہے۔ سب حاضر رہتے ہیں اور اُن کی نشست کے لئے کمرے بڑے ہیں اور اس دروازہ کے پاس ہی بنے ہوئے ہیں۔ ہم گئے تو محمد فخر الدین بے مدیر اور دو قوتی بھائی افغانز نے ہدی بے طبیبِ اول نہایت اخلاق سے پیش آئے۔ اور انہوں نے دارالبحرین کے لئے ہر حصہ میں تفصیل دکھایا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے شفاخانہ دکھایا۔ جہاں یہاں تو اپنی ضروریات کے مطابق اُن سب اوصاف سے متصف تھا جو خستہ خانہ کے متعلق تھے۔ بیان ہو چکے ہیں۔ علاوہ اس کے ڈاکٹر صاحب کے مریضوں کو اُن سے ایک بٹن کے انعام حاصل نس یہاں نظر آیا۔ جو اُن کی مروت اور خلق کا نتیجہ تھا۔ ان کے کمرہ میں ایک بڑا سا کاناڑا ہوتا ہے جہاں بیماروں کے منہ پر ایک رونق آجاتی تھی اور بعض بوڑھی بوڑھی عورتیں زانیہ رہتی تھیں انکو بچہ دُعائیں دیتی تھیں۔ وہ معاینہ کرتے ہوئے ہر ایک سے حال پوچھتے اور انہیں تسلی دیتے جاتے تھے۔ اس شفاخانے میں بھی چند کمرے ولادت کا کام دیتے ہیں اور غریب عورتیں جنہ کی وقت یہاں آتی ہیں۔ ایک کمرہ ہم نے دیکھا اُس وقت خالی تھا۔ اس میں ایک کونے میں ایک بڑا سا شیشہ زنگین شربت کا دہن تھا۔ ہم نے پوچھا یہ کس کام آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں بتایا۔ کہ عثمانیوں کا دستور ہے کہ زچہ کے کمرے میں یہ شربت رکھتے ہیں اور جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو رشتہ دار موجود ہوتے ہیں اُن میں شربت تقسیم کیا جاتا ہے۔ پس شفاخانہ میں بھی شاہی بھی ہے کہ غریبوں کو ایسا معلوم ہو کہ وہ اپنے گھر میں ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی عورت یہ محسوس کرے۔ کہ اگر اُسے اپنے گھر جسنے کی توفیق ہوتی تو اُس کے غریبوں میں شربت بٹتا۔ یہاں یہ شربت ہتیار ہوتا ہے اور وقت پر ہر عورت اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتی جو خیرات کے کام میں غریبوں کے احساسات کا اس نزاکت سے پاس

ہر ایک کام نہیں ہے اور اس پاسداری کے لئے اس شفاخانہ کے بانی اور کارکن
 دونوں کے دل و دماغ قابلِ آفرین ہیں۔ یہ پاسداری دارالبحرہ میں انتہا درجے کی ہے
 اس میں داخل ہونے کے لئے مذہب کی قید نہیں ضعیف ہونا دار یا بیمار ہو۔
 خواہ کسی وقت کا ہو۔ یہاں قبول کیا جاتا ہے۔ اور سب کے ساتھ یہاں کے ماترین
 کیسا سلوک کرتے ہیں۔ مومن و اسی و گبر و نصاریٰ و یہود سب موجود ہیں۔ لیکن ان
 کی جسمانی آسائش کے انتظام پر یہاں اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کی راحت و وحانی
 کی بھی فکر کی گئی ہے۔ مسلمانوں کے لئے مسجد ہے۔ تو نصاریٰ کے لئے گر جانا
 کے دو بڑے فریق روم میں ہیں ایک ارمنی۔ دوسرے یونانی۔ دونوں ایک دوسرے
 کے گرجے میں عبادت نہیں کرتے۔ اس لئے ارمنی گر جانا ہے اور یونانی گر جانا
 ہم نے دونوں گرجے کھلو اکے دیکھے۔ جو کچھ سامان گرجوں کے لئے ضروری ہو
 وہاں موجود تھا۔ اور ہر ایک کے لئے علیحدہ پادری مقرر ہے۔ جسے سرکار سے
 تنخواہ ملتی ہے۔ گرجے کی عبادت کے وقت مسلمان اہلکار ضعیف عیسائیوں کو
 جو آسانی سے چل پھر نہیں سکتے۔ اپنے ہاتھوں کا سہارا دیکر گرجے میں پہنچا آتے
 ہیں۔ بے تعصبی اور دلداری اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے۔ جو عیسائی پرانے
 مذہبی عناد اور اغیار کے بہکانے سے آئے دن حکومت کے برخلاف سازشیں
 کیا کرتے ہیں اور یورپ میں ان کے مددگار جو کتب و اخبارات کے ذریعہ سے
 عثمانیوں کو گالیاں دیا کرتے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ اس دارالبحرہ کی زندگی
 کو دیکھیں اور ان ضعیف عیسائیوں سے پوچھیں کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے
 وسط صحن میں ایک عمارت ہے۔ جس کے گرد پردے کے لئے ترکی رواج کے

مطابق لکڑی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ یہ بیوہ غورتوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ اس کے اندر مرد نہیں جاتے۔ اس کے پیچھے دو عمارتیں بچوں کے لیے ہیں۔ اور ان بچے ہر عمر کے ہیں۔ دو چار دن کی ننھی سی جان سے لیکر دس بارہ برس کے بچوں کی یہاں تک۔ جو لاوارث تھے۔ وہ یہاں بھیجا جاتا ہے۔ چھوٹے بچوں کی پرورش یہاں ہوتی ہے۔ بڑا نازک کام ہے۔ لیکن جسدِ طب کی ساری کوشش اس شکل کے حل کرنے پر لگے ہوئے ہیں۔ صرف کی جاتی ہے۔ بچے نہایت ستھرے کپڑوں میں پہنے ہوئے ہلکے ہلکے گہواروں میں لیٹے ہیں۔ جالی کے دوپٹے ان کے منہ پر پڑے ہیں۔ خالص لکڑی کے دوہ کی نزل ان کے لئے تیار رہتی ہے۔ جوں جوں اور غذا ہضم کرنے کے لائق ہوتے جاتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر کے مشورہ اور تجویز کے مطابق اوقات میں کھانے کا پر مناسب مقدار میں غذا انہیں دیتی ہے۔ چار چار پانچ سال کے کئی لڑکے اپنے مکان کے دروازے کے باہر ایک سایہ دار درخت کے نیچے کھیل رہے تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو وہ سب ڈاکٹر صاحب کی طرف بابا بابا کہتے ہوئے دوڑے آئے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان کے سلوک نے بچے سے لیکر بوڑھے تک کو گرویدہ کر رکھا ہے۔

چھوٹے بچوں کے کمروں سے ملا ہوا ایک مدرسہ ہے۔ جہاں پانچ برس سے اوپر کے بچے ابتدائی تعلیم پاتے ہیں۔ اور کوئی نہ کوئی دستکاری بھی انہیں سکھائی جاتی ہے۔ کہیں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں قالین بانی کا کام سیکھ رہی ہیں۔ کہیں سینا پر ونا اور شیدہ کا کام ہو رہا ہے۔ اسی کے آگے کپڑے دھونے کی ایک بڑی کل ہے۔ جس میں ارالہ جھڑ کے لٹکوں میں ذرا سیانے لڑکے کام سیکھتے ہیں۔ اس کل سے

سائین دارالبحرہ کے کپڑوں کے دھلنے کے علاوہ باہر کے کچھ کپڑے اجرت پر
 بھی دھوئے جاتے ہیں۔ اور آگے چل کر آٹھ دس برس کی عمر کے بچوں کی ایک جماعت
 بھی تھی۔ اور ایک عیسائی معلمہ انہیں پڑھا رہی تھی اور وہی اُن کی خواہگاہ کی نگراں تھی
 خواہگاہ کے کمرے نہایت مصفا تھے اور خواہگاہ کے نیچے کھانے کا کمرہ تھا جہاں
 مہتر بہر ایک کے لئے علیحدہ دستمال رکھا تھا۔ اُن لڑکوں نے ایک ٹرکی گیت
 سنا۔ اور اس کے بعد ”پادشاہم چوقیش“ یعنی ہمارا بادشاہ دیر تک زندہ رہے
 کے نعرے بلند کئے۔ اس کے بعد ہم نے دارالبحرہ کے مختلف کارخانے دیکھے۔
 جس لڑکوں کو دستکاری سکھائی جاتی ہے۔ ایک کارخانہ بوٹ بنانے کا تھا۔ ایک دزیوں
 جس کے سوا لکڑی کے کام کا ایک بہت بڑا کارخانہ تھا۔ جس میں لکڑی پرنیل بوٹے
 اور طرح طرح کے باریک کام کے نمونے بچوں کے ہاتھ کے بنائے ہوئے موجود تھے۔
 وزیر صنعت و اعلیٰ مدح پاشا کو اس کارخیر کی طرف بہت توجہ ہے اور یہ کام اُن کی
 نگرانی میں چل رہا ہے۔ اور اُمراء دولت بھی کسی نہ کسی طرح کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرتے
 رہتے ہیں۔ دیکھتے آتے ہیں تو بچوں کو مٹھائی وغیرہ بانٹ جاتے ہیں۔ یہاں کی خست
 کی چیزیں خریدتے ہیں جس دن ہم وہاں تھے اُس دن چند امیر خاتونیں معائنہ کے لئے
 ان تھیں اور بچوں کے کمروں کو نہایت شوق سے دیکھتی تھیں۔ موجودہ مدیر صاحب کو
 اس لحاظ کے اندر عمدہ باغ لگانے کا شوق ہوا ہے اور امید ہے کہ ایک دو سال کے اندر
 باغ بچہ حالت میں ہو جائیگا۔ اس وقت اس کی عمارتیں بہت خوشنما معلوم ہونگی اور اس کے
 غائب ملکوں کے لئے یہ جگہ ایک بہشت بن جائیگی۔

دارالبحرہ کو جاتے ہوئے عیسائیوں کی دو خوبصورت عمارتیں ملنی ہیں۔ اُن میں

ایک تو آرمینیوں کا قبرستان جو اور دوسری اہل بلغار کا یتیم خانہ۔ آرمینیوں کے قبرستان اور اس کے اندر کے گرجے کو تو ہم نے اتر کر دیکھا۔ بڑی شاندار جگہ ہے اور آرمینیوں کے تہذیب پر دلالت کرتی ہے۔ اُن کے بڑے بڑے سر کردہ گوشت کھان کے بُت سنگ مرمر کے بنے ہوئے قبرستان کے باغچے کی زینت ہیں۔ قبرستان میں داخل ہونے کی کسی کو ممانعت نہیں۔ مگر ہر ایک سے توقع کی جاتی ہے۔ کہ خیراتی صندوق میں جو نکلے گا پچھلے وقت دروازہ پر پیش کیا جاتا ہو کچھ ڈالتا آئے۔ دوسری عمارت یعنی بلغاریوں کے یتیم خانہ کو ہم نہ دیکھ سکے۔ عمارت بڑی خوبصورت تھی اور دروازہ نہایت عالیشان۔ اُن کے اندر یتیم خانے میں نے اپنے رفیق جلال انسی بے سے کہا کہ چلو اسے بھی دیکھیں۔ انہوں نے کہا کہ وہاں کے یتیم خانے کے بلوغاریوں کے متعلق یہاں ایسے خیالات ہیں کہ میرا اور آپ کا وہاں جانا شہہ کی نظر سے مل جائے گا۔ اور دیکھا جائیگا اور شاید بلغاری بھی بلا اجازت اندر نہ جانے دیں۔ میں خاموش ہو رہا۔ مگر ان سے بہتر ہے بار بار ان بلغاریوں کی ہمت پر رشک آتا تھا۔ کہ محض چندے سے کیسی شاندار نہایت مختلف بنا کھڑی کر دی ہو۔ یہ قوم بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے۔ علم میں۔ ہنر میں۔ انگریزی میں فن جنگ میں اور فداکاری میں۔ جاننے والے کہتے ہیں۔ کہ مشرقی یورپ میں بلغار کا کتاب پڑھنے کا خط ایک دوسرا جاپان بنے کو ہے اور ان کا نمونہ محض ٹرکی کے لئے نہیں۔ بلکہ یورپ سہاگن کے سرور کی دیگر ہمسائہ سلطنتوں کے لئے خطرناک ہو۔ بلکہ ان کی بدولت ایک دن یورپ کے اس سرور کو ان عامہ میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہو گا۔



مطبع عثمانی

شفاخانوں کی طرح مطابع میں بھی عثمانیوں نے اچھی ترقی کی ہے۔ استانبول میں دہڑے شاہی چھاپے خانے ہیں۔ اور ان کے علاوہ لوگوں کے ذاتی مطابع کثرت میں ہیں۔ ہم نے شاہی چھاپہ خانوں میں مطبع عثمانی کو دیکھا اور اخبارات کے مطابع میں ثروت الفنون اور صباح کے چھاپے خانے دیکھے۔ اور ان کے عمدہ انتظام اور ان کے کام کی خوبی سے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ شاہی مطبع کی عمارت اس کے شان کے لائق ہے۔ اور اُس میں ٹائپ اور لیتھو دونوں قسم کی چھپائی اس نفارت سے ہوتی ہے کہ اُس سے بہتر کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اس طبع میں سرکاری رپورٹیں اور کافذات نہایت تکلف سے چھپتے ہیں۔ یورپ میں اکثر رپورٹیں دیکھنے میں خواہ بہت نہیں ہوتیں۔ انگریزی میں تو ان کے نام ہی ان کی حالت کا پتہ دے رہے ہیں۔ پہلی کتاب "پہلی کتاب" - سفید کتاب کا نام رپورٹوں کی مختلف اقسام کے لئے ہے۔ عتبار ان کے سرورقوں کے مخصوص ہو گیا ہے۔ لیکن ترکی میں جو رپورٹیں چھپتی ہیں۔ ان کے سرورق کی آرایش میں شرقی مذاق موجود ہوتا ہے اور ٹائپ اور لیتھو دونوں سے ان کی آراستگی میں کام لیا جاتا ہے۔ ملک اور صوبجات اور صنایع کے نقشے اور اُس سرکاری مکاتب کے لئے یہیں چھپتے ہیں اور صفائی اور خوبی میں یورپ کے نقشوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتے۔ اسی طرح اکثر درسی کتابیں بھی یہاں شائع ہوتی ہیں۔ اس عمارت کی دو منزلیں ہیں۔ نیچے پریس ہے اور لیتھو کا

سامان لوپر ٹاپ کا کام ہوتا ہے۔ مدیر مطبع اور اس کے معاونوں اور مطبع کے مصلح کا دفتر بھی اوپر کی منزل میں ہے۔ چھپائی کی نئی ایجادات سب اس مطبع میں متعل ہیں۔ ٹاپ جوڑ کر اُس سے براہ راست ورق چھاپنے کی بجائے سکے کے پیٹ تیار کرتے ہیں اور اُن پلیٹوں سے کتاب چھاپتے ہیں۔ یہی ترکیب انگلستان کے اخبارات کے مطابع میں عام طور پر متعل ہے۔ حروف جوڑ کر جب ایک صفحہ تیار ہو جائے تو اس پر ایک نرم سامقوہ رکھ کر پریس میں دباتے ہیں۔ سکے کے حروف اس مقوہ میں گر جاتے ہیں۔ پھر گھملا ہوا سکے اس مقوہ کے اوپر ڈال کر پیٹ بنا دیتے ہیں۔ اس ترکیب سے ٹاپ بھی برسوں نہیں گھٹتا۔ چھپائی بھی اچھی ہوتی ہے۔ اور اگر ضرورت ہو تو پیٹ محفوظ رہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے مزید کام نہ لینا ہو تو فوراً بھٹی میں ڈال کر کچھالے جاتے ہیں اور پھر اس طرح نئے پیٹ اُن سے بن جاتے ہیں۔ اس مطبع میں وقت فرصت قرآن مجید جھپتے رہتے ہیں اور اس کے ذخیرہ میں ایک بڑی تعداد قرآن شریف کی جلدوں کی تیار رہتی ہے۔ یہ جلدیں سلطان المعظم کی طرف سے ایسے غریب مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً تقسیم کی جاتی ہیں۔ جو پڑھنے کا شوق رکھتے ہوں۔ مگر جن کے پاس پیسہ نہ ہو۔ اور بہت سی جلدیں ہر سال حج بیت اللہ کے کاروان کے ہمراہ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کو بھیجی جاتی ہیں۔

ٹاپ جو مطبع عثمانی میں متعل ہے وہ بھی ایک سرکاری کارخانے میں مستانبول میں ہی ڈھالا جاتا ہے اور یہ ٹاپ گو مصر کے عربی ٹاپ سے ملتا ہوا ہے۔ تاہم اس سے زیادہ خوشنما ہے۔ ہمارے ملک میں اردو ٹاپ کی ضرورت مدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ اور ہمارے اخبارات اور رسائل اور ہمارے علم ادب کی ترقی بہت کچھ اس

ضرورت کے پورا ہونے پر موقوف ہو۔ لیکن خطِ استعلاق کا ٹائپ ابھی میسر نہیں اور ہماری آنکھیں اُس سے مانوس ہیں۔ اس لئے لوگ معمولی عربی ٹائپ کی چھاپی پسند نہیں کرتے۔ اس کی بجائے اگر استانبول کا ٹائپ جو مطبع عثمانی اور دیگر مطابع میں متل جو لگایا جائے تو قیسمتاً زیادہ مقبول ہو۔ گو اصل قبولیت تو خطِ استعلاق کے ٹائپ کو ہی حاصل ہو سکتی ہو۔ میں نے دریافت کیا کہ آیا ہم اس سرکاری کارخانے سے ٹائپ خرید سکتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ بغیر اذنِ شاہی کے کسی کو وہاں سے ٹائپ نہیں ملتا۔ اس کی یا تو یہ وجہ ہوگی کہ وہ کارخانہ محض مقامی ضروریات سے زیادہ متنبہ نہیں کر سکتا۔ اور یا وہی فہم تجارتی کی کمی جو عثمانیوں میں پائی جاتی ہو اور جو رفع نہیں ہو سکتی جب تک سرکاری کارخانوں کے سوا دوسرے کارخانے ان چیزوں کی مافقت کے لئے نہ ہوں اور وہ تجارت کی غرض سے تجارتی اصول پر نہ چلائے جائیں۔ تاہم حاجت کے پیٹ تصویروں کے چھاپنے کے لئے بھی استانبول میں خوب بنتے ہیں اور سرکاری ریپوڑوں میں سے بعض جنہیں تصاویر کی ضرورت ہوتی ہے جیسے خستہ خانہ یا دارالبحرہ کی ضخیم ریپوڑیں، بکثرت تصاویر سے آراستہ ہوتی ہیں اور سی کتابوں میں بھی اکثر یورپ کی تقلید سے بالتصویر چھپتی ہیں اور عام طور پر کتابوں اور رسالوں کے بالتصویر چھاپنے کا شوق رومہ ترقی ہے۔ ثروت الفنون استانبول کے بالتصویر پرچوں میں اس وقت بہترین پرچہ ہے اور اس کے اڈیٹر احمد احسان بے نہایت روشن خیال محب وطن ہیں۔ یہ پرچہ ہفتہ وار شائع ہوتا ہے اور چھاپائی اور رنگ و روغن میں یورپ کے عمدہ بالتصویر پرچوں کے قریب قریب اس میں بعض اوقات رنگین تصویریں بھی شائع ہوتی ہیں اور ملک کی عام معلومات

بڑھانے میں یہ معقول خدمت کر رہا ہے۔ علاوہ اس کے عام پسند تازہ تالیفات بھی اس مطبع میں چھپتی رہتی ہیں۔

استانبول کے مطابع میں اخبار و معلومات کا مطبع ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن انیسویں بوجہ مالک کے محسوس ہونے کے وہ مطبع بند پڑا ہوا ہے۔ دیگر اخبارات کے اور بڑے بڑے کتب فروشوں کے اپنے اپنے مطبع ہیں۔ اور عموماً بارونٹی ہیں۔ بڑے پبل سے باپ عالی کو جائیں تو ایک بازار کتب فروشوں کا آتا ہے جس میں زیادہ تر جدید مذاق کی کتابیں بچتی ہیں اور روزانہ اخبارات مثل اقدام صباح اور سعادت کے مطابع اسی بازار میں ہیں۔ میں نے ان سب کے دفاتر دیکھے۔ یہ مطابع اور اخبارات بعض باتوں میں اپنے ہندوستانی معاصروں سے خوش قسمت ہیں اور بعض باتوں میں ہندوستانی والے ان سے اچھی حالت میں ہیں۔ لیکن اس اجمال کی تفصیل آگے آئیگی۔

کتابیں جو استانبول کے مطبع میں چھپتی ہیں۔ ٹاپ اور چھپائی میں عموماً اچھی ہیں۔ لیکن علم ادب کی ترقی کی راہ میں ایک عرصے سے سرکاری مکتبہ چھپنی کا رونا ایسا اٹھ رہا ہے۔ کہ بیشتر کتابیں بیجان جسم کا حکم رکھتی ہیں۔ اور کوئی کتاب نئی یا پرچہ جس کے پڑھنے سے کسی طبیعت میں کوئی جوش یا ولولہ پیدا ہو۔ اندوں نہ چھپ سکتی ہو نہ پک سکتی ہو۔ اس لئے ترکی زبان کا علم ادب ایک خاصی لمبی پرپیچ رہ گیا ہے۔ اور اس کا فیض بجائے نہروں کے فیض کے ایک تالاب سے مرث ہے۔ جس کے پانی میں حرکت نہ ہو۔ اور جس کے رنگے بو میں فرق آنے لگے۔ تا ترکی زبان اس لحاظ سے قابل شک ہے۔ کہ مختلف علوم جدیدہ کی اچھی اچھی کتابیں ترکی میں ترجمہ ہو گئی ہیں اور لوگ ان سے استفادہ ہو سکتے ہیں۔ اس کے

اب بھی یورپ کی ایسی کتابوں کے جو آزاد خیالات سے پُر نہ ہوں ترجمے شائع ہوتے
رہتے ہیں۔ مگر آزادی بھی ”نکورو یوں“ کی طرح ”تابِ مستوری“ نہیں کھتی۔ اور بصورتِ
”چو در بندی سر از وزن بر آرد“ کسی نہ کسی طرح اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ چنانچہ استانبول
میں فرانسیسی زبان کے رواج نے اس ساری روک تھام کو بے سود کر رکھا ہے اور
ہزاروں عثمانی زن و مرد فرانسیسی زبان اور فرانسیسی علم ادب سے وہ بہت حاصل
کرتے ہیں جو انہیں اپنی زبان میں میسر نہیں ہے۔



اخباری دنیا

حیثیت اخبار نویس میرے لئے استانبول کی اخباری دنیا کو دیکھنا ضروری تھا لیکن
 اگر مجھے خود کوئی تعلق اخبارات سے نہ ہوتا تو بھی میں استانبول کی زندگی کے اس پہلو
 سے غافل نہ رہتا۔ کیونکہ ملک کی ترقی کا ایک معیار اس کے اخبارات کی حالت ہے۔
 استانبول میں جیسے بولنے میں کمی زبانیں مستعمل ہیں۔ اسی طرح اخبارات بھی مختلف
 زبانوں کے اس اختلاف میں موجود ہیں۔ مسلمانوں کے ہاتھ میں جو اخبارات ہیں
 وہ ترکی زبان میں ہیں۔ اور عیسائیوں کے اخبارات عموماً دیگر زبانوں میں یونان، ہنگری،
 روزانہ دوزبانوں میں چھپتا ہے۔ ایک حصہ انگریزی ہوتا ہے اور ایک فرانسیسی
 سٹامبول نام ایک اور فرانسیسی روزانہ ہے جو ہیرلڈ کا مقابلہ ہے۔ بعض عیسائی اخبار
 سرب زبان میں نکلتے ہیں۔ جو روسی سے کسی قدر ملتی ہے۔ بعض کی زبان ترکی
 مگر سرب حروف میں لکھی ہوتی ہے۔ لیکن ترکی اخبارات تعداد اور اشاعت میں ان سب
 سے زیادہ ہیں اور انہیں ہر مذہب و ملت کے لوگ پڑھتے ہیں۔ ترکی روزانے
 آج کل چار ہیں۔ صباح، اقدام، ترجمان حقیقت اور سعادت۔ اور جیسا کہ ہر جگہ
 فطرت انسانی کا خاصہ ہواں میں باہمی رقابت ہے۔ ہمیشہ لوگوں کی رقابت
 تو قدرتی بات ہے۔ اس پر اعتراض نہیں لیکن رقابت کی بھی قسمیں ہیں اور درجہ
 جب یہ حد سے گزر جائے تو ترقی کی مانع ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہندوستان کے کسی
 اخبارات کے تجربے سے ظاہر ہے۔ افسوس ہے کہ استانبول کی اخباری دنیا

بھی ہمارے ہاں کی طرح اس مرض میں مبتلا ہو اور وہاں یورپ کے دوسرے پارہ مختول
 کی طرح وہ جائز رقابت نہیں جو خوبیوں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی ترغیب دیتی
 ہے۔ ہمیں اس رقابت کا ایک ناگوار تجربہ ہوا۔ اور وہ یہ کہ سب سے پہلے ہم نے
 صباح کا مطیع دیجھا۔ اور اس اخبار میں ہمارے وہاں جانے کا ذکر شائع ہو گیا۔ اس کے
 بعد جو اقدام کے مطیع میں گئے تو صاحبانِ اقدام کو ناراض پایا۔ کہ ہم نے صباح کو ان
 پر ترجیح دی۔ حالانکہ ہمارا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ بلکہ محض اتفاقی طور پر ہمارے مطیع صباح
 میں جانے کی تقریب پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ یوں کہ صباح کے اڈیٹر محمد توفیق افندی
 سے ہتھانہول پہنچنے سے پیشتر ریل میں ہماری ملاقات ہو گئی۔ وہ گرمی کے سبب
 دیہات میں مقیم تھے اور صبح اٹھ کر اپنے دفتر کو جانے کے لئے اُسی گاڑی میں
 سوار ہوئے جس میں ہم تھے۔ چونکہ اپنی سیاحت میں ہندوستانیوں کو دیکھ چکے تھے
 اس لئے انہوں نے خیال کیا کہ ہم ہندوستانی ہیں اور عربی میں ہم سے پوچھا کہ
 ہم کہاں کے رہنے والے ہیں۔ میں نے کہا ہند کے۔ اس پر باتیں شروع ہوئیں
 باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ وہ اخبار نویس ہیں۔ میں نے کہا میں بھی اخبار نویس
 ہوں۔ وہ یہ سنکر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے۔ ہمارے دفتر کو دیکھنے کے لئے
 ضرور آئیے گا۔ آج تو ہفتہ ہے جلدی دفتر بند ہوتا ہے اور آپ کو بھی سفر کی کوفت
 ہوگی۔ کل کتبہ کو میں وہاں نہیں ہوں گا۔ آپ دو شنبہ کو اگر آسکیں تو میں بہت ممنون
 ہوؤں گا۔ ہم نے وعدہ کیا کہ آئینگے۔ اس طرح ہم سب سے پہلے وہاں گئے۔ کارخانہ
 نہایت معقول حالت میں نظر آیا۔ عمارت نئی بنی ہے۔ مالک کارخانہ مہراں افندی
 نامی ایک ارمنی صاحب ہیں۔ ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ تجارتی اصول پر کارخانے

کو چلاتے ہیں۔ کہنے کا کام اڈیٹروں کے سپرد ہے۔ اور ان میں کچھ ارمنی ہیں کچھ مسلمان۔ لیکن اخبار کے خریدار بیش تر مسلمان ہیں اور اس کی تحریر ایسی ہے جس سے عیسائیت کا کوئی اظہار نہیں ہوتا اور سلطان المظہم کی مدح و ثنا اور خلافت کی تائید و حمایت اس میں ہے۔ دوسرے اخبارات سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ اخبار کے دفتر میں ایک ترجمان انگریزی دان بھی تھا۔ اس کے توسط سے ہم نے مالک اخبار سے باتیں کیں۔ ان سے ہم نے پوچھا کہ اشاعت کا کیا حال ہے۔ کہنے لگے بہت اچھی ہے۔ بالواسطہ تیس ہزار کے قریب بتائی۔ اشاعت استانبول میں دیگر مقامات یورپ کے طریق پر ہے۔ یعنی زیادہ تر مدار و زمانہ فروخت پر ہے۔ نہ کہ سالانہ خریداروں پر۔ روزانہ اخبارات کی قیمت یہاں سستی رکھی گئی ہے اور یہ بھی ایک راز ان کی معقول اشاعت کا ہے۔ ادھنی نی پرچہ عام قیمت ہے۔ بازاروں کے موڑوں پر اخبار بیچنے والے کھڑے رہتے ہیں اور ہر شخص ادھنی ادھنی کو ایک پرچہ لے جاتا ہے۔ ان کے علاوہ صرافوں کی دوکانوں اور کتب فروشوں کے ہاں بھی اخبارات فروخت کے لئے موجود ہوتے ہیں۔

صبح والوں کی ملاقات کے دوسرے دن باب عالی سے جلال بے ہماری رفاقت میں دیئے گئے۔ دو تین دن بعد ایک دن وہ اور ہم اس چھوٹی سی تہ زینتی ریل میں سوار ہوئے جو ریل سے غلطہ کو جاتی ہے اور جسے ٹول کہتے ہیں۔ ریل میں ایک صاحب اخبار اقدام کے اڈیٹروں میں سے بیٹھے تھے۔ جن کا نام اسماعیل حقی آفندی تھا۔ جلال بے انہیں پہچانتے تھے۔ انہوں نے ملاقات کرائی۔ وہ کہنے لگے ہمارے مطبع میں بھی آپ کو آنا چاہئے۔ بلکہ صبح سے پہلے آپ کو ہمارے ہاں آنا چاہئے تھا۔ کیونکہ وہ عیسائی کا پرچہ ہے۔ اور ہمارا پرچہ ایک مسلمان کی ملک ہے۔

دیے بھی اُس سے مقدم سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ ہم آپ کے ہاں بڑے شوق
 آئیں گے۔ چنانچہ اس قرار داد کے موافق ہم مطبع اقدام میں گئے۔ اسماعیل حقّی آفندی
 فارسی بولتے تھے۔ اُن سے فارسی میں باتیں ہوتی رہیں۔ پوچھنے لگے۔ آپ کے
 استانبول آنے کا کیا مقصد ہے۔ میں نے کہا سیر و سیاحت اور مسلمانان ہند اور
 عثمانیوں کے درمیان رشتہ محبت کی مضبوطی کے ذرائع ڈھونڈنا۔ میں نے اس
 سلسلے میں اپنی مشرت کا اظہار کیا کہ عثمانی اخبارات ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات ہندوستان کے
 اخبارات کے حوالے سے درج کرتے رہتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اردو اخبارات سے براہِ سرت
 ترجمہ کرانے کا کوئی انتظام نہیں۔ بلکہ مصر کے اخبارات کے ذریعے سے انہیں خبریں
 ملتی ہیں اور مصر کے اخبارات عموماً انگریزی اخبارات سے نقل کرتے ہیں۔ انہوں نے
 جواب دیا میرے نزدیک تو یہاں آپ کا آنا لا حاصل ہو۔ یہاں کے باشندے اور
 یہاں کے اخبارات بالکل سجان ہیں۔ اُن کے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہیں۔ نہ
 وہ کسی کے کچھ کام آسکتے ہیں نہ اپنے۔ اخبارات کی حالت آپ نے ان چند روز
 میں دیکھ ہی لی ہوگی۔ اُن میں کیا ہوتا ہے۔ خبروں پر رائے زنی کرنے کا تو کیا ذکر۔
 خبریں بھی سب درج نہیں ہونے پاتیں۔ ہر روز ہمیں اخبار کی ضرورت سے دو گنا مطلب
 یا بس تیار کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ اگر سنسٹر صاحب عین وقت پر کوئی دوچار کامل روٹی درو
 کچھ اور مواد موجود ہو۔ جو اُن کی جگہ رکھ دیا جائے۔ ہر شام کو کام کر کے روحِ قبض
 ہوتی ہو کہ خدا جانے اخبار نکلتا پائے گا بھی یا نہیں۔ باوجودیکہ اس میں سوائے بیکار

سنسٹر۔ انگریزی اور فرانسیسی میں اس فسر کو کہتے ہیں جس کا کام اخبارات کے مضامین کی پرتال ہو۔
 اور جو مجاز ہو کہ جس مضمون کی اشاعت اُسے نامناسب معلوم ہو اسے روک دے ۱۲

خبروں کے کوئی مضمون بھی تو کام کا نہیں نکلنے پاتا۔ کسی کی نسبت پڑھو کہ دول ایوہ
 اس سے ناراض ہو گئی۔ کوئی رعایا کے خیالات کو بھڑکانے والا سمجھا جاتا ہے۔ آزادی
 اصلاح۔ اتحاد۔ یہ سب الفاظ ممنوع ہیں۔ آپ ہی کہتے کہ اخبار اس حالت میں کس کام
 آسکتے ہیں۔ میں نے کہا:- محکمہ سنسر کی صعوبتوں کی نسبت آپ کی شکایت بجا ہو۔
 لیکن میں آپ کے اخبارات کی قوت کو اس مایوسی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا جس سے
 آپ دیکھتے ہیں۔ مانا کہ اخبارات کو آپ کے ہاں وہ قوت حاصل نہیں جو بعض اور ملکوں میں
 اُن کا حصہ ہے۔ لیکن اس پر بھی وہ بڑا کام کر رہے ہیں ہر اخبار کے ہزاروں پرچے
 روز ملک میں پھیل جاتے ہیں۔ اُن میں صرف خبریں بھی ہوں جب بھی لوگوں کے
 خیالات میں سعت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ آپ کے اخبارات کی اشاعت ملک میں اخبار بینی
 کے مذاق کا ثبوت دیتی ہے۔ آپ کے اخبارات ٹائپ سے چھتے ہیں۔ اور آپ کی
 اپنی زبان میں۔ یہ باتیں ایسی ہیں۔ جن پر ہم ہندوستان والے رشک کر سکتے ہیں۔
 ہمارے ہاں ہمارے اخباروں کی اشاعتیں عموماً محدود۔ مالی حالت اکثر خستہ اور
 لیتھو کی محتاجی۔ ہم آپ سے اس خصوص میں ابھی منزلوں پیچھے ہیں۔ مگر پھر بھی پاکو
 نہیں۔ آپ کو تو اُمید کے لئے بہت زیادہ گنجائش ہے۔ جس میں یہ جانچ پرتال کی
 سختی رفع ہو جائے۔ ترکی مطالع فوراً وہ اثر حاصل کر لینے۔ جس کی انہیں آرزو ہے۔
 کیونکہ آپ کے ہاں ڈھانچہ متحمل موجود ہے۔ جسم تیار ہے۔ اُس میں ذرا جان ڈالنے
 کی ضرورت ہے۔ اس موضوع پر اس قسم کی بحث کچھ دیر تک جاری رہی۔ مگر اسماعیل حق
 آفندی اپنی رائے بدلنے کی طرف مائل نہ ہوئے۔ یعنی مصلحتاً مضمون گفتگو بدل دیا۔
 اور تھوڑی دیر کے بعد اُن سے اجازت لیکر ہم رخصت ہوئے۔

اس کے بعد ہم نے سعادت کا مطیع دیکھا۔ جو دفتر اقدام کے قریب ہی واقع ہے۔ اس کے مالک اڈیٹر دو تعلیم یافتہ اور خوش خیال نوجوان ہیں۔ احمد بے اور نافذ بے ان سے بلکہ ہم بہت مسرور ہوئے۔ یہ پرچہ ایک زمانے میں بہت زور پر تھا دیرین میں بند ہو گیا اور اب پھر کچھ عرصے سے از سر نو جاری ہوا ہے اور اس کے کارکن کی کامیابی میں پوری سعی کر رہے ہیں۔ ان اخبارات میں سے ہر ایک کو تھوڑی سی مدد خراج سرکاری طور پر بھی ملتی ہے۔ اور اس کا غیر متیقن ہونا اکثر ان کی حالت کو بھی غیر متیقن کر دیتا ہے۔

ترجمان حقیقت کے مطیع میں ہم نہیں گئے۔ لیکن اس کے مالک اڈیٹر جودت بے آفندی سے ایک دن عزت پاشا کے کمرے میں سرارے ہمایون میں ہماری ملاقات ہو گئی۔ تجربہ کار اخبار نویس ہیں۔ مگر اندوں کوئی سرکاری عہدہ بھی ان سے متعلق نہ تھا اور اخبار کا کام ان کے ملازمین ان کے زیر نگرانی چلاتے ہیں۔ سہتاہنول میں اخبارات عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور جو شخص جرائد کے ذریعے نام پیدا کرے۔ اس کے لئے حکومت کے عہدوں کے راستے کھلنے کی بھی نظریں موجود ہیں۔ ہر ماہی نس فرید پاشا صدر اعظم ایک زمانے میں جرائد سے متعلق تھے اور اہل قلم میں ہستیا ز رکھتے تھے۔

روزانہ اخباروں کے سوا استانبول میں کئی ہفتہ وار پرچے اور دیگر موقوفات رسالے ہیں۔ ان میں ثروت الفنون کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ بچوں کے لئے اور عورتوں کے لئے خاص پرچے علیحدہ ہیں۔ افسوس کہ عربی یا فارسی میں آجکل کوئی اخبار استانبول سے نہیں نکلتا۔ جب معلومات زندہ تھا تو اس کا ایک پرچہ عربی

بھی تھا۔ فارس میں ایک زمانے میں ایک اخبار نکلا تھا۔ مگر بعض مقامی مصلحتوں سے وہ جگمگا بند کیا گیا۔ مجھ سے اور جوت بے سے اس بارے میں گفتگو ہوئی۔ اویس نے کہا کہ ایک اخبار عربی اور ایک فارسی مقام خلافت سے نکلنا ضروری ہے۔ تاکہ اس بڑے اسلامی مرکز کے حالات شرح و بسط کے ساتھ دوسرے اسلامی ملکوں میں معلوم ہو۔ یہیں۔ عربی اخبار عرب و شام و مصر اور شمالی افریقہ کے دوسرے حصوں کے مفید ہوگا اور ہندوستان میں بھی پڑھا جاسیگا اور فارسی اخبار ہندوستان اور ایران اور افغانستان میں عثمانیوں کے متعلق صحیح اطلاعات کا ذریعہ ہوگا۔ اُن نے کہا کہ اگر حکومت سے اجازت مل جائے تو وہ فارسی اخبار نکالنے کو آمادہ ہو۔ اس کے بعد میں نے بعض اراکین دولت کو اس ضروری امر کی طرف متوجہ کیا۔ یہ جاسکتا کہ انہیں اس کے متعلق کوئی عملی کارروائی کرنے کا خیال نہ ہو سکا اور ان کی کوشش کامیاب ہوگی یا نہ ہوگی۔ مگر انہوں نے مجھے یقین دلایا۔ کہ وہ ایسا اخبار کی ضرورت کے معترف ہیں اور حتی الامکان اس کے لئے اجازت حاصل کی سعی کریں گے۔

اخبارات کے متعلق سب سے زیادہ دل خوش کن چیز جوستانبول میں نظر آئی وہ یہ تھی کہ ادنیٰ ادنیٰ ہر طبقے کے لوگ اخبار کا شوق رکھتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قہر میں بھی اخبارات رکھے ہیں اور سب لوگ انہیں پڑھتے ہیں۔ اگر یہ اخبار سب مضامین آزادانہ لکھ سکیں تو دنوں میں قوم بیدار ہو جائے۔ مگر اب بھی عثمانی حالات عالم۔ بے خبر نہیں۔ کم از کم پایہ تخت کا ہر عثمانی یہ کہہ سکتا ہے کہ رع زکار جہاں بے خبری سے لوگ اخبار غور سے پڑھتے ہیں اور ذرا ذرا سی خبر بھی اُن کی نظر سے نہیں بچتی

نہارے وہاں پہنچنے کے متعلق جس دن اخبارات میں مضمون نکلیے۔ اُس دن ہم نے
 دیکھا کہ بازاروں میں کسی لوگ ہم کو پہچانتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ
 یہی وہ ہندوستانی ہیں جن کے آنے کی خبر آج صبح پڑھی تھی۔ اور ہمیں راستہ
 بنانے میں غیر معمولی اخلاق سے کام لیتے تھے۔

اخبارات پر لوگوں کی اس توجہ کو میں ان اخبارات کے حق میں فال نیک سمجھتا
 ہوں اور اسی سے مجھے امید ہوتی ہے کہ کسی دن یہ اخبار بہت مفید ثابت ہوں گے۔



تربیت اطفال

ہر قوم کی زندگی میں تربیت اطفال ایک جزو ضروری ہے۔ جس پر اس کی آئندہ بقا موقوف ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بچہ سست ہوئی کہ عثمانیوں کو تربیت اطفال کا بہت خیال ہے۔ اور جس سلسلے سے متوسط طبقے کے عثمانی اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں وہ ہر طرح تعریف کے قابل ہے۔ مغربی اور شرقی دونوں تربیتوں کے مناسب ملاپ سے عثمانی بچوں کے عادات اور اطوار میں ایک عجیب جوہر پیدا ہو گیا ہے۔ وہ بزرگوں کے ادب میں پورے ایشیائی ہیں اور بزرگوں کے رویہ و عمل اور نہ کھڑے ہو شکاری سے بات چیت کرنے میں اور ان کی صحبت میں متانت کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے میں یورپ کی دیگر اقوام کے بچوں سے کم نہیں۔

بچوں کے لئے اساتذہ کے ہر حصے میں ابتدائی مدرسے ہیں۔ ان مدرسوں کے لئے دیکھنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا۔ مگر کئی گھروں میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھا جو اور سینے پر دو دہاں سے پڑھ کر آتے تھے اور ان میں سے بعض کی خواندگی کا امتحان بھی کیا۔ یہاں اقامت ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ خواندگی معقول ہے۔ قرآن مجید سب پڑھتے ہیں۔ ترکی کی ابتدائی کتابیں اور کتب عربیہ و فارسیہ سب پڑھتے ہیں۔ اور ان کا مطلب آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ حساب میں ضرب و تقسیم تک سیکھ چکے ہیں۔ اپنے ملک کے جغرافیہ اور بعض تاریخی حالت سے بھی تھوڑی بات چیت کرتے ہیں۔ سب واقفیت رکھتے ہیں۔ ان ابتدائی مدرسوں میں چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں دونوں بڑے بڑے پڑھتے ہیں۔ اور بڑی لڑکیوں کے مکاتب علیحدہ ہیں۔

مدرسے کے بعد گھر میں بچوں کی مائیں نہیں اُن کی خواندگی کے دہرانے اور
 اُنکی عام تربیت کی ذمہ دار ہیں اور یہی سب سے بیش بہا حصہ اُن کی پرورش کا
 ہے۔ بچوں کی حرکات سکنت دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ لباس نہایت صاف
 و ستھرا۔ اطوار دل بہانے والے۔ جب اُن کے بزرگوں کی ملاقات کے
 لئے لوگ آتے ہیں۔ تو سچے بھی سلام کرنے آتے ہیں۔ کمرہ میں داخل ہوتے
 ہی جھک کر ہر بزرگ کے پشتِ بست کو چومتے ہیں اور پھر ادب سے ایک طرف
 کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر باپ کی طرف سے یا مہمان کی طرف سے اشارہ پائیں
 بیٹھ جاتے ہیں۔ ورنہ کھڑے رہتے ہیں اور جوابات پوچھی جائے اس کا مناسب
 جواب دیتے ہیں۔ اس کے بعد جب چار یا تہوہ آئے تو اپنے ہاتھ سے پیش کرتے
 ہیں۔ بعض دفعہ گھر میں خادموں کے ہوتے ہوئے میں نے بچوں کو خوش خوش
 یہ خدمت کرتے دیکھا۔ بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ لڑکیوں کی تربیت میں مدرسہ
 کی خواندگی اور سینے پر رونے کی پڑمائی کے ساتھ خانہ داری کی تعلیم بھی شامل ہو۔ اور
 وہ ما باپ کا ہاتھ بٹانے میں لڑکوں سے زیادہ مستعدی دکھاتی ہیں۔ اس صفت
 میں وہ یورپ کے خوشحال گھروں کی لڑکیوں سے بہتر ہیں۔ ہستانبول میں اُنکی
 ظاہری صورت بہت بار پوشش اور وضع کے بالکل یورپ کی لڑکیوں کی سی ہر بچپن
 میں سر پر دوپٹہ نہیں جوتا۔ ایک کھلا سا جامہ یورپی قطع کا زیب تن ہوتا ہو۔ بالوں
 میں ٹوٹا اور جرابیں۔ اُن کی تعلیم میں بھی بہت سی باتیں یورپ کے طریق پر ہیں۔
 مثلاً موسیقی کا سبق اُن کے نصاب میں موجود ہے۔ فرانسیسی زبان بھی سمجھتی
 ہیں۔ اس پر وہ یورپ کی اکثر خوشحال لڑکیوں کی طرح کھانے پکانے گھر بار کی خبر گیری

اور بزرگوں کی خدمت اور بچوں کی نگہداشت کے فرائض سے بے بہرہ نہیں تھیں۔ عثمانی اس عہد مشرقی ہول پر کار بند ہیں کہ لڑکیوں کو اپنے گھر میں جس قدر محنت اور کام کلج کی عادت ہو جائے۔ اسی قدر ان کے لئے مفید ہے جب بیابائی ہو جائے اور اپنا گھر بار بنائیں گی۔ تو یہ مشق ان کے کام آئے گی۔

ہمارے دوست جلال بے کی ایک صاحبزادی کوئی نو سال کی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ اس کی خواندگی دیکھئے۔ سب مضامین میں اس نے معقول امتحان دیا۔ آخر ہم نے اس سے کہا کہ قرآن مجید بھی تھوڑا سا سناؤ۔ وہ پہلے ننگے سر بیٹھی تھی۔ دوڑ کر دوپٹے لے آئی اور دوپٹے سے اپنی پیشانی تک ڈھانپ کے اس نے قرآن پڑھنا شروع کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرنگیوں کی ہمسائیگی اور دیگر اثرات سے گو بہت سی عادات اہل یورپ کی چپکے چپکے عثمانیوں میں گھس آئی ہیں اور آتی جاتی ہیں۔ مگر اسلام کی خوبیاں ان کے دل میں بہستور جاگزین ہیں۔ اور وہ قرآن کی عظمت۔ اسلامی عبادات اور معتقدات میں کسی دوسرے ملک کے مسلمانوں سے کم نہیں۔ نماز روزے کی تلقین بچوں کے ہوش سنبھالتے ہی شروع کی جاتی ہے۔ اور اکثر اوقات اللہ عزوجل کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے۔ نوجوانوں جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں جتنی تعداد نماز ادا کرنے والوں کی ترکوں میں مل سکتی ہے۔ شاید اور کہیں نہ مل سکے گی۔ اور عورتیں چونکہ ہر جگہ مذہبی امور میں مردوں سے زیادہ محتاط ہوتی ہیں۔ اس لئے عثمانیوں کی مذہبی تعلیم بچی ہوئی لڑکیوں میں بھی نماز روزے کا چرچا ہے +

سے ترک ہیں کسی لڑکی کا ذکر کرتے ہیں تو اسے کہتے ہیں اور روم کے کو محمد دم۔ یعنی آپ کا صاحبزادہ۔ کہنے کی بجائے کہیں گے آپ کا محمد دم۔ اور ابھی صاحبزادی کہنا ہوتا آپ کی گریہ ۱۵

تعلیم نسوان

بچوں کی تربیت کی جس خوبی کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ تعلیم یافتہ
 اہل بہنوں کے بغیر ناممکن ہو۔ اور یہ عثمانی عورتوں کے تعلیم یافتہ ہونے کا ہی نتیجہ
 ہے کہ ان کے بچے ایسے سبھے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں یہ بات عملی طور پر مسلم ہو
 کہ عورتوں کی تعلیم ویسی ہی اہمیت رکھتی ہو جیسے مردوں کی تعلیم۔ صرف درجے کا
 فرق ہے۔ عام طور پر زنانہ مدرسوں کی تعلیم مضامین کے لحاظ سے ہمارے ہاں کے
 ہائی سکول کے برابر سمجھنی چاہئے۔ اور سینا پرونا کا ڈھنا۔ نقاشی۔ موسیقی وغیرہ
 فنون کے علاوہ ہیں اور باقی مضامین کے ساتھ ساتھ سکھائے جاتے ہیں۔ اس
 دیر کے مارج کی تعلیم کے لئے کوئی مدرسہ یا کالج عورتوں کے لئے نہیں ہو۔ لیکن
 بعض مراجو اپنی لڑکیوں کو یورپ کے اونچے گھروں کی لڑکیوں کے برابر تعلیم یافتہ
 دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ یورپ سے استانیاں منگو کر گھر میں انہیں پڑھاتے ہیں اور
 وہ لڑکیاں فرانسیسی یا جرمن زبان میں نہایت محقول دستگاہ پیدا کر لیتی ہیں۔
 وہ ان زبانوں کے ادبیات سے عمدہ واقفیت رکھتی ہیں۔ گویا وہ مشکل اور فک مطلب
 مضامین سے آشنا نہیں ہوتیں۔

ایک دن اتفاق سے میں اپنے ایک دوست کے گھر ایک فارغ التحصیل لڑکی کی
 معلومات کا اندازہ کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ لڑکی مدرسے کی تعلیم دو سال ہوئے ختم
 ہو چکی ہے۔ اولاً بستانانی ہے۔ لڑکیوں کے ایک مدرسے میں معلمہ دوم ہو۔ اس دن

اپنی بڑھیا والدہ کے ہمراہ ہمارے دوست کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ وہ اس مرے کے
نگراں ہیں۔ اُن سے کچھ کہنا سنا تھا۔ اس نے اپنی سند ساتھ لائی تھی۔ ہمارے
دوست نے وہ سند ہمیں لا کر دکھائی کہ اس سے معلوم ہو کہ کن کن مضامین میں اُستانی کی مثال کریں۔
صاحب نے امتحان دیا ہے۔ دیگر مضامین کے علاوہ تاریخ۔ جغرافیہ حساب۔ عربی فاضلہ تعلیم کے مشق
اور فریسی سب اُس سند میں درج تھے۔ ہم نے کہا خاصی جامع تعلیم ہے۔ مگر دریافت کیا کہ ایک
کیا کہ ان مضامین میں کس درجے کی مہارت اسے حاصل ہے۔ انہوں نے کہا۔ یہ آپ باطلت کلمہ
خود دریافت کر سکتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ کیسے۔ انہوں نے کہا ہم اُستانی کو اور اس کے کچھ
ماکو اوپر بلائے لیتے ہیں۔ میں نے حیران ہو کر کہا کہ وہ پردہ دار ہیں کیسے ایسا فرستے وہ
انہوں نے کہا۔ اُنکی والدہ تو ضعیفہ ہیں۔ اب منہ چھپا کر نہیں پھرتیں۔ اور تہہ ناس کا انہوں
صاحبہ ابھی بن بیاہی لڑکی ہیں۔ اُنکے لئے بھی منہ چھپانا ضروری نہیں۔ مجھے اب اور ان کی قیادت
دستور کا پہلے علم نہ تھا اور میں بازار میں بعض اوقات چند نقاب پوش عورتوں کو ملازمت
کسی ایک دھ کو بے نقاب دیکھ کر متعجب ہوتا تھا اور یہ سمجھتا تھا۔ کہ یہ پردہ کی پرہیزگار۔ اطمینان
کرتیں۔ لیکن معلوم ہوا۔ کہ ترکوں میں لڑکی جب تک بیاہی نہ جلتے اُس وقت تک مجھے حضرات
ہے کہ منہ پر نقاب نہ ڈالے۔ فراجہ اوڑھے رہنا اس کے لئے کافی ہے۔ کہ اسے اچھا کہندے
بہت ہی حیا دار ہوئی اُس نے نقاب گر لیا۔ ورنہ جو نہ گراے اس کا عمل خالص ہوتا تھا کہ اس
رواج نہیں۔ پردہ عثمانیوں میں اول تو دیر سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی بارہ سال سے عورتوں کو
برس تک توڑ کی محض سر پر دوپٹہ لیکر باہر نکل سکتی ہو۔ اور اس کے بعد فراجہ پہننا شروع فرماتی ہے
کرتی ہے۔ چہرے کا پردہ اہل میں بیاہ کے بعد شروع ہوتا ہے۔
وہ اُستانی صاحبہ آئیں اور اُن کی والدہ بھی ساتھ تھیں۔ اسلام علیکم کہ انہوں نے

ولیکم السلام۔ ہم نے تکلیف دہی کی سعادت چاہی اور کہا کہ مدعا اُن کا امتحان نہیں۔ بلکہ
مردِ تعلیم نوان کا اندازہ کرنا مقصود ہے۔ انہوں نے کہا۔ آپ بے تکلف جس مضمون
کے متعلق چاہیں سال کریں۔ میں اپنی واقفیت کے مطابق جواب دوں گی۔ اور اس سے اگ
کچھ آپ کو عام تعلیم کے متعلق قیاس کرنے میں مدد مل سکے تو میں خوش ہوئی گی۔ ہم نے
پہلے انہیں حساب کا ایک سوال دیا جو انہوں نے سیاہ بورڈ پر ہمارے روبرو حل کیا۔
پھر ایک عربی عبارت لکھوائی اور اس کا ترجمہ پوچھا۔ پھر فارسی کے چند فقرے پوچھے۔
پھر فرانسیسی کے۔ کچھ نام جغرافیہ میں ہندوستان کے شہروں کے پوچھے اُن کی
سمت وغیرہ سے وہ واقف تھیں۔ ہمارے دوست نے ایک آدھ سوال تاریخ عثمانی
کا پوچھا۔ اُس کا انہوں نے خاطر خواہ جواب دیا۔ اس کے بعد ہم نے اُن کا شکریہ
دا کیا اور اُن کی قابلیت کی تعریف کی۔ انہیں دیکھ کر اور اُن سے معلوم کر کے کہ
سب اُستانیوں کو ملازمت ملنے سے پہلے وہی سند حاصل کرنی پڑتی ہے جو اُن کے
پاس تھی۔ یہ اطمینان ہوا کہ تعلیم نوان استانبول میں اچھے ہاتھوں میں ہے۔

جتنے حضرات سے میری ملاقات استانبول میں ہوئی۔ قریب قریب سب نے
مجھ سے پوچھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم نوان کی کیا حالت ہو جس سے
معلوم ہوتا تھا کہ اس مسئلے کے ساتھ انہیں بہت دلچسپی ہو۔ پرانی وضع کے علی ایک
کو میں نے عورتوں کی تعلیم کی ضرورت پر متفق پایا۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ اُن میں
سے اکثر فرانسیسی وغیرہ کا سبق عورتوں کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ اور انکے
ہم خیال عورتوں کی تعلیم کے اس پہلو کو مضر سمجھتے ہیں۔ سال گذشتہ کے اوائل
میں استانبول میں ایک ناگوار واقعہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ وہاں کے ایک اچھے گھر کی

دو جوان لڑکیاں جن کا باپ ایک معزز عہدہ دار ہے۔ اور جس نے نئے خیالات
 کے سبب انہیں فرانسیسی معبد کی شاگردی میں دیا تھا۔ آزادی کے شوق میں
 فرانس کو بھاگ گئیں۔ شاید فرانس کی آزادانہ زندگی کے حالات پڑھ کر انہیں
 پردہ میں رہنا دشوار معلوم ہوا۔ انہوں نے کسی ذریعے سے دو فرانسیسی
 سے رسم و راد پیدا کی اور گھر چھوڑ دیا۔ ماما پر جو مصیبت گزری ہوگی۔ اس کا
 تو کیا ٹھکانا ہے۔ وہ اپنی دوسری بہنوں کے حق میں بھی کانٹے بونگیں اور
 اور ان کے اعتبار میں فرق ڈال گئیں۔ مگر خوش قسمتی سے ایسے واقعات
 شاذ ہیں اور ان سے یہ قیاس کر لینا درست نہ ہوگا۔ کہ سب عورتیں جو فرانسیسی
 پڑھ سکتی ہیں۔ ایسی ہیں۔ یا اپنی حالت سے بیزار ہیں۔ فرانسیسی پڑھنے والی
 عورتوں کی تعداد وہاں بہت ہے۔ اور ان میں بہت سی عورتیں اپنے
 شوہروں کی وفادار بیویاں اور اپنے والدین کی وفادار لڑکیاں ہیں۔
 جو مرنا قبول کریں۔ مگر اپنی آبرو اور اپنے بزرگوں کے ناموس پر کوئی ہتھیار
 نہ آنے دیں۔ البتہ آزاد خیالی یورپ کے اکثر اوجہات میں پائی جاتی ہے
 اور فرانسیسی میں اور زبانوں سے بڑھ کر ہے۔ یہ اپنا اثر کئے بغیر
 نہیں رہتی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ استانبول میں ہندوستانیوں کی طرح
 بہت سے نو تسلیم یافتہ زن و مرد پردہ کی قید سے قطعی آزاد ہونے کے
 آرزو مند ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے یورپین دوستوں کی طرح اپنی بیویوں
 کو ساتھ لے کر سیر کو نکلیں۔ مگر بادشاہ وقت کا رعب مانع ہے۔ جو موجودہ
 صورت پردہ کی استانبول میں قائم ہے۔ وہ تو ملکی رواج کی منظوری پانچویں

ہے اور اس پر نہ وہاں کے علما کو اعتراض ہے نہ سلطان المعظم کو۔ لیکن یہ سب کو
 فحی طرح معلوم ہے۔ کہ اگر اُس حد سے کوئی گزرنا چاہے تو نہ صرف کثرت
 اس کے خلاف ہوگی۔ بلکہ حکومت کی طرف سے اعتراض ہوگا۔ اس لئے
 وہ اپنے خیال کے مطابق عمل کرنے کی جرات نہیں کرتے۔ آزادی کے
 اس میدان کو دیکھ کر جو لوگ تعلیم سے گھبراتے ہیں۔ انہیں یہ یاد رکھنا چاہئے۔
 کہ ایک حد تک تو زمانے کی ہوا ہے۔ جو پڑھے ہیں اُن کو بھی لگتی ہے
 اور جو نہیں پڑھے اُن کو بھی لگتی ہے۔ یورپ والوں کا ستارہ آج کل زبردست
 ہے۔ دُنیا بھر میں اُن کی ہر ادا مقبول ہوئی جاتی ہے۔ جتنے ادھوری اور کچی
 تعلیم کے لوگ ہیں وہ تقلید کے قدرتی شوق سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور
 جتنے ذی علم اور غیور لوگ ہیں وہ باوجود علوم جدیدہ کی تحصیل کے اکثر امور میں
 اپنے تمدن کی خوبیوں کے معترف ہیں اور کوئی ترمیم یا تغیر بغیر اشد ضرورت یا
 نہایت معقول وجوہات کے نہیں کرتے۔

عثمانی عورتیں کتابوں کے سوا اخبارات اور سالے بھی بکثرت خریدتی اور
 پڑھتی ہیں۔ اور اس طرح ملک کے اجندات کی اشاعت بڑھانے میں مردوں کے
 شریکِ حال ہیں۔ اُن کا سیر کرنے یا خرید و فروخت کے لئے باہر نکلنا بھی انہیں
 گورہیش کی دنیا کی خبر دیتا رہتا ہے۔ اور یہ کہنا بالکل مبالغہ نہیں کہ تعلیم اور
 واقفیت عامہ کے لحاظ سے عثمانی خواتین آج کل اسلامی دُنیا کی پیشرو ہیں۔

عثمانی معاشرت

عثمانیوں کے ہاں تربیتِ اطفال اور تعلیمِ نسواں پر جو توجہ ہے اُس کا اثر اُنکی عام معاشرت پر صاف نظر آ رہا ہے۔ اُن کی معاشرت بہت سی باتوں میں ایشیا اور یورپ دونوں کے تمدن کی جامع ہے۔ اور قدرت نے جغرافیائی اعتبار سے جو جگہ ایشیا اور یورپ کے درمیان اُن کے وطن کو دی ہے۔ وہی صورت اُن کی عادات اور طریقِ بود و باش میں پیدا ہو گئی ہے۔ یعنی مشرق و مغرب کے بین بین۔

استانبول میں عثمانیوں کا لباس عموماً یورپ کا لباس ہے۔ عہدہ دارانِ مُلک و سرکاری۔ اور جدید تعلیم یافتہ اور سب کے سب تجارتِ پیشہ لوگ اکثر کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ فقط علما اپنی پرانی وضعِ نہانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اُن کے لباس میں بھی بعض چیزیں مغرب سے گھس گئی ہیں۔ البتہ سر کی پوشیدہ میں سب عثمانیوں نے دیگر اقوامِ یورپ سے اپنے آپ کو آج تک علیحدہ رکھا ہے اور یورپ کی بڑی ٹوپی کو اختیار نہیں کیا۔ استانبول میں ایک مسلمان بھی ایسا نہیں جو موجودہ یورپ کی ٹوپیوں میں سے کوئی ٹوپی پہنتا ہو۔ بلکہ حکومت کے رعب اور اثر کی وجہ سے میٹار عیسائی ایسے ہیں جو ترکی ٹوپی پہنتے ہیں۔ کوٹ عموماً لنبیا پسند کیا جاتا ہے۔ اور بہا اوقات وہ جس میں گلا کھلا نہیں رہتا۔ یہ لباس دفاتر اور عدالتوں میں جانے اور کاروبار کی مصروفیت کے لئے ہے۔ اس کے بعد جب شام

ایک ترک خاتون



ترکی برقعہ



میں کو بار بار سے

پہنچے دیکھو کہ

میں نکل کے اور

میں نکل کے

میں نکل کے

میں نکل کے

میں نکل کے

میں نکل کے

میں نکل کے

میں نکل کے

میں نکل کے

میں نکل کے

میں نکل کے

میں نکل کے

میں نکل کے

میں نکل کے

میں نکل کے

میں نکل کے

میں نکل کے

ہوتی ہے اور لوگ کاروبار سے فارغ ہوتے ہیں تو عثمانی اپنے آرام و ایشیائی کپڑے پہن لیتے ہیں۔ جسے دیکھو ایک لمبا سا چوغہ جو ٹخنوں تک پہنچتا ہے۔ پہنے ہوئے کھڑا ہو۔ چوغہ مختلف رنگوں کے اور بہت خوشنما ہوتے ہیں۔ یہ گویا عثمانیوں کا رختِ خواب ہو۔ علیحدہ رختِ خواب رکھنے کی عادت انگریزوں اور دیگر اہل یورپ میں بھی موجود ہے۔ مگر عثمانیوں کی رسم میں اور انگریزی رسم میں فرق یہ ہے۔ کہ انگریز رختِ خواب پہن کر باہر نہیں نکل سکتے۔ اور عثمانی اپنے ڈھیلے چوغے پہنے ہوئے شام کے وقت بازار میں بھی نکل آتے ہیں۔ مسجد میں چلے جاتے ہیں اور بڑے مختلف دوستوں کے ہاں ملاقات کو بھی جاسکتے ہیں۔

اکثر گھروں میں عورتوں کا لباس یورپ کا لباس ہے۔ یہاں تک گرامر اور اہل دولت کے ہاں تو بیگمات کے کپڑے پیرس سے بنوائے جاتے ہیں۔ مگر اوپر سے ان کا پردہ پوشش برقعہ انہیں پھر ایشیائی بنا دیتا ہے۔ گویا اس برقعہ کی تراش خراش بھی ایسی ہو گئی ہے کہ اس کی قطع انگریزی گون کی سی نکلتی آتی ہے۔

مکانوں کی آرائش میں بھی دونوں رنگ پائے جاتے ہیں۔ ہر خوشحال عثمانی کے گھر میں اگر ایک آدھ کمرہ پرانے طریق پر آراستہ ہے تو ایک آدھ نئی طرز کا ہے۔ پرانی آرائش یہ ہے کہ دیواروں کے ساتھ ساتھ اونچی گدیئے دہشتیں ہیں۔ فرش پر اُمرار کے ہاں قالین بچھا ہے تو متوسطین کے ہاں نفیس بوریا۔ فرش کو عموماً پاک رکھتے ہیں کہ اس پر نماز ہو سکے۔ اس لئے وہاں جوتا پہنے ہوئے نہیں آتے۔ یا تو بوٹ کے اوپر موزے چڑھا لیتے ہیں یا وہ بوٹ پہنتے ہیں۔ جس کے آدھوں پاک گرگاہی سی چڑھی ہوتی ہو جو کمرہ میں داخل ہوتے وقت اُتار دی جاتی ہے۔ اور اس طرح اس کے اندر کا حصہ صاف

اور محفوظ رہتا ہے۔ اس لئے اس بوٹ کو پہنے ہوئے لوگ مسجد میں جا اور نماز پڑھتے ہیں۔
 عثمانی خورد و نوش کے طریق میں بھی مشرقی اور مغربی رواج کی طاوٹ نظر آتی ہے۔
 کھانا اب عموماً میز پر چنایا جاتا ہے۔ اور لوگ کرسیاں بچھا کر گر دیٹھ جاتے ہیں۔ ایک
 ایک صاف پلیٹ ہر شخص کے سامنے رکھی ہوتی ہے۔ اور میز کے وسط میں سب کھانے
 چُھنے ہوتے ہیں۔ یورپ میں عام طور پر ایک ایک کھانا لانے اور نوبت بہ نوبت
 پیش کرنے کا دستور ہے۔ مگر یہاں چُن دینے کا طریق مشرقی اور کھانے کا طریق
 مغربی کر دیا گیا ہے۔ اکثر جگہ چھری کا نٹا بھی میز پر دیکھنے میں آیا ہے۔ مگر بعض جگہ
 پیچھے اور کائے صرف کھانا بڑی رکابیوں سے نکالنے کے لئے برتے جاتے ہیں اور
 کھانے والے ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ کھانے میں ترکوں کی بعض چیزیں یورپ کے
 مذاق کے موافق ہیں۔ مثلاً اُبلّا ہوا گوشت۔ اور بعض ایشیائی مذاق کے مطابق
 مثلاً ترکاری کا سالن۔ لیکن ہندوستان کا سادہ مروج مصلح وہاں استعمال نہیں کیا
 جاتا۔ دو چیزیں استانبول میں بہت شوق سے کھائی جاتی ہیں۔ ایک دہی جسے ترکی میں
 یُغِرت کہتے ہیں۔ جو غالباً دہی لفظ ہے جو فارسی کتابوں میں جُغرات لکھا جاتا ہو۔
 اور دوسرے نمکین چاول۔ جن پر کھانے کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ایک آدھہ میٹھی چیز دسترخوان
 پر ضرور آتی ہے۔ اور سب کھانوں کے بعد میوے آتے ہیں۔ میووں میں انگور بہت
 کثرت سے ملتا ہے اور انگور کے موسم میں ہر کہ وہمہ انگور کھاتا دکھائی دیتا ہے۔ ہیر
 کے دسترخوان پر اگر کھانے کے بعد انگور تکلف کے ساتھ عمدہ پلیٹوں میں چنّا ہوا نظر آتا
 ہے تو غریب مزدور کے ہاتھ میں بھی اُس کا ایک بڑا سا خوشہ نان و پنیر کے ساتھ موجود
 کھانا رستوراں میں کھانا اور وہیں تقسیم یا آرام کے لئے بیٹھ رہنا یہ رواج بھی یورپ

سے آیا ہے۔ مگر جو رسوڑاں عثمانیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اُن میں غذا ایشیائی اور شت کا انتظام یورپی ہے۔ میز کرسی اور چھری کا نٹا تو موجود ہے۔ مگر شتری میں کباب سبج او کوئے دھر ہے ہیں۔ اور منہ میٹھا کرنا ہو تو فیرینی حاضر ہے۔ ترکاری کا سالن بھی ملتا ہے۔ روٹی البتہ وہی ملتی ہے جو یورپ بھر میں مروج ہے۔ جسے نان پاؤ یا ڈبل روٹی کہتے ہیں۔ ایک بڑی سی روٹی کا ایک ٹکڑا کاٹ کر ہر شخص کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ جتنے رسوڑاں اس قسم کے ہیں جہاں عثمانی زیادہ جاتے ہیں۔ یا جو عثمانیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اُن میں کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے اور منہ صاف کرنے کا سامان موجود رہتا ہے۔ یہ طریق اسلامی ہے۔ کیونکہ یورپ میں اگر ہاتھ صاف ہوں تو کھانے سے پہلے انہیں دھونا ضروری نہیں سمجھا جاتا اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے یا منہ صاف کرنے کا تو رواج یورپ میں بہت ہی کم ہے۔ نہایت پر تکلف موقعوں پر کھانے کے بعد بلوری پیالوں میں بھوڑا بھوڑا پانی کھانے کے اختتام پر حاضرین کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ اس میں ذرا انگلیاں ڈبو لیتے ہیں۔ کیونکہ وہاں سب چھری کانٹے سے کھاتے ہیں اور اس لئے انہیں ہاتھ دھونے نہیں پڑتے۔

عثمانیوں کی ایک خوبی قابلِ داد ہے۔ کہ بعض بے ضرر باتوں میں فرنگستان کی تقلید کرنے اور دن رات یورپ کی عیسائی اقوام سے ملنے کے باوجود انہوں نے آج تک بیشیبت قومی شراب سے پرہیز قائم رکھنے میں اپنے اسلام کی سختی کا ثبوت دیا ہے۔ یورپ بھر کے بڑے شہروں میں سے شراب کی فروخت سب سے کم متنبول میں ہے اور جو بچتی ہے اُس کے بھی صرف کرنے والے بیشتر ملک کے عیسائی باشندے یا

غیر ملکی عیسائی ہیں جو سٹان بول میں کاروبار یا ملازمت کے سلسلے میں مقیم ہیں۔ ترکوں میں بھی کچھ لوگ خصوصاً مغربی تعلیم پائے ہوئے یا طبقہ امرا میں ایسے ہیں جو شراب پیتے ہیں۔ مگر ان کو یہ مجال نہیں کہ وہ علانیہ شراب پیں۔ جو کوئی پیتا ہے چوری چھپی پیتا ہے۔ شہر میں بالعموم اور خاص کر اس حصے میں جہاں مسلمان آباد ہیں۔ شراب کبھی ہی نہیں۔ ہٹل والوں کے پاس البتہ موجود رہتی ہے۔ تاکہ وہ اپنے اُن گاہکوں کو جو کھانے کے ساتھ شراب کے استعمال کے عادی ہوں۔ وقت پر مہیا کر دیں۔ یورپ بھر میں شراب کے استعمال کی کثرت ایک ایسی وبا ہے۔ جس کا زہر ملا اثر وہاں کے دور اندیش عرصے سے محسوس کر رہے ہیں اور اپنی قوموں کے مستقبل سے بہت خائف رہتے ہیں۔ کہ اگر اس بلا کا یہی زور رہا تو یہ ضرور روز بد دکھائیگی۔ عثمانیوں نے یہ کو یہ شعارِ اسلامی نباہنے سے کئی قسم کے فائدے ہوئے ہیں۔ جن میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اُن کی سپاہِ صوفی سپاہی اور اُن کے عسکریوں کی بہادری۔ شراب سے جوش میں لائے جانے کی محتاج نہیں۔ اور اس پر ایسی ہے۔ کہ دین بول جھٹلے پینے والے بہادروں کے نشے اُتار دیتی ہے۔

جہاں شراب سے عثمانیوں نے پرہیز کی ہو۔ وہیں تباکو کے استعمال میں گرا تو اب بھی تصویر یورپ کو بھی مات کر دیا ہے۔ تباکو کا استعمال یوں تو دنیا بھر میں عام ہو رہا ہے۔ لیکن یورپ میں اب اس شکل سے کوئی چیز خیال میں آسکتی ہو جو اس قدر ہر دلعزیز ہو۔ لیکن یورپ میں اب اس اس کار واج ہمیشہ مجموعی اشیاء سے زیادہ ہے۔ باوجود اس کے کہ وہاں ہر مسلمان ملک میں تباکو پر بہت بھاری محصول کا بوجھ ہے اور اس لئے بہت گراں بیکتا ہے۔ لیکن پھر بھی غریب امیر سب اس کے دلدادہ ہیں۔ اور غربا اپنی محدود آمدنیوں کا ایک

معتول حصہ سگرٹ اور تبا کو پر صرف کر دیتے ہیں۔ ٹرکی میں تبا کو دیگر ممالک یورپ
 نے نفیس تر بنتا ہے اور ٹرکی کے تبا کو کی یورپ بھر میں دھوم ہے۔ مگر باوجود اس
 شہرت کے اتنا باہر نہیں جاتا۔ جتنا ملک کے اندر خرچ ہوتا ہے۔ کیونکہ ملک میں شخص
 اس کا فدائی ہے۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں علمائے دین اور دیگر مقدس لوگ بالعموم
 تبا کو سے پرہیز کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے ٹرکی میں بڑے بڑے علما بھی اس شوق
 سے خالی نہیں۔ خود سگرٹ پیتے اور مہمانوں کو پلاتے ہیں۔ اور بہت ہی شاذ ہی
 کو کوئی شخص اس کی عادت نہ رکھتا ہو۔ سگرٹ کو ٹرکی میں جغارہ کہتے ہیں۔ لفظ
 سگر کی صورت بدل کر اس کی تصغیر بنالی ہے۔ اور جہاں جاؤ۔ جغارہ پہلے لاکر سامنے
 رکھ دیا جاتا ہے۔ مجھے جب کبھی عذر کرنے کا اتفاق ہوا تو میرے عثمانی میزبان عموماً
 نہایت ہی تعجب سے پوچھتے تھے: ”کیا تمہارے ہاں لوگ جغارہ نہیں پیتے؟“ میں
 کہتا تھا۔ ”ہمارے ہاں بھی بہت اس کے شائق ہیں۔ مگر آپ سے کم۔ اور میں اُن
 لوگوں میں ہوں۔ جنہوں نے نئی تہذیب کا یہ تغہ نہیں چلایا۔“ زیادہ قابل افسوس بات
 یہ ہے کہ عثمانی خواتین میں بھی جغارہ کا رواج بہت ہے۔ اہل یورپ کسی ترک خاتون
 کی جب کبھی تصویر دکھاتے ہیں۔ خواہ کہانیوں میں۔ خواہ شیخ پر۔ اور خواہ تصویر خانوں
 کی دیوار پر۔ ہمیشہ اس کے ہاتھ میں جغارہ ہوتا ہے جس سے دھواں نکل رہا ہوتا ہے۔
 ممکن ہے وہ اس میں کچھ مبالغہ کرتے ہوں۔ لیکن خود عثمانیوں نے یہ شکایت مجھ سے
 کی۔ کہ مستورات میں یہ عادت بہت بڑھ گئی ہے۔ یورپ کے دوسرے ممالک میں
 بھی بعض عورتیں کبھی کبھی سگرٹ کا شوق کرتی ہیں۔ مگر سوائے بعض بیباک عورتوں کے
 علانیہ سگرٹ پینا لیدیوں کے لئے عیب سمجھا جاتا ہے۔ اور ب خواتین مردوں کے

روبروسگرٹ پینے سے رکتی ہیں۔ اور مردیہ احتیاط کرتے ہیں کہ جہاں خواتین جمع ہوں۔ وہاں اول تو سگرٹ پیتے نہیں اور پس تو اُن سے معافی اور اجازت مانگتے ہیں۔

قہوہ کا استعمال عثمانیوں کے ہاں شاید سگرٹ سے بھی زیادہ بڑا ہوا ہے۔ اور قہوہ کو بجائے خود ایسی بُری چیز نہیں۔ تاہم حد سے زیادہ کوئی چیز بھی اچھی نہیں ہوتی اور عثمانی قہوہ پینے میں بسا اوقات حد سے گذر جاتے ہیں۔ قہوہ یورپ میں انکی بدولت مقبول ہوا ہے۔ اور ترکی قہوہ شہرہ آفاق ہے۔ لندن کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانوں کی فہرستوں یا استہدات پر چلی حروف میں ٹرکش کافی لکھا ہوتا ہے اور پیرس میں شوق اس کا اور بھی زیادہ ہے۔ مگر وہاں اکثر لوگ دودھ ملا کر کافی پیتے ہیں۔ حالانکہ ترکوں میں بے شیر پینے کا زیادہ رواج ہے۔ بلکہ بہت جگہ تو شکر بھی نہیں ڈالتے۔ تیغ ہی پسند کرتے ہیں۔ ترکی میں جو پیالیاں قہوہ کے لئے مخصوص ہیں۔ وہ گوجھوٹی چوٹی ہوتی ہیں۔ تاہم لوگوں کے ہاں ملاقات کو آنے والے صبح سے شام تک تیس چالیس پی جاتے ہیں۔ عادت عجب چیز ہے۔ انہیں کوئی فوری نقصان نہیں ہوتا۔ ورنہ جسے عادت نہ ہو۔ اسے تین چار دفعہ قہوہ پینے سے منید آنے میں دشواری محسوس ہونے لگتی ہے۔

استانبول میں رہ کر قہوہ سے قطعی پرہیز نہ کر سکتا ہے۔ جب کوئی کسی سے ملنے جائے تو سب سے پہلی تواضع یہ سمجھی جاتی ہے۔ صاحب خانہ ابھی حرم سے نہ بھی برآمد ہوئے ہوں تو سلیقہ شفا ملازم خود ہی قہوہ لیکر آ موجود ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے۔ کسی نے ابھی ایک پیالی ختم کی۔ اتنے میں صاحب خانہ برآمد ہوئے۔ وہ آتے ہی سلام مزاج پڑی

کے بعد قہوہ منگوائینگے اور دوبارہ پیش کریں گے۔ اب انکار بھی کرو تو وہ اصرار کرتے ہیں اور پلا دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ”پلی بھی لیجئے۔ ایک ذرا سے قہوہ بے کیا ہوتا ہے۔“ اگر آپ کے رخصت ہونے سے پہلے اُن کا ایک آدھ ملاقاتی اور اگیا نواز نمبر قہوہ کا دور چلتا ہے۔ غرض قہوہ اور جھارہ۔ نوبت بہ نوبت پیش ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی گھر میں ہو یا دفتر میں۔ دوست کے مکان پر ہو یا رسٹوراں میں۔ بعض پرانی وضع کے لوگ رسٹوراں میں جا کر نارگیدہ کا بھی شوق کرتے ہیں۔ یہ ہمارے پیچوان کی سی چیز ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ حقہ تانبے یا پتیل کے بجائے بلور کا ہوتا ہے۔ اور اس میں صاف پانی ہر وقت بدلا جاتا ہے۔ اور جب کوئی شخص پیچوان کو منہ لگاتا ہو تو بوری حقے میں پانی کے بلبے عجب بہلا دیتے ہیں۔

اخلاق و آداب میں عثمانی اب تک اپنے ایشیائی ہزرگوں کے پیرو ہیں۔ بلکہ انہوں نے پرانے آداب کی سادگی میں بہت کچھ تکلف پیدا کر دیا ہے۔ ہندوستان میں مکھنو تکلف کے لئے مشہور ہے۔ اور حیدرآباد کا تکلف بھی کچھ کم نہیں۔ مگر اسٹان بول میں جو تکلف آدابِ صحبت میں ملحوظ ہے۔ وہ ان دونوں سے بڑھ کر ہے۔ فرض کیجئے آپ ایک ایسے شخص کے ہاں جاتے ہیں جو عمر میں یا علم میں یا رتبہ میں آپ سے بڑا ہو آپ کو کہ میں داخل ہوتے ہی جھبک کر سلام کرتے ہیں۔ اور اُس کے ہاتھوں یا دامن کی طرف بڑھتے ہیں۔ کہ ہاتھ یا دامن کو ادب سے بوسہ دیں۔ وہ اپنا خلق یوں ظاہر کرتا ہے کہ اپنے ہاتھ یا دامن کو کھینچ لیتا ہے اور کہتا ہے ”استغفر اللہ“ یعنی آپ مجھے کیوں محبوب کرتے ہیں۔ میں اس قابل نہیں کہ آپ میرے دامن کو بوسہ دیں۔ اور آپ سے مصافحہ کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ گُرسی یا دیوان پر بیٹھ جاتے ہیں۔

اب صاحب خانہ اپنی کُرسی سے اُٹھ کر یا جھک کر سلام کو ہاتھ اٹھاتا ہے اور خیر مقدم کہتا ہے۔ اور آپ پھر اسی سلام کے شکر یہ میں سلام کرتے ہیں۔ اگر مجلس میں اور کچھ معززین حاضر ہیں تو آپ ان کو سلام کرتے ہیں اور وہ آپ کو۔ اس لمبی رسم کے ادا ہو چکنے پر قہودہ کی گلاس کے اور حجارہ کی باری آتی ہے اور پھر کہیں کوئی مطلب کی بات شروع ہوتی ہے۔ اس میں پندرہ ہر گیلہ شک نہیں کہ یہ رسوم پر لطف ہیں۔ مگر وقت کا بچہ خون کرتی ہیں۔ اور زمانہ ان میں بے ادب و سستی مٹھوڑی بہت ترسیم ضرور کر دیگا۔ گواہ تک ان کے قدردان کثرت سے موجود ہیں۔ مگر قصہ جو کوئی استانبول دیکھنے آتا ہے۔ اگر اُسے عثمانیوں سے ملنے جلنے اور ان میں باقاعدہ تعلیم کا بیٹھنے اُٹھنے کا موقعہ ہوتا ہے تو وہ ان کے اخلاق کا شاخاں جاتا ہے۔

عثمانی عورتوں کی حالت بھی وہی دونوں تمدنوں کے بین بین ہے۔ اُن کا لباس میں لڑکے بھی یورپی ہے۔ اور تعلیم بھی بہت کچھ یورپی۔ مگر جن مکانوں میں وہ رہتی ہیں وہ ایشیائی۔ یہاں عورتی ہر مکانوں میں پردہ کا پورا انتظام ہے۔ سب دیچوں میں لکڑی کے پتھر لگے ہوتے ہیں۔ اور مسلمان کا مکان فوراً اس نشان سے پہچانا جاتا ہے۔ مسورات میں سیر کے لئے نکلنے۔ ریل اور جہاز میں مستعدانہ سوار ہونے کی عادت مغربی ہے۔ تو قبور کی زیارت۔ فقر سے عقیدت مشرقی۔ شادی بیاہ میں ہندوستانی خواتین کے مقابلے میں انہیں ایک کمانی ہے کہ ان کے ہاں حلقہ انتخاب وسیع تر ہے۔ لیکن یہ شرط کہ شادی کے معاملے میں وہ اپنے والدین کے انتخاب کی پابند ہیں انہیں اپنی ہندوستانی جہنوں سے مساوات کا درجہ دیتی ہے۔ شادی بیاہ کی رسوم ترکوں میں ایسی پیچیدہ اور ایسی سُرفرانہ نہیں جیسی ہندوستانی مسلمانوں کے طبقہ اُمرا اور سُرفاں میں رواج پائی ہیں۔ اور اب شادی کے موقع پر کوئی بڑا جمع کرنے یا بڑی بڑی دعوتیں دینے کا بھی دستور

نہیں یا۔ کیونکہ ایک عرصہ سے استانبول میں بعض پوٹیکل وجوہات سے قریب قریب ہر قسم کے جمعوں کی بندش ہو۔ اور اسی سلسلے میں بڑی براتوں پر بھی قلم ختصار چل گیا ہے۔ مگر اس نے ترکوں کی مجالس کے لطف میں تو کمی کر دی ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس کے ساتھ بھی بہت کچھ مسدود ہو گیا ہے۔

لگانے بجانے اور موسیقی کا شوق ہر قوم میں کم و بیش پایا جاتا ہے۔ اور ترک کچھ اس پر متستہ نہیں۔ مگر قصہ سرود کی مجلسیں اُن کے ہاں عام نہیں۔ البتہ انہوں نے یہ موسیقی کی باقاعدہ تعلیم کا دستور اخذ کر لیا ہے۔ اور اسے لڑکیوں کے مدارس میں مضامین میں شامل کیا ہے چنانچہ اکثر تعلیم یافتہ لڑکیاں اس سے واقف ہیں اور اپنے گھر میں گاتی بجاتی ہیں کہیں کہیں لڑکے بھی موسیقی سیکھتے ہیں۔ مگر وہ بیشتر فوجی ملازمت کے لئے سیکھتے ہیں۔ اور فوجی بینڈ میں بھرتی ہو جاتے ہیں۔ ترکوں نے موسیقی کی کتابیں اپنی زبان میں یورپ کے نمونے بنائے ہیں۔ اور بینڈ میں ہر بجانے والے کے آگے موسیقی کے اشارات کی ایک کتاب تھی ہے۔ جسے دیکھ کر اپنے سرگروہ کی انگلی یا چھڑی کے اشاروں پر وہ چلتا ہے۔ ترکوں کی ان کتابوں سے فارسی یا اردو میں اشارات موسیقی بنانے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ کیونکہ ان میں زبانوں کے حروف وہی ہیں۔

شہر کے قریب سیر و تفریح کے لئے مکان بھی عثمانیوں کے ہاں بکثرت مروج ہے۔ مگر پھر بھی اس شغف کو نہیں پہنچ سکتا جو یورپ کے دیگر مقامات کے لوگ رکھتے ہیں۔ وہ تو دیوانوں و عمارتوں کے منتظر رہتے ہیں۔ اور جب موقع ملتا ہے تو لاکھوں گھروں سے باہر تفریح کے لئے نکل پڑتے ہیں۔ شہر سے باہر اپنے ملک میں سیاحت کے لئے جانا یا مالک غیر میں سیاحت کو نکلنا آج کل عثمانیوں میں نایاب ہے۔ اور یہ کچھ اُن کی مردہ دلی کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ

حکومت کی طرف سے نقل و حرکت کے متعلق سخت سوک تھا۔ ملک کے اندر ایک شہر سے دوسرے شہر تک جانے کے لئے رعایا نے عثمانی کو بھی تذکرہ عیسوی کی تاریخ کی کتاب پر وائے راہداری حاصل کرنا پڑتا ہے اسی وجہ سے ملک سے باہر جانے کے لئے تو اور بھی زیادہ باز پرس ہوتی ہے۔ پس اب یہ لوگ دوکان خانہ میں بیٹھے ہیں اور عیسائی ان اسی سے ان کی ترقی بہت کچھ لڑکی ہوئی ہے۔

تجارت اور صنعت کی طرف گو عام میلان نہیں ہے اور اکثر ملازمت سرکاری کو ہی ذریعہ عزت و دولت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہاں کے لوگوں میں تجارت اور صنعت کو اُس حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے جس کے سبب ہندوستان کی بعض جماعتیں مفلس اور تباہ ہوتی جاتی ہیں مگر تجارت اور صنعت کی طرف رجوع نہ کر تیں۔ استانبول میں معمولی دوکاندار کو بھی لوگ عزت سے بلاتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو عزت کا مستحق سمجھتا ہے۔ بہت سی دوکانوں پر خوش خط قلم لٹک رہے ہیں جن پر الکاسب جیب اللہ لکھا ہوا ہے۔ یعنی جو شخص کسی جائز پیشے سے روزا کماتا ہے خدا اسے دوست رکھتا ہے۔

غزنی فرائض کی پابندی ترکوں میں اکثر اور مالکِ اسلامی سے زیادہ ہے۔ خو لوگوں کو بھی خیال ہے اور سلطنت کی تائید بھی شامل ہے۔ جمعہ کی نماز بڑی دھوم سے ہوتی ہے۔ اور شہر بھر کی جامع مسجدیں اس دن بھری ہوتی ہیں۔ رمضان میں بڑا رونق اور سجاوٹ کہتے ہیں نہایت ہی قابل دید ہوتی ہے اور انٹاریوں کے جلسے نہایت پر لطف۔ بڑی بات یہ ہے کہ نئی روشنی کے لوگ۔ فرانسیسی تربیت پائے ہوئے عثمانی بھی ان فرائض سے غافل نہیں۔ نماز روزہ کے علاوہ اور

ذلیفہ کا یہاں بہت شوق ہے۔ اور پیر و جوان جسے دیکھو ہاتھ میں تسبیح لئے پھرتا ہے۔ یہاں تک کہ تسبیح ایک قسم کا فیشن ہو گئی ہے اور کئی لمبے لمبے کے طالب ایک خوبصورت قیمتی تسبیح ہاتھ میں رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اس عادت میں متاثر ہونے کے بہت سے عیسائی ان کے شریک حال ہیں۔



عیسائیوں سے تعلقات

[illegible]

مگر وہ شیل ترکی میں کرتے ہیں اور تماشائیوں میں مسلمان شامل ہوتے ہیں اور عیسائی بھی۔
تماشے میں پارٹ کرنے والی عورتیں سب عیسائی ہوتی ہیں۔ کوئی مسلمان عورت پارٹ نہیں کرتی
مگر یہ عیسائی عورتیں زبان دانی میں ترکی عورتوں کی تہ مقابل ہوتی ہیں اور عثمانی مستورات
کی زندگی کی تصویر خوب اتار سکتی ہیں۔

غیر ملکی عیسائی بھی ترکی کے دار الخلافہ میں بکثرت رہتے ہیں۔ کچھ تجارتی ضرورتوں
سے۔ کچھ تعلیمی اور مذہبی کاموں کے لئے اور کچھ سیاسی معاملات کے متعلق۔ ان
کی عادات میں اور ترکوں کی عادات میں بہت سافرق ہو۔ مگر ان عیسائیوں کے ساتھ
بھی استانبول میں عثمانیوں کی خاصی نہتی ہے۔ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بچتی
ہے۔ اور یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ترک اور عیسائی دونوں اس کوشش میں رہتے ہیں کہ
ایک میل جول با سانی جاری رہے۔ ایک طرف تو ترکوں نے ان لوگوں کو بہت سی
رعائتیں دے رکھی ہیں۔ اور دوسری طرف یہ لوگ بھی کسی قدر اپنا مزاج یہاں آ کر بدل
لیتے ہیں۔ فرانسیسی طبیعت تو سیال ہی ہے۔ ہر سانچے میں ٹھل جاتی ہو۔ مگر لطف یہ ہے کہ
جرمن اور انگریز بھی استانبول میں ذرا نرم ہو جاتے ہیں۔ انگریزوں کی نسبت یورپ
میں ایک مثل مشہور ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی اگر طرکی یہ حالت ہو۔ کہ جہاں انکی
حکومت نہ بھی ہو وہاں بھی یوں اگر طر کے چلتے ہیں جیسے ساری دنیا ان کے زیرِ مین
ہے۔ مگر میں نے دیکھا کہ استانبول میں کیفیت نہیں۔ بازاروں اور سڑکوں پر چلتے
پھرنے میں جو مساوات حاکم و محکوم۔ مسافر و مقیم میں یورپ کے بڑے شہروں میں نظر
آتی ہے۔ وہی نظارہ استانبول کے بازاروں۔ گلی کوچوں اور پلوں پر نظر آتا ہو۔ غریب
امیر۔ مسلمان۔ عیسائی۔ یہودی اور گبر سب ایک دوسرے کے ساتھ چل رہے ہیں۔

اور کوئی دوسرے سے تعرض نہیں کرتا۔ انگریز جو من اور فرانسیسی وہاں یہ توقع نہیں تھے کہ کوئی اُن کے لئے راستہ چھوڑے اور نہ کسی کو نا ملائم الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔ اور ٹُرک بھی اُن پر کسی قسم کا تسلط نہیں کرتے۔ اور یہ دستور ترکوں میں کچھ اب سے نہیں۔ کہ کوئی سمجھے۔ کہ ٹُرک سیاسی کمزوری سے نرم ہو گئے۔ بلکہ اس بارے میں وہ ہمیشہ معقول اور آزاد خیال رہے ہیں۔ اور اپنے اقتدار کے زمانے میں انہوں نے بڑی بڑی رعایتیں عطا کی ہیں۔

ملکی عیسائیوں سے جو رعایتیں ٹُرکوں نے کی ہیں۔ اُن میں سب سے اول یہی ہے۔ اور وہ بھی ایسے وقت میں جب دُنیا میں بہت کم ایسے حصے تھے جہاں یہ خیال موجود تھا۔ ارمینی اور یونانی دونوں گرجے اُس زمانے سے آج تک بالکل آزاد اور اپنے اندرونی انتظام میں خود مختار چلے آتے ہیں اور اُن کے باہمی تنازعات جب ناگوار صورت اختیار کرنے لگتے ہیں تو اُس وقت ٹُرکوں کا زبردست ہاتھ اُن کے درمیان آکر بیچ بچاؤ کرتا اور انہیں خونریزی سے روکتا ہے۔ ان دونوں فریقوں کے بڑے بڑے قیس اور رہنما اب تک انعامات۔ تمغے اور جاگیریں پاتے ہیں۔ دوسری رعایت جو اُن کے ساتھ کی گئی یہ تھی کہ صیغہ فوج کے سوا باقی سب صیغوں میں انہیں ٹُرک کے برابر حقوق دیئے گئے جس کا نتیجہ ہے کہ اس وقت بہت سے مناصب جلیلہ پر عیسائی ممتاز ہیں۔ ٹُرکی کے سفیر اور تفصل بہت سے عیسائی ہیں اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں۔ اور اُن پر اسی طرح اعتبار اور اعتماد کیا جاتا ہے۔ جیسے کسی ٹُرک پر کیا جاتا۔ علوم و فنون کے مکاتب میں اور تمام اُن خیراتی کارخانوں میں جو سلطنت کی طرف سے قائم ہیں۔ عیسائیوں کے حقوق کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔ کئی باتوں میں عیسائی

مقابلہ ترکوں کے آرام میں ہیں۔ اور اُن کے امور میں اس قسم کی مداخلت نہیں ہوتی جیسے ترکوں کے معاملات ہیں۔ مثال کے طور پر تعلیم کو لیجئے۔ ترکوں کی تعلیم مکاتب سرکاری میں اُن قواعد کی پابندی سے ہوتی ہے۔ جو اس بارے میں نافذ ہیں۔ اور اُن کے لئے چند قیود موجود ہیں۔ کہ فلاں علوم پڑھیں اور فلاں علوم نہ پڑھیں۔ خاص کر سب ایسی کتابیں اور مضامین جن سے لوگوں کے مذہبی۔ تمدنی یا سیاسی خیالات میں آزادی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ نصاب درسی سے خارج ہیں۔ برعکس اس کے عیسائیوں کے مدرسے میں کوئی اس قسم کی قید نہیں لگائی گئی۔ چنانچہ متعدد مدارس عیسائی بچوں کے لئے استانبول میں ہیں۔ جہاں ہر قسم کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اس حکمت عملی کی وجہ کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اور اس کا نتیجہ ملک کے حق میں بظاہر مضر ہو رہا ہے۔ ایک طرف عیسائی رعایا کی آئندہ نسل نہایت آزادانہ خیالات کی تعلیم حاصل کر رہی ہو اور دوسری طرف ترکوں کی فطرتی آزادی بھی مٹائی جا رہی ہے۔ اُن تعلیم کاہلوں میں جو عیسائیوں نے ملک کے عیسائی بچوں کے لئے قائم کی ہیں۔ سب سے بڑی تعلیم گاہ رابرٹ کالج ہے۔ اور یہ کالج کئی وجوہ سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جس پہاڑی پرنسپلطان محمد فاتح کی شہور یادگار روم ایل حصار کے کھنڈر ہیں۔ اُس پہاڑی کی چوٹی پر قلعہ سے ذرا اوپر اس کالج کی رفیع عمارت اور اس کے ساتھ ایک وسیع میدان ہے۔ امریکا کے ایک دولت مند رابرٹ نامی کی فیاضی سے یہ کالج قائم ہوا ہے۔ اور اس کا منتظر مالک عثمانی کے عیسائی نوجوانوں کی تعلیم ہے۔ اس کے ساتھ ایک عالیشان بوڑنگ ہوٹل بنا ہے۔ اور اس میں قریب چار سو طالب علم رہتے ہیں۔ جن میں بہت سے رعایائے عثمانی ہیں اور کچھ طالب علم گرد و نواح کی ریاستوں سے بھی آئے ہوئے ہیں۔

یہ سب انگریزی پڑھتے ہیں اور دیگر اسنہ یورپ بھی حسب پسند سیکھتے ہیں۔ علوم فنون
جدیدہ میں اکثر کلاس درس یہاں دیا جاتا ہے۔ مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ طلبہ سیاسی
جنگ کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ میں نے اس کالج کا کتب خانہ دیکھا۔ اس میں
دنیا بھر کا روایتی لٹریچر ہے۔ یعنی وہ کتابیں جو مختلف ممالک کے حصول آزادی
کی داستانیں بیان کرتی ہیں اور یہ سکھاتی ہیں کہ فلاں زبردست سلطنت کس طرح لکھڑ
کے پھینک دی گئی۔ اور اس کالج کے طلبہ عموماً اپنا مقصد زندگی یہ سمجھتے ہیں کہ تحصیل علم
سے فارغ ہو کر وہ اپنی ہمت عیسائی اقوام شرق کو مطلق العنان کرنے میں صرف کریں گے
اور اس کالج والے علانیہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بلغاریوں کو جن لوگوں کی ہمت سے
آزادی حاصل ہوئی ہے۔ وہ یہیں کے تعلیم یافتہ تھے اور اب جو نئے لوگ پیدا ہونگے
وہ باقی ماندہ اقوام کو ترکوں کی حکومت سے کالیں گے۔ یہ کالج کوئی چالیس سال سے جاری
ہے۔ جب یہ قائم ہوا۔ اس وقت فرمان سلطانی سے اس کے بنانے کی اجازت دی گئی
تھی اور اس کے زمین عطا ہوئی تھی۔ اس بے تعصبانہ روش کا اب یہ انعام مل رہا ہے کہ
اس کالج کی تعلیم کا خاص منشا عثمانیوں کی مخالفت ہو۔ مگر حکومت عثمانیوں کی طرف
سے عیسائیوں کے حق میں نرمی کا برتاؤ برابر جاری ہے۔



عثمانیوں کی عام حالت

اب عثمانیوں کی عام حالت پر ہم ایک مجموعی نظر ڈالنا چاہتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے کہ حیثیت ایک حکمران قوم کے اُنکے دُنیا میں باقی رہنے کی اُمید کجا سکتی ہو یا نہیں۔
 ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُن کی موجودہ تعلیمی حالت اگر بہت عمدہ نہیں تو چنداں بُری بھی نہیں۔
 تعلیم کو بڑے اعلیٰ اور وسیع پیمانے پر نہ ہو۔ مگر ایک عرصے سے ملک کے ہر حصے میں جاری ہے اور علم کے ہر صنف کا درس قلم و سُلطانی میں موجود ہے۔ دینیات کی تعلیم سے بہت لوگ بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ تعلیم جدید اور تعلیم السنۂ غیر بھی خاصی اچھی حالت میں ہیں۔ طب جدید میں عثمانی بہت معقول ترقی کر رہے ہیں۔ صنعت و حرفت کی تعلیم بھی کئی جگہ ہوتی ہے۔ فنونِ لطیفہ کی طرف بھی توجہ ہے۔ صیغہ تحریر کی تعلیم بہت مشکل ہو اور صیغہ تحریر کا بھی ایک کالج موجود ہے۔ اور ان سب باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہو کہ ترک کچھ نہ کچھ ترقی کر رہے ہیں۔ ہر چند کہ اس ترقی کی رفتار بہت سُست ہو اور وہ ترقی کی دوڑ میں اپنی ہمسارہ اقوام کے ہم قدم نہیں ہیں۔ لیکن اس سستی پر ہم ترکوں کو موردِ الزام قرار نہیں دے سکتے۔ جو طرزِ حکومت اُنکے ہاں مروج ہے۔ اس میں ترقی کی رفتار کا تیز سونا غیر ممکن ہے۔ نہایت سخت قواعد سے اُن کا بند بند جکڑا ہوا ہے۔ استانبول میں سوائے مذہبی مجالس کے کوئی جلسہ تعلیمی۔ تمدنی یا سیاسی ترقی کی کوشش کے لئے نہیں ہوتے اور نہیں ہو سکتے۔ قومی انجمنوں کا وجود ناپیدا ہے۔ یہاں تک کہ محض تجارتی اغراض کے لئے بھی کوئی بڑی کمپنی قائم کرنے کی اجازت ملنی مشکل ہے اور ممکن نہیں کہ حکومت اسے

شبہ کی نگاہ سے نہ دیکھے۔ ایسی صورت میں اگر عثمانیوں کی ترقی محدود ہو اور وہ دیگر اقوام کو اپنی ترقی میں
یورپ کے مقابلے میں کمزور ہوں تو مقام تعجب نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت صحیح نظام میں
در چند معذوریات رکھتی ہے۔ جن میں متفرق طبقات رعایا کے باہمی عداوت و اختلاف کی ذمہ داری اور بدلت
سب سے بڑھ کر ہے۔ جو قیام مختلف اقوام پر حکومت کرنے کے متعلق ہندوستان میں بہت کم لکھا گیا ہے۔
حکومت برطانیہ کو پیش آتی ہیں۔ اُن سے کہیں زیادہ کالیف کا سامنا حکومت عثمانیہ باغیہ کے
کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ دنیا بھر میں شاید کسی اور ملک میں اتنے اضداد کا مجموعہ یکجا نہیں ملتا۔ جو ترک
اور طور یہ کہ وہاں کی یہ متضاد جماعتیں ہندوستان کی رعایا کی طرح بے سلاح نہیں بلکہ سلطنت واپائی کی
کے ساتھ پشتوں سے جنگجوئی کی خوگر ہیں۔ بات بات میں فساد ہوتا ہے اور ذرا سے فتنے کی صنعت
تیغ و خنجر نکلتے ہیں۔ ایسی رعایا کو قابو میں کرنے اور ملک میں امن قائم رکھنے کے لیے بے پناہ
آہنیں درکار ہیں۔ اور وہ بیحد موجودہ فرماں روا کے ٹرکی کا ہاتھ ہے۔ استانبول میں ہیں۔ تاہم
سب سے زیادہ تعجب خیز جو بات ہو یہی ہے کہ ایسے عزائم نشین بادشاہ کا رعب ہے۔ ان حالات
کے ہر طبقے پر اس شدت کے ساتھ کیونکر قائم ہے۔ کہ چند آدمی تخلیہ میں بیٹھ کر بھی اپنی چپ چا
کے خلاف کوئی حرف شکایت زبان پر لانا خالی از خطر نہیں سمجھتے۔ بغاوت اور بغاوت کی طرح ہر
کی سازش کا تو کیا ذکر۔ مگر یہ حیرت انگیز نتیجہ بغیر نقصان کے نہیں حاصل ہوا۔ جو بہت لوگوں کو مر
ہے گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ رعایا کے شورش پسند اور مخالف حصوں کو مارا لکھا گیا۔ اعلیٰ
سے روکنے کے لئے جو تدابیر عمل میں لائی گئیں۔ اُن کا اثر رعایا کے امن پسند اقلیت پر ہوا۔
ملک ملت حصے پر بھی پڑا۔ بلکہ زیادہ سختی کے ساتھ پڑا۔ اور عثمانیوں کی آزادی قیام سے اپنے
فصل کا خاتمہ ہو گیا۔ اُنکی ترقی کی نہ صرف رفتار رک گئی۔ بلکہ ترقی میں بہت کچھ کمی لگائی گئی۔
دل بچھ گئے۔ ہمتیں ٹوٹ گئیں اور امنگیں جاتی رہیں۔ جسے دیکھو زندگی کے ذرا دن سے عالی

کہا ہے۔ ترکی لٹریچر کوئی بین کچیس برس پیشتر اس زور سے ترقی کرنے لگا تھا
 یہاں معلوم ہوتا تھا کہ دنوں میں یورپ کے بہترین ذخائر ادب کا ہم تپہ ہو جائیگا۔ مگر وہ
 رفتار روک دی گئی اور اب مدت سے جہاں تھا وہیں ہے۔ بلکہ کسی قدر رو بہ انحطاط
 پہنچا ہے۔ تجارت کی طرف پہلے ہی سے اس جنگی قوم کو توجہ نہ تھی۔ اور اس کو ملک
 بیشتر تجارت یا اختیار کے ماتھے میں ہی بالکل غیر متحرک پڑی ہے۔ اور ملکی ترقی کا
 سہرا سدود ہو۔ جو ترک اپنی تجارت کے امکانات سے باخبر بھی ہو گئے ہیں۔ وہ
 وجود بے دست و پائی کی حالت میں کوئی تحریک ان امکانات کو قوہ سے فعل میں لانے
 نہیں کر سکتے۔ صنعت و حرفت کے میدان میں جو تھوڑا بہت کام ہو رہا ہے۔ وہ
 کراری کام ہے۔ کارخانے عموماً سرکاری ہیں۔ اور گو وہ اپنی جگہ بہت منتظم اور
 مدہ حالت میں ہیں۔ تاہم رعایا کو اپنی بہت آزمائی کا موقع اس صیغے میں بھی پورے
 اور حاصل نہیں۔ ان حالات میں عثمانیوں کی ترقی کا فقط یہ امکان باقی ہے۔ کہ وہ کچھ
 ت اور اسی طرح چپ چاپ تھوڑی تھوڑی ترقی کرتے جائیں۔ تاوقتیکہ کوئی ایسا
 فرمان آئے جو ذاتی طور پر اتنا زبردست نہ ہو جتنا فرمانروائے حال۔ اور وہ اپنی رعایا
 کے قابل ترین لوگوں کو موقع دے کہ وہ اپنی اپنی لیاقتوں کے جوہر دکھائیں۔ موجودہ
 طاقت کے اراکین اعلیٰ میں نے کئی دُزرا اس قابلیت کے دیکھے۔ کہ اگر انہیں
 ان عہدوں کے جن پر وہ ممتاز ہیں خمتیارات کا ملہ حاصل ہوں۔ اور وہ انکو نیکیتی
 اور ایمانداری سے اپنے ملک کے نفع کے لئے کام میں لائیں۔ تو چند سال میں ترکی
 ترقی کرنے والے ملکوں میں شمار ہونے لگے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان کے
 علاوہ اور بہت سے عالی دماغ اور روشن خیال مدبر اس وقت ترکی میں موجود ہیں جو

مغزول یا معنوب ہو کر خاندان نشین ہو گئے ہیں اور جن کی بے نظیر لیاقت سے ملک آج کل کسی طرح کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ یہی لوگ دوسرے حالات میں اگر سلطنت کے عامل ہیں نہ ہوں تو بھی رعایا کے عمدہ منشی اور رہنما بن سکتے ہیں۔ ان کے سوا بہت سے تعلیم یافتہ اور دردمند ترکوں کی وہ متفرق جماعت ہو۔ جو نوجوان ترک کے نام سے موسوم ہے اور جن کا شیرازہ ساہا سال سے سخت پریشان ہو۔ یہ لوگ کسی زمانے میں جوان ہو گئے۔ ابدان میں بہت سے اصحاب پچاس ساٹھ برس کی عمر کے ہیں۔ لیکن یہ دیکھا کہ طرز حکومت میں اصلاح کے طلبگار تھے۔ اور چاہتے تھے کہ یورپ کے دیگر ممالک کی ذمہ داری طرحتاً قبول کر لیں۔ بدریعہ پارلیمنٹ حکومت ہو اور سلطان المعظم آئینی بادشاہ ہو نہایت ہی منظور فرمایا۔ لیکن ملک کی حالت اس تغیر کے لئے تیار نہیں سمجھی گئی اور ان کی حرب میں یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ ان میں سے بعض نے حکومت کی سختی سے گھبرا کر وطن چھوڑ دیا اور بعض شہادتِ مخالفت کی بنا پر جلاوطن کر دیئے گئے۔ مجھے اس گروہ کے اُن نفاذیوں سے لوگوں سے اختلاف ہو جو مالک غیر میں مخالفین کے رو برو اپنے ملک اور اپنی حکومت کا رونا روتے رہتے ہیں۔ کیونکہ میں نہیں سمجھتا اس سے اُن کے ملک کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نقصان جو پہنچتا ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود اس امر کا اعتراف میرا فرض ہو کہ اس گروہ میں بعض لوگ نہایت اعلیٰ قابلیت رکھنے والے ہیں۔ اور بلادِ یورپ میں برسوں کی رہائش نے اُن کے تجربہ میں بہت سے مفید اضافہ کئے ہیں۔ اگر یہ لوگ کبھی اپنے وطن میں واپس بلا لئے گئے اور اُن سے کچھ خدمت لی گئی تو بہت کچھ کارآمد ہو سکتے ہیں۔ اس جماعت کا شور و غل جس قدر ہے مالک غیر میں ہو۔ مگر ترکی میں کوئی ان کا نام نہیں لیستہ۔ اور جن لوگوں کو ان سے ہمدردی ہو۔

وہ چھپے چھپے رہتے ہیں اور کبھی اپنے خیالات کے اظہار کی جرات نہیں کرتے۔ اُمید
 کاس جماعت کی علانیہ یا خفیہ کوششوں کے ذریعے کوئی انقلاب ٹرکی کی حالت میں یا
 کوئی تغیر وہاں کی طرز حکومت میں موجودہ عہد میں ہو۔ خود اس گروہ کے اندرونی حلقے
 میں منقطع ہو چکی ہو۔ اور وہ یہی کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں۔ لَعَلَّ اللہ یُحْدِثُ
 بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۔

میں نے یہ دیکھا ہے کہ باوجود نامساعدتِ زمانہ کے اب تک تُرکوں میں جان ہو۔
 اور زندہ قوم ہونے کے بہت سے نشان اُن میں پائے جاتے ہیں۔ اگر زمانہ نے
 انہیں مہلت دی تو ایک دفعہ پھر دُنیا میں نام کریں گے اور یہ ثابت کر دکھائیں گے۔ کہ وہ
 فنونِ حرب میں ہتھیار حاصل کرنے کے علاوہ فنونِ صلح۔ علم و ہنر اور صنعت و
 تجارت میں بھی ترقی کر سکتے ہیں۔ اور اُس قابلِ افتخار وراثت کے حقدار ہیں جو سلطان
 عثمان غازی سے انہیں پہنچی ہے۔ اور جس کو قائم رکھنا اُن کا مذہبی اور قومی فرض ہے۔



دورِ حمیدیہ

”مقامِ خلافت“ کا مختصر سا مرقعہ نام لکھ رہی تھی۔ اگر اس میں زبیر اور نگِ خلافت یعنی تاجدارِ عثمانیاں سلطان عبدالحمید خاں غازی خلد اللہ ملکہ کا ذکر خاص طور پر نہ کیا جائے۔ دُنیا میں جتنے حکمران اس وقت موجود ہیں۔ اُن میں کوئی ایسا نہیں جس کے اصلی حالات اس قدر کم معلوم ہوں۔ جیسے سلطان المعظم کے ہیں۔ یا جس کی نسبت راتنی غلط اور غیر معتبر روایتیں دُنیا میں مشہور ہوں۔ ذاتِ شامانہ کے مخالفین ان کی نسبت مینا جہاں کی تہمتیں تراشتے ہیں اور ان کے جواب میں اُن کے لاکھوں مدائح انہیں جامع کمالات مانتے ہیں۔ مگر اس امر پر دشمن و دوست سب متفق ہیں کہ سلطان المعظم کسی اعتبار سے یگانہ روزگار ہیں بلکہ تاریخِ عالم میں ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔ اُن کی تدابیرِ ملکی سے خستہ لافِ کرنیوالے بھی معترف ہیں کہ وہ فہم و فراست میں لا جواب ہیں۔ محنت کا یہ حال ہے کہ جس قدر کام اپنے ہاتھ سے وہ روز کرتے ہیں۔ یورپ کا کوئی اور تاجدار نہیں کرتا۔ اس پر جو قائلینِ نظام میں موجود ہیں۔ وہ اس لئے ہیں کہ وہ کسی پر عتبار نہیں کرتے۔ اور کوئی فردِ واحد خواہ کیسا ہی قابل کیوں نہ ہو اتنی بڑی سلطنت کے کاروبار کہاں تک انجام دے سکتا ہو۔ ان کے عہدِ حکومت کے ملک کے لئے مفید یا مضر ہونے کے بارے میں بہت سی مختلف رائیں ہیں۔ ”فریقِ نوجوان“ قویہ کہتا ہے کہ ملک کی موجودہ حالت سلطان المعظم کی حکمتِ عملی کی غلطیوں اور حد سے بڑھے ہوئے اختیاراتِ ذاتی کا نتیجہ ہے۔ اور جو کمزوری ملک کو پہنچی ہے سب کا ذمہ دار وہ اپنے فرمانروا کو ٹھہراتا ہے۔ برعکس اس کے رعایا کا وہ کثیر

حصہ جو بادشاہ کی اطاعت میں سرگرم ہے اور جن میں عساکرِ سلطانی بھی شامل ہیں۔ جو ان کے ذرا سے اشارے پر اپنی جانیں نثار کر دینے کو تیار ہیں۔ یہ کہتا ہے کہ اگر سلطان عبدالمجیدؒ نہ ہوتے تو ترک یورپ سے کبھی کے نکل چکتے۔ اور ان کے اس خیال کی تائید یورپ کے اخبارات کے بعض بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ گزشتہ سال جب سلطان المستظم بہار تھے اور دشمنوں نے اُن کے قریب لمرگ ہونے کی خبر اڑا رکھی تھی۔ تو یورپ کے کئی اخباروں نے اس خبر کو بدیں الفاظ بوج کیا تھا۔ کہ وہ سیاسی چال باز جس نے تیس سال تک یورپ کی شفقہ چالوں کو بیکار رکھا۔ آخر اسے دشمن کے پنجے میں گرفتار ہو جس کے پنجے سے رہائی مشکل ہے۔ گو عجیب نہیں کہ وہ اہل سے بھی چال کر جاتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دشمنوں کو اس بے موقع اظہارِ خوشی پر ندامت اٹھانی پڑی۔ ہمارا مسلک ان دونوں فریقوں سے جدا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فرمانروائے روم آخر ایک انسان ہو اور انسان کی تدبیر کبھی درست ہوتی ہو کبھی غلط۔ اُن کے عہد میں کئی اچھی باتیں ہوئی ہیں۔ جن کے لئے دورِ حمیدیہ یادگار رہیگا۔ اور بعض باتیں قابلِ اعتراض ہوئی ہیں جن پر لے دے ہو رہی ہے اور ہوتی رہیگی۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی سلطان عبدالحمید خاں ایک نہایت قابلِ تعظیم سلطان ہیں۔ جن کے ساتھ اُن کے اکثر اہلِ سلاستے زمانِ نانا انصافی کرتے ہیں۔ وہ اپنی عادات اور طریقِ بود و باش میں نہایت سادہ اور بہت سے شاہانِ سلف کا نمونہ ہیں۔ اُن کے مزاج میں غرور بالکل نہیں۔ نہایت تسبیح القلب اور فیاض طبع ہیں۔ اسلام سے سچی محبت رکھتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ غیر مسلم رعایا کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں۔ امورِ خارجہ میں انکی طبیعت خوب لڑتی ہے۔ اور اسی لئے علماؤہ اپنے وزیرِ خارجہ آپ ہی ہیں۔ اور اگر یہ خیال ملحوظ ہے کہ جب وہ تخت پر بیٹھے ترکی کے

اکثر شاہزادوں کی طرح باقاعدہ اور اعلیٰ تعلیم سے محروم تھے۔ تو ان کی لیاقت کی اور بھی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ بہت سے اہل الرائے اصحاب کا خیال ہے کہ ان کے بعد امور خارجہ کیسیا سمجھنے والا ترک کی کو پھر نصیب نہیں ہوگا۔ خود علوم جدیدہ سے وقف نہ ہونے کے باوجود ملک میں تعلیم کو رواج دینا اور خزانہ سلطنت سے ایک بیش قرار رقم ہر سال اخراجات تعلیم کے لئے جدا کر دینا بھی ایک ایسا کام ہو جسکی داد نہ دینا نا انصافی ہوگی۔ اس سلسلہ تعلیم کے ذریعے جو دور حمیدیہ میں نسبت سابق بہت ترقی پا گیا ہے۔ ہزاروں آدمی کاروبار کی میں حصہ لینے کے لئے تیار ہو گئے۔ گو ابھی ملک اپنے امور پارلیمنٹ کے ذریعے سے اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے تیار نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم جو تیاری انکی تخت نشینی کے وقت تھی اس سے بہت زیادہ ہے۔ ریلوے کی ساخت میں بہت سی ترقی اسی دور میں ہوئی۔ سو کاموں کا ایک کام یہ کہ حجاز ریلوے کی بنیاد اس عہد میں پڑی۔ حرمین شریفین کے درمیان ایک مسلمانوں کی آمد و رفت باسانی ہونے کی بھی صورت ہو گئی۔ اور مختلف ملکوں کے سیاح و گزریوں مسلمانوں کو ایک مشترکہ مذہبی ضرورت کے مل کر پورا کرنے کا مفید خیال بھی پیدا ہو گیا۔ ضامن جو ملکی فائدہ اس سے نکل آیا وہ جدا رہا۔ اس حسن تدبیر کے لئے سلطان المعظم کی شخص تعریف ہو کم ہے۔ اور اس نیک کام سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا۔

دور حمیدیہ کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی تقاضائے انصاف ہے کہ بیان کیا جائے کہ رعایا کی اندرنی ترقی اس عہد کی قیود سے بہت کچھ رکی۔ اور سلطان المعظم کے جوڑ توڑ لڑانے کے باوجود دول یورپ بہت سے حقوق و مقبوضات ان سے اسی عہد میں چھین لے گئیں۔ صیغہ بحریہ کا کمزور رہنا ایک بڑا نقص ہے جو اس عہد سے منسوب رہیگا۔ اور جس کی تلافی چند کشتیوں سے جو حال میں خریدی گئی ہیں۔ ہرگز نہیں ہو سکتی۔

خارجہ کو کم اُن اسباب سے واقف نہیں۔ جو صیغہ بحریہ کی حالت کی دستی کے سدا رہ ہوگی۔ لیکن غیہ اسباب کچھ ہی ہوں۔ کسی قوم کے لئے جو اتنے بڑے ملک پر حکمران ہو اور دوسری دُول کے ساتھ اپنی مساوات قائم رکھنا چاہئے۔ اس قسم کی غفلت جائز نہیں۔ اور جب قوم کی طرف سے ساری ذمہ داری انکے سرتاج نے لے لی ہو تو اس غفلت کا کچھ اُسی سے ہوگا۔ سلطان المعظم کی ایک بڑی کمزوری یہ ہو کہ وہ کسی پختہ بار نہیں کرتے۔ اور اس وجہ سے بہت سے نقصان نظام میں راہ پا گئے ہیں۔ خود مختارانہ حکومت کی طرف اُن کی ذاتی رغبت بھی حد سے بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اس سبب سے بہت سی ترقیاں جو بغیر کسی قسم کے خطرے کے ممکن ہیں ممکن ہو گئی ہیں۔ اور ملکی کل چلنے سے عاجز آتی جاتی ہے۔ لیکن باایں ہمہ ہمارا خیال یہ ہے سلطان عبدالحمید خاں غازی نے اپنے عہد حکومت میں اپنی بھلے موافق ملک و ملت کی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ہم اُن لوگوں کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے جو ملکی سیاسی کمزوریوں کو بدینتی پر محمول کرتے ہیں۔ جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ اُن کے سر پر رائے سلطنت ہونے کے وقت ملک کی حالت کس قدر ضعیف اور قرض کا بار کس قدر گراں تھا۔ انہیں یہ ماننا پڑیگا کہ ترکی کے نام سے یورپ کے ”مرد بیمار“ کا دھبہ اُچھڑانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ پہلے ہر وقت یہ لفظ ترکی کے نام کے ساتھ استعمال ہوتا تھا اور اب عرصے سے سننے میں نہیں آیا۔ پس اگر ”دور حمید“ میں ”مرد بیمار“ رُو بہت ہو گیا ہے۔ تو اس دور کے لئے یہ یادگار کافی ہے۔





روزنامہ کا خلاصہ

سپرستابول کے یہ حالات اُن دنوں میں جب ہم مقام خلافت میں مقیم تھے۔ مختصر طور پر خطوط کے ذریعے اخبار اہل زور۔ لاہور میں بزبان انگریزی شائع ہو کر مقبول عام ہوئے تھے اور بڑے بڑے اردو اخبارات میں انگریزی خطوط کے ترجمے بھی چھپے تھے۔ چونکہ ان خطوط میں سب باتیں بغیر تاریخ مندرج تھیں۔ اس لئے اُن کا ترجمہ بطور ضمیمہ اس کتاب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ ایک مشاق مترجم سے کیا گیا ہے اور اس کے بعد ترجمہ میں اس نظر سے قطع دُرید کی گئی ہے۔ کہ جو باتیں گذشتہ اوراق میں مفصل بیان ہو چکی ہیں۔ اُن کا اعادہ نہ ہو۔ اور خطوط مطبوعہ کے صرف وہ حصے یہاں سچ ہوں۔ جو ہمارے مشاہدات کا تسلسل دکھانے کے لئے ضروری ہوں۔ یا جن سے کوئی ایسی بات نکلے جو اصل کتاب میں بیان نہیں ہو سکی۔ جو تھا ویر اس کتاب کے ساتھ چھپی ہیں اُن میں بعض ایسی ہیں۔ کہ انکی توضیح بغیر ان خطوط کے ممکن نہ تھی۔ جو صاحبان پہلے انگریزی میں اخبارات اردو کے ترجموں کے ذریعے ان خطوط کو پڑ چکے ہیں وہ شاید پسند فرمادیں گے کہ سب کا خلاصہ کیا اُن کے پاس موجود ہے۔ اور جن کی نظر سے پہلے یہ خطوط نہیں گذرے۔ اُن کے لئے یہ ایک تازہ دلچسپی کا باعث ہونگے۔

۲۸ جولائی | ۲۸ جولائی کو صبح کے چھ بجے ٹرین میں ہماری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ہم قسطنطنیہ کے قریب آن پہنچے ہیں۔ دو دن لگاتار سفر میں کٹے تھے اس لئے تھان تو بہت چڑھی ہوئی تھی۔ لیکن ٹھنڈی ٹھنڈی نسیم سحر کے جھونکے ہماری ساری تھکن اُتار کے تازہ دم کئے دیتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر چھوٹے سے چھوٹے ٹیشن پر جو دار الخلافہ کے قریب

بکثرت واقف ہیں پرانی نفع اور نیز نئے فیشن کے ترکوں کا نظارہ دکش تھا۔ جن میں مرد و عورتیں
بولے بچے سبھی دکھلائی دیتے تھے۔ یہاں کے دیہات میں پرانے فیشن کے لوگوں
اور غریب غریبا کا لباس ابھی تک زیادہ تر وہی شہر قی طرز کا چلا آتا ہے حالانکہ انہیں اپنے
کے ساتھ تیل جول رکھتے صدیاں گزر چکی ہیں۔ ماں ترکوں کی نئی پود نے البتہ اپنی نفع
قطعیں بالکل یورپین لوگوں کا رنگ و صنگ اختیار کر لیا ہے۔

ہماری ٹرین جوں جوں منزل مقصود کے قریب آتی جاتی تھی۔ اُس کی رفتار بھی ٹپتی
جاتی تھی اور وہ چھوٹے چھوٹے سٹیشنوں پر بھی ٹھہرتی تھی۔ ایک سٹیشن پر گاڑی ٹھہری
ی تھی کہ ایک ترک جٹلین نے ہمارے درجہ میں داخل ہو کر ایک اور ترک سے گفتگو شروع
کی جو اُس درجہ میں کئی گھنٹے سے ہمارے ساتھ بیٹھا آیا تھا مگر چونکہ ہم ترک زبان سے
نابلد تھے ہماری اُس کی کچھ بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ یہ نووارد شخص ایک خوش وضع
جوان معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے انداز سے اُس کی شائستگی متشعشع تھی لیکن شروع شروع
میں اُس نے بظاہر ہماری طرف کچھ التفات نہ کیا۔ اور اپنے اُس دوست ہی سے سرگرم کلام
رہا۔ لیکن چونکہ مجھے وہ مہذب اور تعلیم یافتہ ترکوں کا ایک اچھا نمونہ معلوم ہوتا تھا اس لئے
میں اُسے ذرا توجہ خاص سے دیکھنے گیا اور اندر ہی اندر میرا جی چاہتا تھا کہ اگر ہوسکے
تو اُس سے باتیں کروں۔ اتنے میں سیٹوراں گاڑی سے جو ایک طرح کا سفری کمرہ
خود نوش ہے۔ اور اُس گاڑی کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھی۔ ایک آدمی نے اُن کو
پوچھا۔ کیوں صاحب۔ کسی کو قہودہ چاہئے؟ اُس پر دونوں ترکوں نے ایک ایک پیالی
قہودہ کی اس سے لیکر نوش کی۔ تب ذرا سفر کی کوفت رفع ہو کر اُن کے چہروں پر شبت
آئی اور اُن میں سے ایک نے جسے میں خصوصیت کے ساتھ نکتا آیا تھا مجھ سے عربی میں

پوچھا کیا آپ ہندوستان کے باشندے ہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ اس پر وہ بولا کہ
میں نے گلگتہ اور بمبئی کی سیر کی ہے۔ اور دنیا کے اور بھی بہت سے حصوں میں سفر
سیاحت کر چکا ہوں جہاں اکثر ہندوستانیوں سے ملاقات کا موقع ملا ہے۔ اس وقت
آپ کو دیکھ کر مجھے یہی خیال ہوا کہ آپ غالباً ہندوستانی ہونگے۔ یہ صاحب چند نے
میں نے عربی میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر مجھے اپنا وزٹنگ کارڈ دیا جس سے اُنکا
نشان معلوم کر کے مجھ کو ایک قسم کی مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ یہ تو اپنے ہم پیشہ فکر
ہی تھے۔ آپ استانبول کے مشہور و مقبول روزانہ اخبار صباح کے ایڈیٹر تھے اور اس
گھر سے جو مفصلات میں کسی مقام پر ہے اپنے دفتر کو بارہے تھے۔ میں نے ان سے
کہا کہ میں بھی حسبِ رنویس ہوں۔ جسے سنکر انہیں بھی بڑی خوشی ہوئی۔ آپ نے
فرمایا کہ مختلف اقطاعِ عالم کی سیر و سیاحت میں میں نے بہتیرے ہی شہر دیکھے جو اپنی جگہ
خوبصورت اور دل فریب ہیں لیکن میری نظر میں تو قسطنطنیہ ان سب سے بڑھ کر ہے۔ اُن
نے فرمایا کہ کل تو خیر اتوار ہے۔ دفتر بند ہوگا۔ پرسوں پیر کو میری خوشی ہو کہ آپ
صاحبِ دفتر صباح میں تشریف لا کر مجھ سے میں جس اتفاق دیکھنے پہلا ہی ترک جس
ہیں سابقہ پڑا ایک اخبار نویس نکلا۔ انہوں نے اپنے اخبار میں ہماری آمد کا اعلان
کر دیا اور اس اعلان سے ہیں مختلف موقعوں پر بڑی مدد ملی۔

جب ہم قسطنطنیہ پہنچے کوئی آٹھ بجے صبح کا وقت تھا۔ سٹیشن پہنچتے ہی دو عمارتیں
سرکاری نے پلیٹ فارم پر ہمارے پاسپورٹوں (راہداری کے پروانوں) کا معائنہ
کیا۔ ان اہلکاروں کے ساتھ جہاں اکلک تھے جو اپنے اپنے رجسٹروں میں ان پڑانوں
سے ضروری ضروری باتیں نقل کرتے جاتے تھے۔ ان کے ان موصوف میں سے ایک

چونکہ سن بزرگ تھا مجھ سے بڑی شائستگی و ملائمت کے ساتھ پوچھا کیا آپ عربی بول سکتے ہیں؟ جب میں نے کہا ہاں تو وہ تھوڑی دیر تک مجھ سے گفتگو کرتا رہا۔ پھر وہ اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ اور ہم نے اپنی راہ لی۔ یہاں تک تو خیر خاصی گزری لیکن قافل خانہ کی تکلیف باقی تھی۔ وہاں ہمارے اسباب کی گھڑی مٹھری سب کھول کے زامدی گئیں۔ اور ایک ایک چیز کی بڑی چھان بین اور امعانِ نظر سے دیکھ بھال لگ گئی۔ خصوصاً کتابوں اخباروں رسالوں اور دیگر کاغذاتِ مطبوعہ کی چونہ صرف اسی جگہ ایک ایک کر کے دیکھے گئے بلکہ وہ سب دفترِ معائنہ میں بھی پہنچا دیئے گئے تاکہ فرصتِ اطمینان کے وقت انہیں اور بھی احتیاط سے دیکھ لیں۔ تب واپس نہیں۔ ہمارے ہوٹل کے کابینہ نے اس موقع پر بڑی مدد دی۔ وہ اس معائنہ کے بعد ہمیں گاڑی پمپلا کر ہوٹل لے آیا۔ اور دوپہر کو اسی نے ہمارے وہ تمام کاغذات اور کتابیں وغیرہ بھی دفترِ مذکور سے لادیں۔ جن کا انہی جلدی واپس ملجانا تو ہمیں بڑا عنینت معلوم ہوا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ امر قابلِ ملاحظہ ہے کہ ان حضرت نے اس حقِ الخدمت میں ایک خاصہ مقولہ بلی بڑی منانت سے ہمارے آگے پیش کر دیا جو ہمیں چار و ناچار ادا کرنا ہی پڑا۔ یہ معائنہ جو اس قدر سختی سے کیا جاتا ہے اور بلاشبہ ہر مسافر کو شاق گذرنا ہوگا۔ بخاری بد معاشوں کی شرارت کے باعث ضروری سمجھا گیا ہے۔ جو ہمیشہ بغاوت خیز رفتہ انگیز لٹریچر چوری چھپی ادھر سے ادھر لجا کر ملک میں پھیلاتے اور بد امنی و فساد کی بنیاد ڈالتے رہتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں تنگ اگر ترکِ حکام کو حکمِ ضرورت اس قدر غیر معمولی تسلیمِ عمل میں لانی پڑتی ہیں۔ اور صرف یہی ایک زحمت و زہرِ باری نہیں جس کی دولتِ ستیہ عثمانیہ انکی عنایت سے مستحل ہوتی ہے بلکہ میں نے دیکھا کہ سرحد

بلغاریہ سے قسطنطنیہ تک لمبی ریلوے لائن ہے۔ اس پر ترکی جنگی جہازوں کا شب و روز ہر وقت سنگین پہاڑ ہوتا ہے کہ مبادا اشتراک بلغاریہ سے کوئی اناکرسٹ ریل کی طرف گونزدہ پہنچائے۔ اُن مشکلات میں سے جو ترکی گورنمنٹ کو اپنے عیسائی ہمسائیوں اور سابق ہاتھوں کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ مثلاً نمونہ از خردارے یہ ایک ادنیٰ سی نظیر ہے۔ اور اسی وجہ سے ترکوں کے لئے انتظام قلم و کا کام روز بروز سخت ہونا جاتا ہے۔

لندن ہوٹل میں ہم نے ایک کمرہ لے لیا۔ جہاں سے گوڈن ہورن اشفاق کا لکشمش منظر غریبی دکھائی دیتا تھا۔ اُوپنے اُوپنے خوبصورت مکانات کی قطاریں لگا ہوں کو اپنی طرف خواہ مخواہ کھینچنے لیتی تھیں۔ انہی سربلغک عمارتوں میں جہاں تہاں شاندار مساجد کے گنبد اور مینار اور بھی موثر اور نظر فریب سین پیش کرتے تھے۔ جن کی آوازوں یہاں ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا۔ پھر بٹشس پوسٹ آفیس کو گئے اور طامس کلک کے دفتر میں پہنچکر اپنی ڈاک کی بابت پوچھا۔ چونکہ تھیکے دس دنوں میں ہم کو کوئی خط نہیں ملا تھا اس وجہ سے کئی چٹھیاں پرچے وغیرہ اکٹھے ملنے سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ اُن کے پڑھنے سے فراغت پا کر ہم نے سہ پہر کا وقت استانبول کی سیر میں گزارا۔ شہر کا وہ حصہ جہاں ہوٹل واقع ہیں۔ پیرا کہلاتا ہے۔ اور اس میں زیادہ تر وہ فرانسیسی اور دیگر اجنبی لوگ رہتے ہیں جو ترکی ہی میں آئے ہیں۔ یہ حصہ آج استانبول سے جو اصل ترکی شہر ہے ایک بڑے بھاری پل کے ذریعہ ملا ہوا ہے۔ پیل پُرانا اور محتاج مرمت ہی۔ اور میں نے سنا ہے کہ ایک جرمن کمپنی کو اسکی از سر نو تعمیر کا ٹھیکہ دیا گیا ہے جو موجودہ سے زیادہ وسیع پیمانہ پر ہوگی۔ پیرا سے پل تک

پہل کے اُس پار سے مختلف حصّے شہر تک میسوں ٹریوے گاڑیاں دوڑتی ہیں جن میں گھوڑے جوتے جاتے ہیں۔ اُن کے علاوہ ایک چھوٹی سی زمین دوز ریلوے بھی ہے۔ یہاں تک گئی ہے جس پر سفر کرنے میں آنے والوں کو بہت سا پھیرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ہوٹل کے سامنے ایک مختصر سائیکل باغ ہے۔ جہاں نرگوں کا بیڈ باجڑم کو اپنے دلکش ترانوں سے مسرور کرتا ہے۔ اس باغ کے بالمقابل کئی جگہ فوڈ گراف بھی رکھے ہیں جو ہمیشہ مختلف رنگیناں لاپتے رہتے ہیں۔ فوڈ گراف کے گاہکوں کو جس غیر معمولی شوق سے یہاں کے لوگ سُنتے ہیں۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ یہ ایجاں ہاں حال ہی میں پہنچی ہے۔ ہمیں اپنے کمرہ ہی میں بیٹھے بیٹھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ایک فوڈ گراف میں تھوڑے ہی فاصلہ پر بعض ہندوستانی راگ بھی اُڑ رہے تھے جن کی آوازوں نے ہم پر میٹھی لوری کا کام کیا۔ ہم انہیں سُنتے ہی سُنتے تو گئے۔ اور اس طرح قسطنطنیہ میں ہمارا پہلا دن ختم ہوا۔

۲۔ جولائی | آج ہم سب سے پہلے حسب وعدہ اپنے دوست ایڈیٹر صباح کو ملے گئے۔ آپ اُس وقت دفتر ہی میں تھے۔ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بڑے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم نے مطبع کی عمارت کو جا کر دیکھا جو نئی ہے اور بہت معقول و موزوں معلوم ہوتی ہے۔ مطبع کے پرنسپل ٹرہران آفندی نام ایک ارمنی صاحب ہیں۔ ابھی ہم پریس ہی میں تھے کہ جریدہ موصوفہ کا ایک انگریزی دان قائم مقام ہم سے آج ملا۔ اور جو کچھ اُس کی ہماری بات چیت ہوئی اُس کا جھل اخبار کے اگلے پرچہ میں شائع ہو گیا۔ یہاں بڑی مسرت ہے اس امر سے حاصل ہوئی کہ یہاں کے اخبارات ہندوستانی مسلمانوں کے معاملات سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایڈیٹر صباح

نے مجھ کو اُس روز سے ایک دن پہلے کا جو پرچہ دکھلایا اس میں پورے دو کالم ہندوؤں کے واقعات سے پُر تھے۔ یہاں کے مسلمان اپنے ہندی برادرانِ بینی کی علی ترقیت کا حال سُن کر چھو لے نہیں سکتے اور بڑی شہد مانی اور فخر و مباهات کے ساتھ اپنے اخباروں میں ان کا چرچا کرتے ہیں۔

دفترِ صباح سے ہم ثروت الفنون نام ایک اور مشہور اخبار کے دفتر میں گئے جو بالتصویر پرچہ ہے اور احمد احسان بے نامی ایک بہت ہی روشن خیال اور محنتِ ترک کی ایڈیٹر میں نکلتا ہے اور وہی اس کے پروپرائیٹر بھی ہیں۔ اس اخبار کی عادت بہت معقول ہے۔ اور ظاہری شکل و صورت نفیس و پاکیزہ۔ اس پر قیمت بالکل واجبی یعنی پانچ آنے فی کاپی۔ اور تو ہر اک لحاظ سے یہ پرچہ اپنی قسم کے یورپی جرائد کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ہاں اس میں اُن میں اتنا فرق ضرور ہے کہ وہاں کے اخباروں کو ملکی و قومی معاملات میں رائے زنی کی جو آزادی حاصل ہے اُس سے یہ محروم ہے۔ کیونکہ یہاں اخباری تحریرات سخت نگرانی و محاسبہ کی ایک بڑی تیج لگی ہوئی ہے۔ احمد احسان بے وہ جنٹلمین ہیں جن سے نیاز حاصل کرنے کی مجھے میرے مہربان دوست حامد بے چاندلر سفارتِ عثمانیہ متعینہ لندن نے بہت تاکید کر دی تھی۔ او اُن سے ملنے کے واسطے مجھ کو معرفتی کی چٹھی بھی دی تھی۔ جب ہم نے وہ چٹھی احسان بے کو دکھلائی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ اور فریخ زبان میں مجھ سے فرمانے لگے کہ حامد بے کے ارشاد کی تعمیل میرے لئے عین سعادت ہے۔ آپ کی جو امداد میرے امکان میں ہو اس کے لئے میں بسر و چشم حاضر ہوں اور جب تک آپ یہاں رہیں بڑی خوشی سے اور بدل و جان اپنا وقت آپ کو دوں گا۔ حامد بے

ترکی زبان کے ایک جید بلکہ وحید العصر مُصنّف ہیں اور انکی تصانیف سے میں نے اپنے
لوگوں میں بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ بروہ
کی بھی سیر کریں۔ کیونکہ سنا ہے کہ وہ خالص ترکی بیتی ہے جس میں اس دارالخلافت
(تفطنیہ) کی طرح ترکوں اور غیر اقوام کی ملی جلی آبادی کم ہے۔ اس پر آپ بولے کہ والی
بروہ میرے عنایت فرماہیں۔ میں بخوشی آپ کو انکے نام چھٹی لکھ دوں گا۔ اثنائے گفتگو
میں فنون لطیفہ کا ذکر چل پڑا تو فرمایا کہ گو ہمارے ہاں فنون و ہنر کی کچھ قدر و حوصلہ
فرانی نہیں کیجاتی۔ پھر بھی ترکی میں کم از کم فنِ نقاشی و مصوری کے بعض بڑے
کمال ماہر موجود ہیں۔ ان میں سے ایک چوٹی کے آرٹسٹ حمدی بے کا آپ نے
نام بھی لیا۔ جن کے ہاتھ کی ایک قابل دید و بے نظیر تصویر رائل اکیڈمیِ فائن
ارٹس کی عظیم الشان نمائش تصاویر میں دیکھ چکا تھا۔ جہاں وہ ایک ممتاز جگہ رکھی
گئی تھی اور لوگ اس کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ میں نے حمدی بے سے ملنے کا
اشتیاق ظاہر کیا۔ جس اتفاق سے جس وقت احسان بے ہمارے واسطے انکے
نام کی چھٹی لکھ رہے تھے۔ اسی وقت حمدی بے بھی آنکھ۔ احسان بے ہمارے
خوشی کے اچھل پڑے اور بڑے فخر کے ساتھ اُس باکمال مصوّر کو کمرہ کے اندر لاکر ہم سے
ملایا اور کہا کہ یہ صاحب آپ کے کمال ہنر کے بہت مداح ہیں اور آپ سے ملنے
کے از حد شائق تھے۔ حمدی بے ایک سادہ مزاج پنجاد سالہ بزرگوار ہیں عجائب خانہ
سلطانی کے ڈائریکٹر ہیں۔ اور آثارِ قدیمہ کے مشہور و معروف مبصر۔ جن کی تحقیقات
و جستجو سے ایشیا کو چمک میں نہ مانہ قدیم کی بہت سی قیمتی و قابلِ قدر یادگاریں دریافت
ہوئیں اور کھود کر نکالی گئیں جو میوزیم مذکور میں اس وقت موجود و محفوظ ہیں۔ انہوں نے

اُس نام نہام چٹھی کو دیکھا جو احسان بے اُن کے نام لکھ رہے تھے اور خاص دلچسپی کی نگاہوں سے اُس کو پڑھا۔ بعد ازاں ہمیں مدعو کیا کہ اگلی جمعرات کو آپ لوگ ہمارے میوزیم میں تشریف لائیں۔ ہم نے خوشی قبول کیا۔ پھر تھوڑی دیر اور بات چیت کر کے ہم دفتر ثروت الفنوں سے رخصت ہو گئے۔

۳۱- جولائی | ۳۱- جولائی کی تاریخ اور منگل کا دن ہمارے لئے اور بھی دلچسپ ثابت ہوا۔

کیونکہ میرے دوست شیخ مشیر حسین قدوائی کے پاس مولوی بدرالاسلام صاحب ہندی کے نام معرنی کی چٹھی تھی۔ یہ صاحب محل شاہی کے اندر کتب خانہ میں ملازم ہیں۔ ان چٹھی کو لئے ہم اُن سے نیاز حاصل کرنے کو چل پڑے اور گاڑی میں سوار ہو کر قصر یلدرم کی راہ لی۔ قصر یلدرم کی عظیم الشان عمارت ایک پہاڑی پر بنی ہوئی ہے جس کے پاس ہبی ٹیوٹو معروف حمید یہ مسجد بھی واقع ہے۔ جہاں حضرت خلافت پناہی ہر جمعہ کو نماز پڑھنے تشریف لیجاتے ہیں۔ اس مقدس مقام پر پہنچ کر ترکی فوج کے سپاہیوں سے ہماری مدد پٹھان ہوئی۔ جو نہ عربی بولتے تھے نہ فارسی اور نہ کوئی یورپی زبان۔ اس واسطے ہم اُن سے اپنا مدعا زبانی تو کیا کہتے صرف وہ لفافہ انہیں دکھلا دیا جو ہمارے ہاتھ میں تھا اور مولوی بدرالاسلام آفندی کا فقط نام لے دیا تاکہ وہ اُمتا تو سمجھ جائیں کہ ہم فلاں شخص سے ملنے آئے ہیں لیکن اُنہوں نے شانے ٹکیر ٹکرا کر اور سر ہلا کر گویا اس بات کا اشارہ کیا کہ ہمیں نہیں معلوم بدرالاسلام کون ہیں۔ ہم اسی عالم میں کچھ متحیر سے کھڑے تھے کہ راتے میں ایک ترک سول ڈریس زیب برکئے ہوئے حضرت خضر کی طرح وہاں آں موجود ہوئے۔ اور چٹھی کا سہرا نہ دیکھ کر جان گیا کہ کیس کی ہے؟ اس نے بکمال خندہ پیشانی ہم سے تکیہ کہا کہ آپ ذرا اسی دیر ہمیں ٹھہریتے اور خود اندر چلا گیا۔ چند لمحہ کے بعد ایک شخص

پکا ہوا ہمارے پاس آیا اور ہمیں محل کے ایک بیرونی حصہ کی طرف لے گیا۔ جہاں
 لائبریرین صاحب اور ان کے دفتر کے اور آدمیوں کے کمرے واقع ہیں۔ اس جگہ
 پہنچ چھ ترکہ کردہ میں تھے۔ جنہوں نے بڑی مہربانی سے ہمارے سلام کا جواب دیا
 اور ترکی میں ہمارا خیر مقدم ادا کیا۔ ہم اُن کے الفاظ تو سب کہاں سمجھ سکتے تھے۔
 ان طلب سمجھ گئے اور اشاروں ہی اشاروں میں ہم نے بھی اُن کی عنایت کا شکریہ ادا
 کر دیا۔ مولوی بدرالاسلام صاحب بھی جلدی ہی تشریف لے آئے۔ بڑی گرمجوشی
 نپاک سے ملے اور دلی مسرت سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ چونکہ وہ ترک احباب ہماری
 زبان سے نابلد تھے اور ہم اُن کی زبان سے نا آشنا اس لئے ہم میں اُن میں گویا
 ایک طرح کی دیوارِ اجنبیت حائل تھی۔ مولانا مدوح نے ہمارے درمیان ترجمان بنکر
 اس حجاب کو دور کیا۔ جو ہم کہتے آپ اُنکو ترکی میں سمجھا دیتے اور جو کچھ اُن کا مدعا
 ہوتا تھا ہماری زبان میں بنا دیتے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ وہ اُس روز کا پرچہ صبح شرفِ عسی
 خیر تک پڑھ چکے تھے جس میں ایک آرٹیکل خاص ہمارے متعلق تھا اور صبح کو شائع ہو ہوا
 دیگر اخبارات میں بھی ہماری آمد کا کم و بیش تذکرہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے اس معاملہ کو
 لیونٹ ہیرلڈ کے روزانہ پرچہ سے متنباس کیا جس کی ہمیں بعد میں خبر ہوئی کہ پیر
 کی اشاعت میں ہمارے متعلق ایک نوٹ چھپ چکا تھا۔

جس بزرگ نے ازراہ عنایت ہمارا خیر مقدم کیا وہ اس بات سے بہت ہی متاثر
 ہو چکے تھے کہ ہندی مسلمان کیسے غلط ہیں کہ محض اسلامی دار الخلافت کی زیارت
 کی خاطر اتنے دور دراز سفر کی زحمت بطیب خاطر گوارا کر کے آتے ہیں اور اسی وجہ سے
 آپ نے مولوی بدرالاسلام کی محبت میں ہم سے ملنے کا شوق ظاہر کیا تھا۔ پس انہیں

ہم کو وہاں پا کر قدر تاخوشی ہوئی ہی چاہئے تھی کہ بغیر کسی دقت اور تکلیف کے جو کچھ ہم کو
 بیٹھے مدعا حاصل ہو گیا۔ یہاں ہم بہت دیر تک ٹھہرے بلکہ دوپہر کا کھانا بھی اپنے کمر فرماؤں
 کے اصرار سے ہمیں کھانا پڑا۔ مولوی بدرالاسلام صاحب نے فرمایا کہ حاجی علی پاشا سے
 جو بول بول ہیں۔ آپ کی ملاقات کر لے دیتا ہوں۔ چنانچہ ہم پاشائے مدوح کے کمرہ ملاقات
 میں گئے۔ اور دیکھا کہ آپ پُرا نے فیشن کے ایک واجب الاحترام بزرگ ہیں۔ اپنے
 بجز ٹرکی کے کوئی بات نہیں کی۔ اس لئے مولوی صاحب کو پھر ہمارا ترجمان بننا پڑا۔
 ہم کوئی گھنٹہ تک گفتگو کرتے رہے۔ بیچ بیچ میں محفل سرکاری بھی کسی نہ کسی کام
 کے لئے بغیر روک ٹوک یا اجازت و طے لاء کے آتے رہے۔ ہاں صرف اتنا وہ البتہ
 کرتے تھے کہ دروازہ کھولا اور ذرا کی ذرا باد بکھڑے ہو گئے۔ مینٹوں کا کیا کام ہو؟
 بشکل کچھ سکینڈ ہی انہیں طرح گزرتے ہوئے کہ پاشائے مدوح کی نظر پڑ جاتی اور یہ اندر چلے
 آتے۔ ہم ابھی وہیں تھے کہ صبیحہ صرف خاص کے خزانچی صاحب بھی تشریف لائے۔
 کچھ دیر تک حاجی علی پاشا کے پاس بلکہ ایک ہی دیوان پر انکے پہلو پہلو بیٹھے اور
 چپکے چپکے کچھ باتیں کرتے رہے۔ پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور عربی میں معمولی
 پوچھ گچھ کی۔ حاجی علی پاشا نے اس ملاقات کے آخر میں فرمایا ہم آپ سے ملکر بہت
 مسرور ہوئے امید ہے کہ پھر بھی جب آپ سے ہو سکیگا ضرور آئینگے۔
 دوپہر کے بعد دو بجے کے قریب ہم محل سے نکلے اور اپنے ہوٹل کو واپس آئے۔
 تھوڑی ہی دیر میں سفارت برطانیہ کے ایک عہدہ دار مسٹر فرنر مورس ہوٹل میں میں
 ملنے تشریف لائے۔ ان کا یہ آنا ہمارے اُس خط کے جواب میں تھا جو ہم نے قسطنطنیہ
 پہنچنے ہی ہذا کسٹنس ہر نکولس او کو ز سفیر برطانیہ تعینہ با بعالی کی خدمت میں روانہ کیا تھا

یہی مضمون کہ ہم یہاں پر آئے ہوئے ہیں۔ اور اس لحاظ سے کہ بڑش انڈیا کے باشندے
اور حضور ملک معظم کی وفادار رعایا ہیں۔ آنجناب سے حصولِ نیاز کا موقع ملنے کو ہم اپنے
لئے باعثِ فخر و مسرت سمجھتے ہیں اگر ہنرِ اسلسنی اپنے اوقاتِ گرامی کا تھوڑا سا حصہ ہماری
نظرِ کمال سکیں۔ مسٹر فٹز مویس نے آنکر ہمیں اطلاع دی کہ سفیر صاحب نے آپ لوگوں
کے پیغام کی نسبت انہماک سے فرمایا ہے۔ لیکن چونکہ وہ شہر سے بہت دور تھا یہ
نام ایک ایسی جگہ رہتے ہیں جو حتیٰ کے رستہ گھنٹہ بھر کی مسافت پر واقع ہے اس واسطے
ان کا خیال ہے کہ آپ لوگوں کو وہاں جا کر ملنے میں بڑی تکلیف ہوگی۔ ہم نے کہا
ہمیں دوری اور مسافت کی کچھ پروا نہیں۔ اگر ہنرِ اسلسنی کوئی تاج مقرر فرماویں تو ہم
خوشی وہاں پہنچیں گے۔ اس پر مسٹر موصوف نے کہا "میں اس بارہ میں ان سے گفتگو
کے آپ کو ان کی مرضی سے اطلاع دوں گا۔"

تیسرے پہر ہم گاڑی میں بیٹھ کر باغی کی طرف گئے جہاں وزراء نے دولتِ عالیہ
کے دفاتر ہیں۔ یہاں کے واسطے ہمارے پاس ہنرِ اسلسنی۔ موسس پاشا سفیرِ ترکی مقیم
لندن کی طرف سے ایک باضابطہ معرّفی کی جیجی تھی اور ہم اُسے دفتر میں پیش کرنا چاہتے
ہے۔ باغی جس کی نسبت بیرونی دنیا بہت کچھ سُنتی ہے دراصل بحیثیتِ عمارت کے باہر کی
طرف سے تو کچھ ایسی شاندار اور دلکش چیز نہیں ہے۔ لیکن اندر کے کمرے فی الواقع
بہت فراخ و وسیع ہیں اور دفاتر کے کمرے بھی طرّیح کی ضروریات و تکلفات سے
آراستہ ہیں۔ داخلہ کے چھانک پر فوجی سپاہیوں کا پہرہ لگا ہوا تھا جن کی وجہ سے ہمیں
اپنے انہماک میں ضرورت پر پیش آتی۔ لیکن ایک خستہ حال شخص نے ان کو جس
بجائے کے تن پر کپڑے بھی گت کے نہ تھے۔ ہمیں اس مشکل سے بچایا۔ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ یہ حضرت کوئی اخباروں کے کیڑے تھے اور اخباری دنیا کے واقعات و مسائل سے باخبر کہ آج صبح تک کی خبریں بھی آپ کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ اُس نے ہماری شکل دیکھتے ہی فوراً تاڑ لیا کہ یہ وہی ہندی سیلج ہیں جن کا اخباروں میں ذکر تھا۔ اور اپنے قیاس کی صحت سے بالکل مطمئن ہو کر۔ آپ ایسی خوشی میں آئے کہ بلا ہماری استدعا کے ہی خود بخود سپاہیوں سے ہماری سفارش کر دی اور انہوں نے ہمیں دروازہ پر لیجا سائیں ہم نام انٹر کھڑا کیا۔ جہاں ایک اہلکار نے ہمیں اپنی سپردگی میں لیا اور ایک کمرہ میں لیجا بٹھایا۔ یہاں ترخان کا کام جن لوگوں کو فارن آفیس (صیغہ خارجہ) سے کچھ کام ہوتا ہے وہ اس کمرے میں انتظار کرتے تھے مسلمان ہندو ہیں۔ یہاں سعد الدین بے سکرٹری وزیر خارجہ نے آن کر ہمارا مدعا دریافت کیا۔ اور ہم سے وہ چیٹھی لے لی جو جناب وزارت تاب کے نام تھی۔ اس چیٹھی میں صرف ان پانچ عمر و کلمات تعارف مرقوم تھے اور کچھ نہ لکھا تھا کہ ہمیں کیا چاہئے اور کس قسم کی اعانت و تہلیل نایاں طور درکار ہے۔ مگر چیٹھی لیجانے کے بعد وہ پھر واپس آئے اور نہایت شفقت سے پُرساں اہلک کام کرتے حال ہوئیے جب ہم نے بیان کیا کہ اس سیاحت سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ یہاں کے متعلقہ اہلکاروں کی طرح کی مذہبی۔ تمدنی اور تعلیمی حالت کو دیکھیں اور دار الخلافہ اسلامیہ کے ممتاز ترین ائمہ سے نیاز حاصل کر کے مسلمانانِ ٹرکی و ہندوستان کے رشتہ اخوت اور سہدائے معاصی سے ملاقات کر کے بڑھائیں اور تقویت دیں۔ تو صاحبِ موصوف بہت خوش ہوئے اور جا کر وزیرِ حصہ متعلق ہمارے مسئلے سے رپورٹ کی۔ چند منٹ کے بعد آپ تیسری دفعہ پھر آئے اور فرمایا کہ ہر کسلسی تو فین پاشا وزیرِ صیغہ خارجہ آپ کو باریابی کا موقعہ دینے کے لئے بخوشی آمادہ ہیں۔ چنانچہ خبریں ہم سے آئے آپ ہیں اُس وسیع و شاندار کمرہ میں لے گئے جو وزیرِ مدوح کا دفتر ہے۔ جن کی مٹھیاں کی بجائے کی بات کچھ اور تہرہ کی یورپ تک دھاک ہو۔ ہر کسلسی کے پاس معزز عوامی سلطنت اور بھی ہے اس لئے ایک سفار

تھے۔ ایک فوری پٹا جو بعد میں شریک گفتگو ہوئے اور معلوم ہوتا تھا ہندوستان کے معاملات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ خاصکر مسلمانان ہند کی تعلیم نموان سے۔ جناب وزارت ماب ہمارے ساتھ کمال عنایت و التفات سے پیش آئے۔ یعنی جب ہم اندر گئے تو آپ کھڑے ہو گئے۔ اور ہمیں اپنے پاس ہی جگہ دی۔ سوالین بے نے ہمیں نام بنام انٹروڈیوس کرایا۔ اور انگریزی میں ہمارے اور وزیر حسب کے درمیان ترجمان کا کام کرتے رہے۔ اُس وقت کی گفتگو اس قسم کے معاملات پر تھی۔ مثلاً مسلمانان ہند کی تعلیم۔ اُن کی عام ترقی۔ قومی حالت وغیرہ وغیرہ۔ متعلقانہ پایا جاتا تھا کہ جناب وزارت ماب کی معلومات اُن میں نہایت گہری اور مبصر ہیں۔ توفیق پاشا کی عمر اس وقت ساٹھ سال یا اس سے بھی کچھ اوپر ہوگی۔ آپ کا چہرہ مہرہ خد و خال نمایاں طور پر دلکش ہیں۔ بات چیت بڑی دھیمی آواز میں کرتے ہیں۔ دستِ مبارک کام کرتے وقت بقاضائے عمر ذرا کا پنتا ہے۔ مگر بیٹھے جیسے چُست اور سستہ جو انوں کی طرح سیدھے ہو کر ہیں۔ صورت پر ایک رعب و جلال برساتا ہوتا ہے۔

وزیرین و صاحب سے ملاقات کر کے ہم سعد الدین بے کے کمرہ میں آگئے جہاں ہمیں ابراہیم علیہ السلام کی مسرت حاصل ہوئی جو اب بعلالی کے مشیر قانونی ہیں۔ آپ صرف انگریزی میں بات چیت کرتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ انڈین لٹریچر سے بخوبی واقف ہیں۔ ہم سے آپ نے تقسیم بنگال اور اس کے نتائج متعلقہ مسلمانان ہند کی بابت کچھ پوچھا۔ جب ہم اس گفتگو میں مصروف تھے اُس وقت توفیق پاشا کی ایک سفارشی چٹھی اس مضمون کی لکھی تھی کہ انہیں

یہاں کے تمام قابل دید مقامات کی سیر کرائی جائے اور ان کے پیش نظر مقاصد کے حصول میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ علاوہ ازیں آپ نے اپنے صیغہ کے اہلکار جلال انسی بے کو جو فارسی بولتے تھے یہ حکم دیا کہ ان کے ساتھ جاکر ترجمان کا کام دو اور خوب اچھی طرح سیر کرادو۔ چچٹی ہنر اکسنسی وزیر اعظم بالقابہ کی خدمت میں روانہ کی گئی جس کے پاس مہربان پورہ طفیل ہمیں فرید پاشا (وزیر اعظم) کے حضور بھی باریابی کا موقع ملا۔ پاشائے مدوح بھی ہمارے قریبی تھے جس کے ساتھ اسی عنایت سے پیش آئے جیسی کہ وزیر خارجہ کی طرف سے ظہور میں آئی تھی۔ ہم نے وہی گلا اور ویسے ہی امور کی نسبت آپ بھی استفسار و گفتگو فرماتے رہے۔ ان سب کے ایک ساتھ آپ نے اپنی آپ نے یہ پوچھی کہ کیا آپ کے ہاں (ہند میں) امور دینی و دنیوی کے درمیان کچھ امتیاز ہے یا نہیں؟ میں نے کہا نہیں وہاں تو دونوں سے متعلق عجب خلط ملط جو شہزادہ مدوح ہے۔ اس پر آپ نے کمال تا سلف سے فرمایا کہ یہی حال یہاں ٹرکی کے مسلمانوں کا ہے۔ میں نے کہا کیا پھر عربی کا ایک مقولہ پڑھا اور کہا کہ ہماری قومی زندگی کا اصول یہ ہونا چاہئے۔ یہ مقولہ بہت دیر سے غالباً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے بدین مفہوم کہ فکرِ عقبی اس طرح کرو کہ تائب۔ اور اس گویا کل ہی مرجانا ہو۔ اور فکرِ دنیا اس طرح کرو گویا ہمیشہ جینا ہے۔

یکم اگست ۱۹۰۶ء اگست کا مہینہ جو سارے کا سارا دار الخلافۃ اسلامیہ میں گذرنے کا ارادہ ہے اس کا آغاز ایک ایسی ملاقات سے ہوا جو مجھے کبھی نہ بھولیگی۔ ہمارے ترجمان سرکاری یعنی جلال انسی بے نے ہم سے پہلے ہی دن پوچھا تھا کیا آپ ہنر اکسنسی پرنس ارفع الدولہ سفیر ایران متعینہ با بعالی سے ملنا چاہتے ہیں؟ اور ہم نے اس پر خوشی سے رضامندی ظاہر کی تھی۔ آج وہ ہمیں شاہزادہ کے پاس پہنچے۔ اور ہم دیکھ ان کی خدمت میں رہے۔ مرزا رضا خاں دہش (یہ آپ کا اصلی نام اور تخلص ہی نہایت

ریشن خیال بزرگ ہیں اور بلا دیورپ تک میں مشہور و معروف ہیں۔ ہیگ کی گذشتہ
 برس کافرنس (مجلس سامی امن) میں آپ ایران کی طرف سے قائم مقام تھے۔ اور
 اُس وقت سے اب تک امن عام کے حامی کار ہیں۔ یوسرن کے عجیب گھر میں کمز
 امن و صلح میں مدبران یورپ کی تصاویر کے درمیان ہم نے جو شبہ کی مشرقی
 مہر کی بھی دیکھی تھی جس کے نیچے الفاظ پرنس آف سپیس (شہزادہ امن) لکھے
 تھے۔ اب ہم نے وہی شکل و شبہات شہزادہ ارفع الدولہ کی پاکر معاً پہچان لیا۔
 وراپ کو اس امتیاز کے حصول اور نیز اس بات پر مبارکباد دی کہ آپ کی
 ساعی جمیلہ ایسے مبارک مقاصد سے متعلق رہ چکی ہیں۔ یہاں سے اُس نظم کا ذکر
 ہاں پڑا جو شہزادہ مدوح نے امن کے مضمون پر لکھی تھی جس کا ترجمہ یورپ کی تمام
 زبانوں میں شائع کیا گیا۔ پرنس ارفع الدولہ نے اُس نظم کی ایک ایک کاپی ازراعت
 بے اور میرے دوست کو بھی مرحمت فرمائی جس کی نہایت نفیس و خوبصورت جلد
 مدھی ہوئی ہے۔ اور اُسے آپ نے اپنے دستخط سے بھی مزین کیا۔ یہ نظم حال کی فاری
 ایک لطیف نمونہ ہے۔ اس میں مختلف ممالک کے قائم مقاموں کی طرف سے حیات
 ان کے دلائل و دیکر بعد میں ایک مشرقی کی صدا لگائی گئی ہے جو کانفرنس میں موجود
 ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اگر تم لوگ واقعی امن اور صلح کے خواہاں ہو تو لازم
 ہے کہ اہل مشرق کو بھی اپنی طرح آدمی سمجھو بلکہ اپنا بھائی جانو اور آدمی بلکہ بھائی
 سامی اُن کے ساتھ برتاؤ بھی کرو۔ امن عالم کی بہترین ضمانت یہ سلوک اخوت ہی ہو سکتا
 ہے۔ کیونکہ امن اس تجویز کا قدرتی و لازمی نتیجہ ہوگا۔ اس قابلِ قدر نظم کی کچھ آیات
 طور نمونہ درج کی جاتی ہیں:-

وانکہ زابل شرق یکے گفت دوستان
در کوہ سار و درودہ و در پشت و در من
کافریقی و فرنگی و چینی است ہم وطن
نوع بشر یک پدر و مادرند و ما
ہر ملتے کہ تربیتش بہت بیشتر
مغرب کند رفاہیت شرق را خیال
خلق ارشوند جملہ برادر بہ یکدگر
و مست بدر بہ دائرہ ہمت و خیال

ایں نکتہ راز لطف نماید یکے بیان
بر جملہ خلق باید فہم اند ایں سخن
آں یک وطن زمین و بود جملہ را سکن
با ہم برادریم ز رویمیم یاختا
باید بدگر اں رسد از فیض او ثمر
باشند در جنوب پئے رحمت شمال
از جنگ و از جدال نماند دگر اثر
خود اند کی بیس کہ چہ ممکن شود و حال

پرنس مسدوح نے ہمیں اپنی ایک اور کتاب بھی دی جس میں آپ نے اہل شرق
کے اس خیال اور اس کی طرف میلان عام کی زور سے مخالفت کی ہے کہ آدمی بچکا
یا حد درجہ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچتے ہی بوڑھا اور ضعیف القوی ہو جاتا ہے۔ برخلاف
اس کے انہوں نے ایک دلکش حکایت کے پیرائے میں یہ بتایا ہے کہ اُسے ایک بیس
برس جیسا چاہتے جس کا نصف اول حصولِ تجارت میں گزار دے اور نصفِ آخر
ان تجربات سے فائدہ اٹھانے میں۔ اور کہ سادہ اور محنت اطرا زندگی بسر کرنے اور
صحت بخش و ورزش کرتے رہنے سے ہر شخص اپنی عمر بڑھا سکتا ہے۔ علمی و ادبی
مسائل کی گفتگو کے بعد ہم دیگر مختلف معاملات پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ آپ نے
ہندوستان کا ذکر بڑی ہمدردی سے کیا اور مسلمانانِ ہند کے جو شیش ترقی کی نسبت
اظہارِ استحسان فرمایا۔ میں سن چکا تھا کہ ترکی ایرانی سرحد کے متعلق جو تنازعہ پچھلے
دنوں سلطنتوں کے مابین اٹھ کھڑا ہوا تھا اس کے رفع کرنے اور باہمی صلح و صفائی

کرنے میں آپ نے حتی الامکان بڑی سرگرمی و خلوص سے سعی و جانفشانی کی۔ پس میں نے اس کو ملحوظ رکھ کر توقع ظاہر کی کہ آپ کی سی قابلیت اور خیالات کا آدمی ضرور ہر کار و درون ہمسائہ اسلامی طاقتوں کے تعلقات کو استحکام و تقویت دینے میں کوشاں ہوگا۔ آپ نے جواب دیا کہ میں چونکہ عالمگیر امن کا حامی ہوں لہذا دو مسلمان ملکوں کے درمیان رابطہ اتحاد قائم رکھنا میرے نزدیک اور بھی زیادہ ضروری مدعا ہونا چاہئے اور اسی لئے جہاں تک میرا بس چلیگا اُس تعلق دوستی کو نہ صرف بنائے رکھنے بلکہ روز بروز بڑانے میں سعی رہو گا۔ قبل اس کے کہ ہم پُرس مدوح سے رخصت ہوں آپ نے زراہ کرم ہم کو ستاہ ایران کی تقریب سالگہ میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ جو گلے اتوار کو منعقد ہونے والی تھی۔ جسے ہم نے بشکر یہ منظور کیا۔

۱۸ اگست | احمدی بے ہتم عجائب خانہ نے ہماری سیر کے لئے جمعرات کا دن مقرر کیا تھا۔ چنانچہ ہم اُس روز دس بجے صبح کے وہاں پہنچے۔ آپ پہلے ہی اُس جگہ آچکے تھے۔ ہم نے اپنا کارڈ بھیجا آپ فوراً باہر تشریف لے آئے۔ یہ عجائب خانہ ایک شاندار عمارت ہے جس میں اب بہت کچھ اضافہ ہو رہا ہے۔ جب یہ جدید عمارت مکمل ہو جائیگی۔ تو یورپ کی بہترین عمارتوں میں اس کا شمار ہوگا۔ اب بھی اس کے اندر بعض چیزیں ایسی نادر ہیں کہ اُن کے لحاظ سے اس عجائب خانہ کو عظیم المثال کہہ سکتے ہیں مثلاً ایک سنگ مرمر کا تابوت ہے جو نہایت حیرتناک طور پر اب تک جوں کا توں محفوظ رکھا گیا ہے جس کی قدامت کی یہ کیفیت ہے کہ اس پر جو مورتیں بنی ہوئی ہیں اُن میں سے ایک کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ سکندر اعظم کی اس موقع کی شبیہ ہے جو جبکہ وہ دارائے ایران سے مصروف پیکار تھا۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ سکندر کی تصویر

نہیں بلکہ اُس کے کسی سپہ سالار کی ہو۔ ایک اور نہایت خوبصورت تابوت ہوجس میں روتی ہوئی عورتیں کھسلائی گئی ہیں۔ جن سے قدیم زمانہ کی رسم ماتم کا ہوبہو نقشہ پریش نظر ہو جاتا ہے۔ اس یادگار کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت مسیح سے چار سو برس پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ انسان حیران رہ جاتا ہے کہ زمانہ قدیم کے لوگوں نے بھی فنِ نقاشی اور دیگر فنونِ لطیفہ میں کس بلا کا کمال پیدا کیا تھا۔ یہ اور رسم کے دیگر ذخائرِ قدیمت حال میں خود حمدری بے نے اپنی تحقیقاتِ آثارِ قدیمہ کے دوران میں نکلائے ہیں۔ ایشیا کوچک گویا تہذیبِ قدیم کا گہوارہ ہے۔ حمدری بے نے اس کے کھنڈروں کی برسوں خاک چھانی ہے۔ اور ہستانبول کے عجائب خانہ کو اپنی تلاش سے مالا مال کیا ہے۔ اس میں ترکی مصنوعات کے نمونے بھی بڑے ہی دلچسپ ہیں۔

جب ہم عجائب خانہ اس سرے سے اُس سرے تک دیکھ چکے تو جلال بے سے ملے وہ ہمیں دو اور مقامی اخباروں کے دفتر دکھانے لگے۔ ایک جریدہ اقدام دوسرے سعادت۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ چونکہ آپ لوگ پہلے دو معصروں سے ملاقات کر چکے ہیں اس واسطے باقی معاصرین کو بھی قدرتی طور پر ایسی ہی توقع ہوگی۔ پہلے ہم دفتر سعادت میں گئے۔ ایڈیٹر صاحب نے بڑی ہلانی و سافر نوازی سے خیر مقدم کیا۔ ہمارا دفتر اقدام میں جانا اور بھی زیادہ دلچسپی کا موجب ہوا۔ کیونکہ اس کی طرف سے جو صاحب ہمیں ملے اظہارِ رائے میں اُن کی سہی خلافتی جرات میں نے دیگر حضرات میں جن سے ہستانبول میں اب تک ملاقات ہوئی تھی نہ پائی تھی۔ انہوں نے اس نگرانی اور روک ٹوک کی سختی کے خلاف بڑی شکایت

کی جو مظلومین میں اخبارات کے ساتھ برتی جاتی ہے اور کہا کہ خاصکر ترکی اخباروں کے ساتھ اور بھی زیادہ سختی کا برتاؤ ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ترکی اخبار بالکل ناتوان اور بے دست و پا ہیں۔ اور کہ ہمیں یہاں کے اخبارات سے خاک بھی توقع نہ کھنی چاہئے کہ استحکام ملت میں کچھ امداد کر سکیں گے۔ میں نے انہیں تسلی دی اور کہا غنیمت سمجھئے کہ ایک طرح تو یہاں کے اخباروں کی حالت اپنے ہندی مخلصین سے بدرجہا بہتر ہے۔ یعنی اس لحاظ سے کہ ان کے پڑھنے والے تو ہیں چنانچہ ترکی میں ایک ایک روزانہ پرچہ کی ہزار ہا کاپیاں صبح سے شام تک بازاروں میں ہاتھوں ہاتھ رک جاتی ہیں اور ہندوستان میں قلتِ اشاعت کا اکثر جھینکا پڑا رہتا ہے۔ لہذا میرے خیال میں ترکی کے اخباروں کو وہ بات تو حاصل ہے جو ایک حلیل اللہ و طاف نور پرہیز کے لئے مقدم اور از بس ضروری سمجھی گئی ہے۔ ہاں یہ کہتے کہ وہ ابھی حقیقی رُوحِ یازندگی سے محروم ہیں۔ سو اگر جیسم بے جان بھی بنا رہا تو اس میں جان بھی کبھی نہ کبھی پڑ ہی جائیگی۔ آپ کے ہاں بہت سے اخبار روزانہ ہیں جو کتابت میں شیعینوں کے ذریعہ چھپ کر شائع ہوتے ہیں۔ بس اگر کسر ہے تو آزادی کی زمانہ موافق و سازگار ہوا اور کیسے بھی پوری ہو گئی تو ترکی پر میں اس قابل ہوں کہ اپنی اصلی قدر و منزلت پر پہنچ کر دیگر مذہب ممالک کے اخبارات کی طرح سلطنت کا چھٹا رکن سمجھا جاسکے۔ لیکن ان باتوں سے ہمارے دوست کو جو اقدام کے ایڈیٹروں میں تھے کچھ تسلی نہ ہوئی وہ حالات موجودہ کی طرف سے آخر تک برابر مایوسی ہی ظاہر کرتے رہے۔

ہمارے آج کے دن کا نہایت مفید حصہ وہ تھا جس میں میں مولانا محمد آفندی

کی ملاقات نصیب ہوئی۔ یورپین ٹرکی میں قاضی عسکر ہیں۔ آپ کا فرض منصبی اس
 حصہ قلمرو کے مقدمات کے فیصلوں پر نظر رکھنا ہے کہ آیا وہ شرع شریف کے
 مطابق ہوتے ہیں یا نہیں۔ اور صوبہ بھر کے مختلف اضلاع میں قاضیوں کے
 تقرر کا اہتمام بھی آپ ہی سے متعلق ہے۔ اسی قسم کا جڈاگانہ انتظام ایشیائی
 روم کے لئے ہے اور یہ دونوں صیغے شیخ الاسلام کے ماتحت ہیں۔ یہ قاضی عسکر
 جنکے پاس ہم گئے۔ ظاہر نئی شکل و صورت سے تو ایک پُرانے فیشن کے بزرگوار
 معلوم ہوتے تھے مگر اُن کے اظہار رائے سے پتہ لگا کہ آپ ایک روشن خیال
 محب ملک و ملت ہیں۔ ہم اُن سے بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے اور کوئی تین
 گھنٹے اُن کی خدمت میں بیٹھے رہے۔ بیچ میں صرف دوپہر کے کھانے کیوقت
 تھوڑی دیر کا وقفہ ہوا۔ اس کھانے میں شریک ہونے کو قاضی صاحب کے
 فرزند ان رشید نے ہماری بھی صلاح کی۔ بالکل سیدھے سادے اسلامی طریق پر کھانا
 رسمی تکلف کے۔ یہ حضرات بھی بہت ہی راسخ العقیدہ پُرانے فیشن کے تربیت یافتہ
 معلوم ہوتے تھے۔ قاضی صاحب مدوح تعلیم کے بڑے حامی ہیں اور اس کو
 خاص وقت دینے کے علاوہ یہ بھی مانتے ہیں کہ تعلیم ضروریاتِ زمانہ کے مناسب
 اور انکو ملحوظ رکھ کر ہونی چاہئے۔ آپ نے فرمایا مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ
 مسلمانان ہند میں ایک طرح کی قومی بیداری پیدا ہوتی جاتی ہے اور وہ مدرسے
 اور کالج قائم کر رہے ہیں۔ میرے نزدیک یہ بھی دینِ حق کی ایک اہم خدمت ہو
 اور فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں تنگ دل ملاظوں نے اول اول
 کچھ عرصہ تک اس ضروری کام میں مزاحمت کی۔ جو مذہب کو جدید تعلیم کے خلاف

سمجھتے تھے۔ مگر میں تو اس تقسیم کا بالکل موید ہوں بشرطیکہ وہ دینی تعلیم اور فرائض منہی کی بجائے غافل نہ کر دے۔ بلکہ اگر ضرورت ہو تو ان لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے جو تعلیم پر مخالفانہ نکتہ چینی کرتے ہیں میں تو اس کے جواز اور اس کی حمایت کا فتویٰ دینے پر آمادہ ہوں۔ آپ نے تعلیم نسواں کی بھی زور سے تائید فرمائی مگر کہا کہ ضرور نہیں کہ لڑکیوں کو بھی اسی قسم کی اور اتنی ہی تعلیم دیجائے جو لڑکوں کو دیجاتی ہے۔ کیونکہ ان کی ضروریات اور جسمانی حالات لڑکوں سے مختلف ہیں۔

۲۔ اگست | جمعہ کو یہاں تعطیل ہوتی ہے۔ ہم نے بھی آج کے دن اول وقت تو چھٹی منائی۔ اور نماز جمعہ کے بعد اپنے معمولی مشاغل سیر کو شروع کیا جامع شگلہاش میں دوکانہ ادا کیا گیا۔ موجودہ عہد سے پہلے چونکہ سلطان وقت کبھی کبھی اس مسجد میں بھی رونق افروز ہوتے تھے۔ اس لئے ایک خوبصورت جالی سنگ مرمر کی لگا کر شاہی جائے نشست علیحدہ بنائی گئی ہے۔ ہم پہنچے ہی تھے۔ کہ امام مسجد تشریف لائے۔ زیب براہیک نیچی سی اور ڈھیلی ڈھالی سبز عبا تھی۔ سر پر سبز عمامہ۔ اس کے گرد زر رنگ کی ریشمی پٹی جو آپ کے دینی مرتبہ کی علامت تھی۔ امام صاحب کے خطبہ پڑھتے وقت بیچ بیچ میں جہاں مناسب ہوتا تھا احتفاظ بلکہ درود شریف وغیرہ نہایت پُر جوش لہجہ میں آواز بلند دہراتے جاتے تھے۔ مگر میری رائے میں سیدنا سادہ پُراناہی طریق خطبہ خوانی زیادہ موثر ہے۔ نماز جمعہ میں یہاں ایک نئی بات یہ کبھی گئی کہ مسجد باہر سچ افواجِ سلطانی کے دستے پُراجمائے کھڑے تھے۔ گو فوج کا بہت سا حصہ شریکِ جماعت بھی ہوا۔

یہ مسجد ایک ساحلِ بحر کے بالکل قریب ہی واقع ہے۔ جہاں سے نماز پڑھنے

کے بعد ہم نے ایک کشتی باہر جانے کے واسطے لی اور اس پر چڑھ کر ایک گنہوت میں جا بیٹھے جو اسکدار ایشیائی حصّہ قسطنطنیہ کو جابجا رہا تھا۔ اس دار الخلافہ کی سحرانہ دلفریبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ یہاں کی ایک باندی پر سے دونوں براعظموں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ایک تو ایشیا جس کو اپنے شاندار زمانہ ماضی پر ناز ہے۔ دوسرے یورپ جو اپنے روشن زمانہ حال پر فخر کرتا ہے۔ ان دونوں کو سمندر کی ایک زبردست شاخ ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ناگوار جدائی سے ملول ہو کر یہ دونوں براعظم اب بھی ایک دوسرے کو حسرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہیں گشتی کے ذریعہ یورپ سے ایشیا تک جانے میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ نہیں لگا۔ اور وہاں جا کر ہم نے دیکھا کہ قسطنطنیہ کی زندگی کا مشرقی پہلو یہاں مشرقیت کا اور بھی گہرا رنگ لئے ہوئے ہے۔ حتیٰ کہ اسکدار کی گھوڑے گاڑیاں تک وضع قطع میں استانبول کی گھوڑے گاڑیوں سے مختلف ہیں۔ گو قسطنطنیہ میں ہر گاڑی کو اعزہ اور گاڑیاں کو اعزہ ہی کہتے ہیں۔ لیکن اصلی اعزہ جو ایشیائی حصّہ دار الخلافہ میں متعل ہے وہ ہندوستان کے یکہ اور جدید طرز کی ایک گھوڑے والی جی کے بین بین ہے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا جس سیٹوران میں کھایا وہ بھی مشرق اور مغرب کا مبعون مرکب تھا۔ یعنی بعض باتوں میں تو ہندوستان کے نانباؤں کی دوکان سے مشابہ اور بعض میں بالکل نئے فیشن کے یورپین ہوٹلوں سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے بعد ہم ایک اعزہ میں سوار ہو کر شہر کو گئے۔ پھر نواح کے ایک قریہ میں جو حیدر پاشا کے نام سے موسوم ہوا اور جہاں سے بغداد ریلوے شروع ہوتی ہے۔ اس ریلوے کی تیاری بغداد کی طرف بڑھتی فی الحال بولہ کی سرمایہ بند ہو گئی ہے۔ لیکن میں نے سنا کہ اس ناممکن حالت میں بھی اس کا تیار شدہ

حصہ آتا ہے کہ اُس پر دو روز کا خاصہ لمبا سفر ہو سکتا ہے۔ مگر یہ ملحوظ رہے کہ ٹرکی میں ریلوں کی رفتار کچھ ایسی تیز نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ مسافت اصل میں دو دن سے کم کی مسافت ہو۔ ریلوے سٹیشن بڑا وسیع ہو اور اس کی وجہ سے وہاں ایک بڑی باری بڑن آبادی قائم ہو گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ جوں جوں لائن آگے بڑھتی جائیگی اسی قسم کی اور بھی نوآبادیاں ضرور لائن کے اس سرے سے اُس سرے تک پڑتی جائیگی۔ اس ریلوے کے ملازم ایشیا ٹرکی میں بھی قریباً سارے کے سارے جرمن ہیں اگرچہ وہ ترکی ٹوپی پہنتے ہیں۔ میں نے سنا کہ اُن میں سے بعض اہل جہنمی اس ریلوے لائن کے کنارے کنارے عمارتیں بنانے کے لئے زمینیں خرید رہے ہیں اور وہ زمینیں انکو خاصی سستی مل جاتی ہیں۔ کیونکہ اس علاقہ کے باشندے خود توان را رضیات کی آئندہ قدر و قیمت نہیں جانتے یا اُن پر روپیہ لگانے کی مقدار اور فائدہ اٹھانے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ یہ میں سمجھتا ہوں کہ اس لائن سے ملک کی مادی ترقی کو ضرور بڑا فائدہ پہنچے گا اور آمد و رفت یا کار و بار تجارت کے حق میں بہت کچھ سہولت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن کچھ بھی ہو یہ میں ضرور کہوں گا کہ قلمرو عثمانیہ کے اس حصہ میں جرمن لوگوں کا اس طرح چپکے چپکے قدم جلاتے جانا مجھے سخیال دور اندیشی کچھ اچھا معلوم نہ ہوا۔ کیونکہ گو اس وقت ٹرکی اور جرمنی کے تعلقات دوستانہ ہوں مگر آئندہ آپس میں غیر متوقع پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کا ضرور احتمال ہو۔ قریہ حیدر پاشا کے قریب ہم نے معدنی پانی کا ایک ذخیرہ دیکھا جہاں کا پانی ایک قدرتی چشمہ سے جمع ہو کے بکتاب ہے اور اس کا نفع ایک شفا خانہ کو ملتا ہے۔ پس ہی ایک ٹرکی تھیسٹر کا چوبی پنڈال بھی بنا ہوا تھا۔ ہم اُس میں جا گھسے۔ ٹائٹ کے

تماشے تو یہاں ترکی زبان میں ہوتے ہیں مگر انتظام ارسی لوگوں کا ہے۔ اور ایک بھی انہی کے ہیں۔ ہمارے گاڈ نے تھیر کے میجر سے اجازت لے لی اور ہم نے تھوڑی دیر تماشا دیکھا۔ تھیر کا مال تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک بھی نشست خالی نہ تھی۔ تماشائی جو بیش تر ترک تھے بڑی محویت سے کھیل کے مزے لے رہے تھے۔ ایکٹروں کی زبان سے ہم کو نابلد تھے۔ مگر پھر بھی جس سین کے شروع میں ہم نے اندر قدم رکھا تھا اُس کے ختم ہونے پر ہی وہاں سے اُٹھے۔ اپنے دل میں اور کچھ نہیں تو اسی خیال سے خوش تھے کہ چلو ترکوں کی زندگی کے اس پہلو کی بھی ایک جھلک تو دیکھ لی۔ اس مال میں ایک گیلری ترکی خواتین کے لئے بھی تھی مگر اس میں عورتیں موجود نہ تھیں۔ ہم نے اس کا سبب پوچھا تو بتلایا گیا کہ تھوڑے عرصہ سے اعلیٰ حضرت سلطان المعظم نے مرد عورتوں کو ایک ساتھ تماشا دیکھنے کی ممانعت کر دی ہے اور اب خواتین کے لئے ایک خاص دن مقرر ہے جس میں سب عورتوں کے لئے تماشا ہوتا ہے۔ ہم تماشا گاہ سے نکلے تو شام ہونے کو تھی۔ ہم نے پھر ایک کشتی لی اور وہ دن ایشیا میں گذار کر یورپ واپس جانے کے لئے اس میں سوار ہو گئے۔

۴۔ اگست | جن چٹھی میں ہم نے برٹش سفیر سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اس کا یہ جواب ہمیں مل ہی چکا تھا کہ ہر کسٹنی سرنکوس اور کونز بالقابہ ۴۔ اگست کو مجھ سے اور شیخ مشر حسین سے ملینگے۔ اس کے مطابق ہم دونوں سبھے صبح کے تیرا پو روانہ ہوئے جہاں سفیر مدوح رہتے ہیں۔ یہ مقام کشتی کے رستہ گھنٹہ بھر کی مسافت پر تھا جسے ہم نے بڑے لطف سے طے کیا کیونکہ قریباً آدھی دور تو ہمیں دوزیہ

خوبصورت عمارتیں ہی عمارتیں نظر آتی ہیں۔ یعنی بحیرہ مارمورا کے اس پہلو میں یورپین
 سین اور اس طرف ایشیائی منظر۔ اور سچ پوچھو تو یورپ کی جانب تو شاندار شاہی
 عمارتوں کا سلسلہ اخیر تک برابر چلا گیا تھا۔ ان میں بڑی بڑی عمارتیں تو زیادہ تر
 سلاطین عثمانیہ کے محلات ہیں۔ جن کے بیچ میں کہیں کہیں بعض اُمرار کے مکان بھی
 لگے ہیں۔ محلوں کا ایک سلسلہ دیکھا جس کے گردا گرد باغات لگے ہوئے ہیں۔
 یہ فرمانروایان مصر کے قصر ہیں۔ جب ہم تراپیہ پہنچے تو ہمیں سامنے سے سفارت خانہ
 برطانیہ کی عظیم الشان عمارت دکھلائی دی۔ جس کے متعلق ایک نفیس موزون باغ
 ہے اور سمندر کے بالمقابل اس کا دکش رُخ ہے۔ ہمارا کارڈ پہنچتے ہی ہنر کلسنی
 نے ہمیں اندر بلایا اور بڑے تپاک سے ملے۔ حجازیلوے کے بارہ میں جہاں
 رہت سی باتیں ہوئیں انہی میں آپ نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ اس لائن پر چونکہ
 زیادہ تر آمد و رفت سال کے صرف دو مہینوں میں رہیگی اس واسطے مالی پہلو سے
 اس میں خاطر خواہ کامیابی مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جب ریل
 موجود ہوگی تو آمد و رفت آپ سے آپ ہونے لگیگی۔ اور بڑھتے بڑھتے کچھ عرصے میں
 لائن کے نفع بخش ہو جانے کی توقع بھی بعید از عقل نہیں۔ اگرچہ اس کے اجراء کا
 مدعا مالی منفعت نہ ہو۔ بیچ کے وقت ہنر کلسنی نے ازراہ عنایت ہمیں اپنے
 ساتھ کھانے میں شریک ہونے کی عزت بخشی۔ اور بیچ کے وقت فرصت میں
 فرمایا کہ اتنے کھانے کا وقت ہو گاڑی پر سوار ہو کر بطور تفریح و تفسن ابھر اُدھر کا
 چکر لگا آئیے۔ چنانچہ ۱۲ بجے ہم جناب مسدوح سے خست ہو کر چلے گئے اور قریباً گھنٹہ
 بھر تک سیر کر کے واپس آئے۔ سمندر کے کنارے کنارے میلوں تک آبادی

ہی آبادی چلی گئی ہے یعنی ساحل بحر کے متصل تو برابر برابر مکاتوں دوکانوں کی قطار ہے اور ان کی پشت پر پہاڑیوں کا سلسلہ گویا دیکھنے والے کے لئے یہ ایک عجیب وکس اور نظریہ تصویر کا سامنظر ہے۔ بیچ کے وقت تک ہم واپس آگے اور پیڑی اوکوڑ صاحبہ سے شرف تعارف حاصل ہوا۔ کھانے کے بعد سہ پہر کا وقت بالمشیل ذکر اذکار اور لطیف صحبت میں گزرا۔ اثنائے گفتگو میں ہر اسلمستی نے علیحضرت سلطان المعظم کی بہت مردانہ اور عالیٰ حسنکی کی بہت کچھ تعریف کی۔

۵۔ اگست | اتوار کا دن ہم نے سفارتخانہ ایران میں گزارا۔ کیونکہ یہاں کج شاہ عالیجاہ کی سالگرہ تھی جس میں ہم مدعو کئے گئے تھے۔ دوپہر کو بہت سے ایرانی جمع ہوئے جو قسطنطنیہ میں رہتے ہیں۔ یہ امر موجب دلچسپی ہے کہ اس جگہ ایرانی لوگوں کی خاصی آبادی ہے۔ یہ لوگ تجارتی کاروبار میں اچھی خوشحالی سے بسر کرتے ہیں۔ اور شہر کا ایک حصہ ان کے لئے مخصوص ہے۔ جہاں وہ اپنی رسوم محرم بلاروک ٹوک ادا کرتے ہیں۔ ایرانیوں کے عائد نے شاہ کجکلاہ کی رسم تہنیت ادا کی۔ اور سفیر صاحب نے اس مبارک تقریب میں شامل ہونے پر انہیں مبارکباد دی۔ اور اس موقع پر ہماری موجودگی پر خاص مسرت کا اظہار کیا۔ جس پر مجھے جتنا مدوح کی اجازت سے انجناب کے عنایت آمیز الفاظ کا جواب دینے کا موقع ملا میں نے فارسی میں مختصر سی تقریر کی اس کا حاصل یہ تھا کہ مغرب حاضرین! میں آپ کو اس بات پر تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ کو دار الخلافہ عثمانیہ میں اس طرح آزادی کے ساتھ اپنے شاہ عالیجاہ کی سالگرہ منانے کی جو اجازت حاصل ہے یہ ولایتین کے اتحاد اور دوستانہ تعلقات کی دلیل ہے۔ جس پر ہم ہندوستان میں خوش ہوا

کرتے تھے۔ کیونکہ اسلامی اخوت کا رشتہ قومی نہیں دونوں سلطنتوں کی ہمدردی و محبت پر مجبور کرتا ہے۔ اور یہی ہمدردی اُس حیرتناک طاقت یکجہتی کا پتہ دیتی ہے جو اسلام نے اپنے پیروؤں کو عطا کی ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم اُسے کماحقہ ملحوظ نہیں رکھتے۔ پرنس آف ولہ تھے چند موزوں اور مناسب موقع الفاظ میں اس کا جواب دیا اور حاضرین نے بھی ان خیالات اتحاد پر مسرت اور طمانیت کا اظہار کیا۔ آج کی شام اور بھی زیادہ لطف میں گزری۔ سفارت گاہ کی عالیشان عمارت میں چراغان کیا گیا۔ باہر ٹکی فوجی بینڈ نے شادمانی کے گیت گائے۔ نہایت پس رفتی اعلیٰ سے اعلیٰ لکھانوں کا ڈنر دیا گیا۔ جس میں سفارت گاہ کے اہلکار ایرانی قونصل جنرل۔ بعض ممتاز تجار ایران۔ اور چند منتخب مہمان اور بھی شامل تھے۔ یہاں ہمیں ایران کے ایک جو خاص کھانے بھی کھانے کا اتفاق ہوا۔ بینڈ باجہ ابھی حمید تہ مارچ اور مظفریہ مارچ باری بجا ہی رہا تھا کہ یہ مزے کی شام ختم ہو گئی۔

میری اس تقریر کے ذرائع واقعہ نے ہم پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ یہاں تحریر و تقریر کی نگرانی کے معاملہ میں محکمہ سنسر کے اختیارات کس قدر وسیع ہیں۔ اگلی صبح کو بعض اخباروں نے جو تقریب سالگرہ کے ضمن میں اس سچچ کا ذکر کرتے ہوئے چند کلمات خیر اتحاد بین المسلمین کی تائید میں بھی لکھ دیئے تو میں نے سنا کہ سنسر صاحب نے انہیں کاٹ دیا۔ کیونکہ یہاں مسلمانوں کے اتحاد پر مضامین شائع کرنیکی ممانعت ہو کہ ہمیں ایسا نہ دوں یورپ کو یہ خیال گذرے کہ تڑکی حکام دیگر ممالک مسلمانوں کو عیسائیوں کے خلاف ابھارتے ہیں۔

۶۔ اگست | کل ہمارا سفارت گاہ ایران میں جانا اور شاہ کجکلاہ کی سالگرہ میں شریک ہونا قسطنطنیہ کے بڑے بڑے ایرانی تاجار کے ساتھ ہمارے تعارف اور ملاقات کا باعث ہو گیا۔ اور ان میں سے مرزا حسن اصفہانی اور حاجی زین العابدین نام دو اعجاب ہم سے ملنے ہوٹل تشریف لائے۔ مرزا صاحب کو گورنمنٹ ایران کی طرف سے متحدہ تاجار کا خط ملا ہوا ہے۔ اور یہ دونوں کے دونوں بڑے معقول پسند اور ضروریات زمانہ سے آگاہ ہیں۔ یہ تقاضائے قومی حیت انہوں نے ایرانی بچوں کی تعلیم کے لئے ایک سکول بھی کھول رکھا ہے۔ ایران کے مستقبل کے متعلق ان کے خیالات مایوسانہ نہیں انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ جو آزادانہ تعلیم مسلمانان ہند کو مل رہی ہے اس سے ہمیں بڑی بڑی توقعات ہیں۔

۷۔ اگست | آج کا دن ہوٹل کے قریب ایک اور مکان میں جو ذرا زیادہ آرام دہ اور ہماری ضروریات کے مناسب حال تھا۔ نقل مکان کرنے میں گذرا۔ اس تاریخ میں کوئی امر خصوصیت سے قابل ذکر نہیں۔

۸۔ اگست | اپنے سرکاری گاہ اور ایک افسر پولیس کے ساتھ ہم جامع ایاصوفیہ کو گئے اور وہاں بڑی دیر تک رہے۔ اس کے بعد عدالت عالیہ میں پہنچے۔ جہاں تمام عمارت متعلقہ دکھائی گئیں۔ لیکن اسوقت کچھری کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اور ہم سے کہا گیا کہ فصل مقدمات کی کیفیت ملاحظہ کرنی ہو تو پھر کسی روز تشریف لائیں۔ اس جگہ عزتو احمد بیگ مشیر عدالت سے جو چیف جسٹس سے دوسرے درجہ پر ہیں۔ ملاقات ہوئی۔ آپ علم دینیات کے بڑے بھاری فاضل ہیں۔ علماء کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ مسلمانان ہند کی نسبت فرمانے لگے کہ قدیم علوم دینیہ کی حفاظت

شاعت کے متعلق انکی مساعی جمیلہ واقعی قابلِ داد ہیں۔ مشنری مولانا روم کا جو خوبصورت
 ڈریش جال میں کانپور سے تلخ ہوا ہے۔ اس کا ایک نسخہ آپ کے ملاحظہ سے گزر چکا
 تھا اس کی تعریف کرتے رہے۔ ہم یہاں سے عزتوں شکر کی بے کمرہ میں گئے اور
 انکی فضیلت علم دوست طبیعت اور بے نقصت خوصلت سے اپنی طبیعت پر بہت اچھا اثر لکھا
 پھر ہم وہ فوارہ دیکھنے گئے جسے قیصر ولیم شہنشاہ جرمنی نے اپنے سفرِ ستانول
 کی یادگار میں نصب کرایا ہے۔ اس فوارہ کے سامنے قدیم ترکی پوشاکوں کا عجائب خانہ ہے۔
 ۱۸ اگست آج ہم نے مسجد جامع شاہزادہ دیکھی جسے سلطان سلیمان عالیشان نے
 ۱۵۲۳ء میں اپنے بیٹے شاہزادہ محمد کی یادگار میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ شاہزادہ ایک ہونہار
 جوان تھا۔ عین عالم شباب میں ۱۸ سال فوت ہوا۔ اور اس مسجد کے صحن میں
 مدفون ہے۔ مقبرہ کی دیواروں پر خوش رنگ روغنی اینٹیں لگی ہیں۔ مقبرہ کے
 اندر ایک نہایت خوبصورت منقش قرآن مجید رکھا ہے جسے شاہزادہ مرحوم نے اپنے ہاتھ
 سے لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر افسوس کہ پیغامِ اجل نے اُسے مکمل نہ کرنے دیا۔ مسجد سے ہم
 عمارتِ عسکریت کے سامنے والے میدان میں آئے جو قسطنطنیہ کی نہایت دلکش اور
 شاندار عمارتوں میں ہے۔ پھر یہاں سے اُس مشہور بازار میں پہنچے جسے برستان
 کہتے ہیں اور جو اپنی خوبصورتی اور دلاویزی میں عظیم النظر ہے۔

۱۰ اگست اترک اپنی تعطیل کے دنوں میں چھٹی منانے اور اُن میں سیر کا لطف اٹھانے
 کے عہدِ سبار سے اپنے ہمسائے یورپیوں سے کچھ کم شوقین نہیں ہیں۔ اس لئے جمعہ کا
 دن یہاں ایسے ہی مشاغل کے لئے مخصوص ہے۔ اُس روز تمام آدمی س اپنی خواتین
 کے بغیر سیر جنگوں سبزہ زاروں وغیرہ کی طرف نکلتے ہیں۔ ہم نے بھی آج کے لئے

جلال اُنسی بے کے ساتھ قرار داد کی تھی کہ ایک نفر جا کر دیکھیں کہ لوگ کیوں تعطیل مناتے ہیں۔ پس ہم مقرر کوئی کی طرف روانہ ہوئے۔ اور وہیں نیم مغربی فیشن پر ناشتہ کیا۔ وہاں سے فلوریہ کو گئے اور لوٹتے ہوئے سینٹ سیٹیفانو کو دیکھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تک روسی سپاہ پچھلے جنگ روس و روم میں پہنچی تھی۔ یہاں ایک یادگاری یسٹار بھی بنا ہے جو تاریخِ ترکی کے اس افسوسناک واقعہ کو یاد دلاتا ہے اور روسیوں نے بہت عرصہ تک درخواست کرتے رہنے کے بعد آخر اس کے بنانے کی اجازت لے لی تھی۔ فلوریہ میں ہم نے بہت سے عثمانیوں کو دیکھا کہ بال بچوں سمیت موجود ہیں۔ اور مرد و عورتیں بچے سب درختوں کے سایہ میں چپ چاپ بیٹھ کر پھل ترکاری اور میوے وغیرہ کھا رہے ہیں۔ اکثر لوگ سامانِ قیصریج شہر سے ہی باندھ لیجاتے ہیں۔ ان کے اس مشغلہ اور دل بہلاؤ میں ہم نے وہ چھچھوہوریں اور ضیف الھرکتی نہیں دیکھی جو اقصائے مغرب کی تعطیلوں اور سیر تفریح کی پارٹیوں میں نظر آتی ہے۔ بلکہ بجائے انکے ایک سنجیدگی اور منات پائی جاتی تھی جو مجھے قابلِ تقلید معلوم ہوئی۔ گویا ترکوں کا مقصد اس طرح تعطیل منانے سے صرف یہ ہوتا ہے کہ آٹھویں دن تفکرات و مکروراتِ دنیوی سے ذرا یکسوئی میں آرام پالیا کریں اور بس۔

اس سیر سے واپس آنکر شام کو یرنج دہ خبر سننے میں آئی کہ آج حضرت سلطان المعظم کی طبیعت اس قدر ناساز تھی کہ نمازِ جمعہ میں بھی تشریف نہ لاسکے جس سے بڑی تشویش پیدا ہوئی کیونکہ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ گذشتہ تیس سال کے عرصہ میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ اعلیٰ حضرت رسمِ سلامتی میں رونق افروز نہ ہو سکی ہو۔

۱۱۔ اگست آج صبح کو سلطان المعظم کی صحت کے بارے میں اور بھی پریشان خبر سنیں گئیں اخباروں کو دیکھا تو اس کے متعلق بالکل سکت تھے کیونکہ انہیں محکمہ نگرانی کی طرف سے کسی قسم کی اطلاعات شائع کرنے کی سخت ممانعت ہو چکی تھی اور اسی لئے لوگوں میں طرح طرح کی زبانی افواہیں بڑی آزادی سے گشت لگا رہی تھیں۔ آج قسطنطنیہ کے محکمہ نگرانی اخبارات کی سختی کا حد سے زائد ہونا ہمارے ذہن میں آ گیا سلطان المعظم کی بیماری کی خبر سنا نبول میں اس وقت شائع ہوئی۔ جب وہ صحت پا چکا اور اخباروں میں یہ چھپا کہ ذرا علیل ہو گئے تھے۔ مگر اب بالکل اچھے ہیں۔ اس صحت یابی کی خبر پر جو خوشی عام طور پر ظاہر ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ رعایا اپنے بادشاہ کی کیسی عقیدت کیش و خیر اندیش ہو۔ اگر اعلیٰ حضرت کی اس عدالت کا ذکر اخباروں میں چھپتا اور لوگوں کو وقت پر سب حال معلوم ہو جاتا تو خدا جانے کس جوش و خروش سے اظہار وفاداری کیا جاتا اور کیسے خشتع و خضوع سے صحت کی دعائیں مانگی جاتیں۔ لیکن ہاں تو رعایا بیچاری کو اصل صورت حال کا پتہ ہی نہیں لگنے دیا گیا۔ حتیٰ کہ اس پر تشویش وقت میں جبکہ باہر کی دنیا اخباری پیغامات تار کے ذریعہ سے اس خبر کو سن چکی تھی اور آئندہ کی نسبت گرامر می سے بحثیں بھی ہونے لگی تھیں۔ اس وقت مستقر خلافت میں سلطانی رعایا کے کانوں تک گویا اس کی بھنگ بھی نہیں پڑی تھی اور اسی لئے افسر اور رعایا اندری اندہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے اور پچھکے پچھکے ہی اعلیٰ حضرت کے لئے دعائیں مانگتے تھے۔ آخر کئی روز بعد ۱۴ اگست کو لوکل پرچوں میں سلطان المعظم کی کامل صحت یابی کا اعلان ہوا اور رعایا کی پریشانی رفع ہوئی۔

ہم پھر ایک مرتبہ عدالتوں کو دیکھنے گئے۔ ایک میں تو استغاثہ کی سماعت ہو رہی تھی اور دوسری میں اپیل کی۔ آخر اذکر عدالت کے سامنے ایک وکیل بزبانِ ترکی وکالت کر رہا تھا جس کی پُر زور تقریر اور طلاقت و فصاحت بڑی موثر معلوم ہوتی تھی۔ ہم نے سنا کہ اس وکیل نے قسطنطنیہ کے مکتب حقوق (یعنی کلج قانونی) میں تعلیم پائی ہے۔ یہاں سے ہم کچھ اور معابد و مساجد کی سیر کرنے گئے اور پہلے جامع لالائی جا کر دیکھا۔ پھر والدہ جامع کو جو سلطان عبدالعزیز کی والدہ نے تعمیر کرائی تھی۔ بعدہ مشہور جامع فاتح کو جو سلطان محمد فاتح کی یادگار ہے اور اسی میں اُنکا مرتد بھی بنا ہوا ہے۔ ہم نے یہاں ایک اور قدیم یادگار بھی دیکھی جو عید قلی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ۱۵۵۷ء کے بنے ہوئے سات رُج ہیں جنہیں شاہی قیدی نظر بند ہوا کرتے تھے مگر اب اُن سے یہ کام نہیں لیا جاتا ہو۔ قسطنطنیہ کی قدیم فصیلوں اور آؤرنہ دروازہ کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو بلخانہ فرنگی عات کے عجیب کاریگری کا نمونہ ہے۔ کسی زمانہ میں یہ ایک یونانی کلیسا تھا۔ اُسوقت اسکو کلیسا مریم کہتے تھے اور اب قعریہ جامع کے نام سے مشہور ہے۔ شاید اس لئے کہ اس کی زمین فرانسیب میں واقع ہے۔ اُس زمانہ میں اس کے اندر فرشتوں اور مذہب عیسوی کے بزرگوں کی مورتیں دیواروں پر بنی ہوئی تھیں اور انجیل کے عہد جدید و عہد عتیق دونوں کے منظر پر بھی کاری کے بنے ہوئے تھے۔ اب اندر کی مورتیں تو ڈھانک دی گئی ہیں لیکن اس حصہ میں جس میں نماز نہیں ہوتی۔ تصویریں اب تک محفوظ ہیں اور یورپین سیاح انہیں نہایت شوق سے دیکھنے آتے ہیں۔ اُن کا اب تک محفوظ رہنا ایک ایسے معبد میں جہاں حسدائے واحد کی پرستش ہوتی ہو۔

نہ ہی نقطہ نظر سے تو ایک غیور مسلمان کے نزدیک محل تعجب ہو لیکن مغن لطیفہ اور آثار قدیمہ کے قدر دانوں کی نظر میں مقننات سے ہو۔ یہاں اب نماز تو اس جگہ پڑھی جاتی ہے جو اگلے وقتوں میں قلب کیسہ تھی اور وہاں مورتوں والا حصہ ڈھکا رہتا ہے۔ پھر بھی یہ دنیا بھر میں غالباً ایک ہی مسجد ہے۔ جہاں مورتیں دیکھنے میں آ سکتی ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی گورنمنٹ اپنی عیسائی رعایا کے مذہبی حساسوں کا پاس خاطر ملحوظ رکھنے میں کیسی ہر دہا رہی۔

۱۲۔ اگست | اس تاریخ میں کوئی خاص بات قابل تحریر نہیں۔

۱۳۔ اگست | آج ہم مشہور اطالین مصور موسیوز ونا رو کا کارخانہ دیکھنے گئے جو خاص اعلیٰ کا کاریگر ہے۔ یہاں علاوہ اور بہت سی چیزوں کے ایک تصویر ٹرکی و یونان کے میدان کارزار کی نظر آئی۔ جس میں اس نامور مصور نے اپنے کمال کے جوہر دکھائے ہیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم ایک نامکمل مسجد کو دیکھنے گئے جسے سلطان عبدالعزیز مرحوم نے بنانا شروع کیا تھا مگر افسوس کہ انکی مرگ ناگہاں نے اس کی تکمیل کی توت نہ آنے دی۔ اس مسجد کے لئے انہوں نے بہت ادنیٰ جگہ تجویز کی تھی۔ جہاں سے آبنائے باسفورس اور نیز شہر کی سیر بخوبی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ عمارت مکمل ہو جاتی تو شانہ قسطنطنیہ بھر میں سب سے زیادہ خوش منظر مسجد ہوتی۔

۱۴۔ اگست | آج صبح کے اخبارات میں سلطان المعظم کی بجاۓ صحت کا ذکر تھا۔ ہم بڑے بڑے بازاروں کی مٹرگشت کو ایک بار پھر نکلے۔ اور اسی روز مسجد جامع سلطان بایزید کی زیارت کو تیسری مرتبہ گئے جہاں بھولے بھولے پیارے پیارے کبوتروں کے جھڈ کے جھڈ رہتے ہیں۔ آخر میں جامع سلیمانہ کی باری آئی جو

سُلطان سلیمان کے زمانہ کی یادگار ہے اور اب تک اچھی حالت میں ہے۔

۱۵۔ اگست | قسطنطنیہ کے قریب چھوٹے چھوٹے جزیروں کا ایک دلفریب مجمعہ بنام کلج کے

ہے جنہیں پرنس اکیلینڈز (جزائر شہزادگان) کہتے ہیں۔ منجملہ انکے ایک جزیرہ کی نام غلطہ سرا

یہ ترکی بحری کلج کی وجہ سے مشہور ہے۔ دوسرا جسے پرنکیپو کہتے ہیں۔ اپولون کے باعث

خوش وضع عمارات اور خوبصورت مناظر کے باعث زیادہ تر گردش پر۔ دوسرے کو بات میں مذکور

کشتی میں بیٹھ کر آخر اللہ کے جزیرہ کی سیر کو چلے اور گھنٹہ بھر سے کچھ زیادہ میں لال کا اندازہ کر

جزیرہ پر جا کر ٹھہرے۔ مگر یہاں خشکی پر نہ اترے۔ بدیں خیال کہ اس کی سیر فیہی ہے۔ اکثر

کرینگے جب وزارت بحریہ سے کلج مذکور کے دیکھنے کی اجازت مل جائیگی جب تمام رعیت ہیں کہ

سے واپس آ رہے تھے تو کثیر التعداد نوجوان جنٹلمین ملکی کے بحری کلج سے ہمارے ایجنٹ ناداری

سیٹم کی طرف آئے اور اس میں سوار ہو گئے۔ چونکہ ہم سن چکے تھے کہ بحری کلج پر کتب سلاطین

انگریزی پڑھائی جاتی ہے اور گو اس دارالخلافت میں عام رواج فرانسیسی کا ہو لیکن رقت بھی

صیغہ بحری کی سرکاری زبان انگریزی ہی رکھی گئی ہے۔ اس لئے میرے فریستوں نے کام کیا

ان نوجوانوں میں سے ایک سے انگریزی میں بات چیت شروع کی۔ ہم نے اترے آٹھ سو بورڈ

کہا کہ ہم سیاح ہیں اور آپ کا بحری کلج دیکھنا چاہتے ہیں۔ کسی دن آئیں گے پھر ان کو

اُس نے کہا کہ آپ کی تشریف آوری ہم سب کے لئے موجب مسرت ہوگی۔ اُس نے اُسے جاکر

لیکن آپ یہ توقع نہ رکھیں کہ ہمارا کلج اپنی قسم کے ان درگاہوں کی برابری کرنے سے دریا

جو آپ انگلستان میں دیکھ چکے ہوں گے۔ تاہم ہمارا سہارا اس امید پر ہے کہ ہمارا

بحریہ پھر ایک دن عمدہ ہو جائیگا جیسا کہ پہلے رہ چکا ہے۔ اُس نے بیان کیا کہ

میں قریباً پانسو طالب علم ہیں اور وہ سب کے سب یا انگریزی جانتے ہیں۔ یا فر

درضابِ تعلیم میں علوم عام کی تدریس کے ساتھ بحری کام کی تکنیکل تعلیم دی جاتی ہو۔
اس کے لئے زمانہ قیامِ کلج کے اخیر دو سال رکھے گئے ہیں۔

الگست | آج ہم غلطہ سرائے کابنتِ سلطانی دیکھنے گئے۔ لیکن افسوس کہ اندوہ
تقسیمِ کلان کے باعث سارے مدارس بند ہوتے ہیں۔ اس واسطے انکو پوری
روشنی کی حالت میں نہ دیکھ سکے۔ مگر پھر بھی ان مدرسوں میں تعلیم کا کام جیسا عموماً
ہوتا ہے اس کا اندازہ کرنے کا ہمیں خاصہ موقع مل گیا۔ اس مدرسے میں طلبہ کی
تعداد اچھی ہے۔ اکثر طلبہ ایسے ہیں جو یا تو بیٹائی ہیں یا وہ جنکے ورنہ اس قدر
مستطاعت ہیں کہ انکے مصارفِ تعلیم برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے
میں بصیغہ ناداری کھانا بھی وہیں سے ملتا ہے اور فیس بورڈنگ وغیرہ بھی
مفت ہو۔ مکتبِ سلطانی میں ایسے غریب طالب علموں کی بڑی محفول تعداد ہو۔
اور وہ اُس وقت بھی مدرسہ میں موجود تھے۔ ہم نے انہیں بسر گرمی و سنہری
نوش و خواند کے کام میں مصروف پایا۔ اس مدرسہ میں کل ہزار کے قریب طلبہ ہیں
ان میں سے آٹھ سو بورڈر ہیں اور باقی ایسے جو پڑھنے آتے ہیں اور رات کو
اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ عمارت مدرسہ میں ایک مسجد بھی تھی۔ ہم
نے اُسے اندر سے جاکر دیکھا۔ امام صاحب اُس وقت وہاں شریف رکھتے تھے۔
میں نے اُن سے دریافت کیا کہ کیا یہاں طلبہ نماز کے پابند ہیں؟ انہوں نے
فرمایا ہاں اکثر پابند ہیں۔ میں نے پوچھا جو نماز نہ پڑھیں کیا انہیں کسی قسم کی
سزا بھی دی جاتی ہے؟ بولے نہیں۔ کیونکہ ایسی جبری نماز سے کچھ فائدہ نہیں
ہوتا۔ یہ مدرسہ یورپ کے ایسے ہی درسگاہوں سے خاصہ برابری کر سکتا ہے۔

اور طلبہ کے طریق رہائش میں اُن سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ لیکن ایک خاص بات ہم نے یہاں ایسی پائی جو اور کہیں نہ دیکھی تھی۔ یعنی یہ کہ عمارت مدرسہ کے ٹھکانے پر چند جوانوں کا ایک فوجی گارڈ ہر وقت تعینات رہتا ہے۔

مدرسہ مذکورہ کے بعد ہم ایک اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ انسٹی ٹیوشن کو دیکھنے گئے۔ یعنی بچوں کا ہسپتال جس کا مفصل ذکر گذشتہ اوراق میں درج ہو۔

۱۷۔ اگست | آج کا مبارک دن ایک مقدس مقام کی زیارت میں گذرا جسے جامع النور انصاری کہتے ہیں۔

۱۸۔ اگست | آج ایک ترک دوست کے ہاں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں کھانے کے بعد دو اور مہمانوں کے ساتھ بات چیت ہوتی رہی جو مصر سے آئے ہیں۔ اور عربی بولتے تھے۔ وہ اپنے خیالات مذہبی میں بہت پختہ نظر آتے اور پرانی وضع کے صاف دل مسلمانوں کا نمونہ تھے۔

۱۹۔ اگست | آج علی الصبح ہنزائی نس فرید پاشا کا ایک خاص قاصد آیا۔ کہ پاشا کو صبح آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ صبح کے دس بجے اُن کے ہاں تشریف لائیں۔ ہم اُن کے دو لٹخانہ پر گئے۔ وہاں ہمیں اُنکے کمرہ ملاقات میں پہنچے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ وہ برآمد ہوئے اور ہمیں مژدہ دیا کہ اعلیٰ حضرت خلافت پناہی نے آپ کو سلام دیا ہے اور شان عثمانی آپ دونوں کو عطا فرمایا ہے۔ اس پر ہم نے اُنکا شکریہ ادا کیا اور اپنے مکان پر واپس آئے۔

۲۰۔ اگست | آج ہم نے دارالبحرہ دیکھا۔ اور اسے دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔

۲۱۔ اگست | اجارا پروگرام آج عزت پاشا سیکرٹری حضرت سلطان المعظم پریذیڈنٹ

جهاز ریلوے کمیشن کی ملاقات سے شروع ہونا تھا۔ چنانچہ ہم قصر علیہ کو گئے کہ پاشا کو
مدح سے نواز حاصل کریں۔ چونکہ وہ اُس وقت حضورِ سلطانی میں پہنچنے کے لئے
بجلیت تیار ہو رہے تھے، اس واسطے بہت مختصر سی ملاقات ہوئی جس کے
دوران میں آپ نے ہمیں جهاز ریلوے لائن کی عکسی نصاویہ کے دو نفیس المم دکھلائے
ان تصویروں میں اس مقدس ریل کی گاڑیاں۔ انجن۔ لائن۔ پل۔ سٹیشن اور
استراح شدہ حصص پر سے ٹرینوں کی آمد و رفت وغیرہ سب چیزیں بڑی عمدگی
وصفاً سے دکھلائے گئے ہیں۔ لائن کے مختلف حصوں کی رسم افتتاح
کے بھی فوٹو تھے۔ جن میں عمال سرکاری۔ علماء کرام۔ رؤسا عظام اور عام
راؤ رعایا کے ٹھٹ کے ٹھٹ اپنے اپنے موقعہ پر ایک شان خاص سے
کھڑے نظر آتے ہیں۔ تماشائیوں کا ہجوم ہے کہ نقش حیرت بنا اعجاز ریل کو
تک رہا ہے۔

عزت پاشا۔ عمال قسطنطنیہ میں ایک نہایت معنی و ہوشیار شخص ہیں۔ آپ کا
تدبیرانہ یا اُس سے کچھ کم ہے اور کل صورت کے اچھے ہیں۔ اُن کے ہاں سے
غائب ہو کر ہم غالب بے کی طرف گئے جو قصرِ سلطانی کے وزیر تشریفات ہیں۔
اُن سے معلوم ہوا کہ ہمیں محلِ قدیم کا خزانہ ہمایوں دیکھنے کی اجازت مل گئی ہے۔
اور فرمانِ سلطانی لکھا ہوا تیار ہے۔ لہذا ہم کپتان حسام الدین ایڈیکا گنگ شاہی
کے ساتھ جو پنج زبان بڑی آسانی سے بولتے تھے اس محل کو گئے۔ اور اُنکی
قابل دید چیزیں دیکھ کر شام کو واپس آ گئے۔

۲۲۔ اگست | آج صبح کے اخبارات میں یہ اعلان شائع ہوا کہ تیسرے درجہ کا نشان

عثمانی علیحضرت سلطان المعظم کی طرف سے مجھے اور میرے دوست مشیر حسین دومی کو عطا کیا گیا ہے۔ اس اعزاز کے متعلق ہمارے لئے زیادہ تر مسرت کا موجب یہ امر تھا کہ ہمیں یہ عزت بالکل غیر مترقبہ طور پر حاصل ہوئی جس کے لئے ہم نے کسی سے ذرا بھی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ یہ تمغہ عطا ہوتے ہی بحیثیت رعایا برطانیہ ہونے کے ہم نے فوراً سفیر برطانیہ کو اس کی اطلاع دی اور فرمایا کہ اپنی گورنمنٹ سے اس کے پہننے کی اجازت ملنے کے واسطے کیا کارروائی عمل میں آنی چاہئے؟ اس کے بعد ہم نے سفیر مدوح کی وساطت سے حصول اجازت کی درخواست دیدی۔ اُسی دن گیارہ بجے کے قریب وہ اعزازی نشان ہمیں پہنچ گئے۔ مغل کے خوبصورت کیسوں میں رکھے ہوئے تھے۔ بعد ازاں ہم قصر لیدز کو گئے اور ہراکلسنی تحسین پاشا فرسٹ سیکرٹری علیحضرت سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ جن کے ماں باریاب ہونا شاید دیگر تمام عمال حکومت کی ملاقات سے زیادہ مشکل امر ہے۔ ہم نے پاشائے مدوح سے عرض کیا کہ ہمارا شکریہ علیحضرت کے حضور پہنچا دیں۔ جس کا انہوں نے بخوشی وعدہ فرمایا۔ ہم تحسین پاشا کو نہایت ہی سنجیدہ دستین اور ساکت وصامت دیکھا۔ اور گو آپ ہمارے ساتھ بڑے خلق سے پیش کرتے لیکن بلاشبہ ضرورت کے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالتے تھے۔ پس ہم اظہارِ امتنان اور معمولی علیک سلیک کے بعد اُنکے کمرہ سے چلے آئے یہ سوچتے ہوئے کہ شاید پاشائے مدوح کی یہ کم گوئی اور انتہا درجہ کی متانت ہی اعلیٰ حضرت کی نظروں میں پسند ہوئی ہوگی۔ کیونکہ ایسے ہستیاؤں و عتقاد کے منصب پر انہی اوصاف کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ اور عجیب نہیں کہ

ای اعلیٰ وصف کے سبب آپ ایک معمولی سیکرٹری کے عہدہ سے ترقی پا کر اس مرتبہ جلیل کو پہنچے اور برسوں سے اس اہم ذمہ داری کے کام کو نبھا رہے ہیں۔

۲۳۔ اگست | آج ہم باب شیخ کو دیکھنے گئے جو قسطنطنیہ میں اپنی قسم کی ایک ہی چیز ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں تقدس مآب شیخ الاسلام کی کچھری لگتی ہو۔ آپ کے ماتحت مثل دیگر وزراء کے بڑا بھاری عملہ ہے۔ آپ کینٹ (مجلسِ وکلاء) کے ممبر ہیں۔ وزیرِ اعظم سے دوسرے درجہ پر سمجھے جاتے ہیں اور انکی عدم موجودگی میں آپ ہی کینٹ مذکور کے میزبیں بھی ہوتے ہیں۔ جن آنکھوں نے یہ دیکھا ہو کہ علما بالکل مفلسی و محنتِ حالی میں بسر کرتے ہیں اور عضوِ معطل کی طرح بیکار ہی نہیں سمجھے جاتے بلکہ لوگ انکے وجود کو قومی ترقی میں باج بھی خیال کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہندوستان میں عام طور پر خیال ہو۔ ان آنکھوں کیواسطے یہ منظر بڑا ہی ناز کی بخش اور فرحت افزا تھا کہ علماء کرام سلطنت کے کاو و پاؤں بنی و حبیبی قدر و منزلت رکھتے۔ یعنی عمالِ حکومت کا ہاتھ بٹاتے اور معدلتِ شریعہ کے اہم کام میں علمی طور پر حصہ لیتے ہیں۔ اس حیثیت سے کہ وہ علوم و معینیت سے بھی بہرہ مند ہیں اور دنیوی معاملات کی واقفیت اور تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ یہی قرونِ اولیٰ میں علماء اسلام کا امتیازی نشان ہوتا تھا جسے افسوس کہ وہ اکثر اسلامی ممالک میں کھو بیٹھے ہیں۔ وراثت اور جہاد کے۔ نیز بعض دیگر مفادات جنکا غیر مسلموں سے بھی کچھ تعلق ہو۔ ان مذہبی عدالتوں میں فیصلے ہوتے ہیں۔ اور ان میں تمام کارروائی بڑی عہدگی اور باقاعدگی سے عمل میں آتی ہو۔ عدالت کی عمارت کو اچھی طرح دیکھ بھال کے ہم نے پوچھا کہ کیا جناب شیخ الاسلام

سے بھی ہماری ملاقات ہو سکتی ہو؟ جواب ملا کہ اس وقت وہ اپنے نائب کے ساتھ ہمارے ہم دار
 کچھ مشورہ کر رہے ہیں۔ اگر تھوڑی دیر ٹھہرو۔ تو انہیں آپ کی اطلاع کیجائے۔ نصف صدی قبل
 ہم نے منظور کیا۔ اور گو بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا مگر آخر اس تمام تکلیف کی کافی
 تلافی ہو گئی۔ ہم نے اپنے کارڈ بھیجے جس پر ہم اندر بلا لئے گئے۔ جناب مہر فرمائی
 بول سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اسی زبان میں گفتگو شروع کی۔ بیچ میں کہیں کہیں
 ترکی الفاظ بھی بولتے تھے جنکے معنی ہمیں ہمارا ترجمان سمجھا دیتا تھا آپ کی
 تقریر ایسی موثر و شائستہ تھی کہ جی چاہتا تھا سنے ہی جائے۔ شیخ الاسلام صاحب
 ایک نہایت خوش وضع بزرگوار ہیں۔ عمر عہدِ شباب سے کچھ ہی دھلی ہوئی ہو۔ ہوا
 ریشیں مبارک میں کوئی بال سفید آگیا ہے۔ ایک سادہ مگر بارعیب لباس زیب
 تھا۔ اپنے ڈسک کے پاس تشریف رکھتے تھے۔ میز کے کاغذات زبانِ حال سے ہر شہر و
 بتا رہے تھے کہ آپ کا جیسا کام میں جی لگتا ہو اتنے ہی سحرانی اور ترتیب سے۔ چونکہ ہمارے
 نفاست کو بھی عزیز رکھتے ہیں۔ جناب مدوح نے اس خیال کی بڑے زور سے بات کی کہ
 تائید فرمائی کہ مسلمان علومِ جدیدہ میں ترقی کریں۔ فرمایا کہ یہ انکا نہی فرض ہے کہ
 ہر زمانہ میں ضروریاتِ زمانہ کو ملحوظ رکھیں اور مصلح وقت کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اور
 کہ یہ خیال جو عام طور پر پھیل گیا ہے واقعی غلط ہے کہ اسلام دنیوی ترقی میں مانع ہو یا
 ترقی اسلام سے دست بردار ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور مثلاً کلام اللہ کو ٹھیک
 ٹھیک نہ سمجھنے یا اس کی نسبت غلط بیانیوں سے یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ
 آپ نے آیات و احادیث بھی اپنے اس کلام کی تائید میں پیش کیں۔ حتیٰ کہ ہم
 آپ کے تبحر علمی اور غیر معمولی دینی قابلیت سے بہت ہی متاثر ہوئے۔

یہاں سے ہم دارالشفقہ کو گئے جو تینوں کا بڑا بھاری مدرسہ ہو۔ اور گو
اب سے نصف صدی قبل عام چندوں سے قائم ہوا تھا مگر اب اسے سرکاری امداد
بھی ملتی ہے اور بڑا مفید کام کر رہا ہے۔

۲۴۔ اگست | خوشی کی بات جو کہ آج ہمیں رسم سلاطین دیکھنے کا بھی موقعہ مل گیا۔
یہاں یہ رسم اب ایک سرکاری تقریب سمجھی جانے لگی ہے۔ جب ہم کا گولہ پھٹنے کا
حادثہ گذرا ہے جس سے سلطان کی جان پر حملہ مقصود تھا۔ اس سے پہلے تو
مالک غیر کے مغز ستیاہوں کو یہ رسم دیکھنے کی اجازت اپنے سفیروں کی معرفت
بسہولت مل جاتی تھی۔ لیکن اس حادثہ کے بعد بڑی احتیاطیں برتی جانے لگی ہیں
اور ہر جمعہ مالک غیر کے ایسے باشندوں کی بہت ہی قلیل تعداد کو اجازت دیجاتی
ہے جو مشہور و معتبر ہوں اور جنکے لئے ان کی سلطنت کا سفیر زور سے سفارش
کرے۔ چونکہ ہمارے (برٹش) سفیر صاحب نے ہمارے لئے سفارش کی تھی اور
اس جمعہ کے لئے اجازت حاصل ہو گئی تھی۔ اس واسطے ہم گیارہ بجے کے قریب
محل سلطانی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں بڑے پھاٹک کے باہر ایک ایڈیکانگ
خاص اسی کام کے لئے مخصوص متعین تھا۔ ہمارے علاوہ بارہ یورپین لیڈیا
اور جنٹلمین اور بھی اس رسم کا تماشا دیکھنے آئے تھے۔ ہم کوئی گھنٹہ بھر تک
وہیں کھڑے سلاطین کی تیاریاں دیکھتے رہے۔ اس موقع پر منتخب افسروں کی سختی
میں تمام افواج سلطانی کے چیدہ چیدہ جوان حاضر تھے۔ پتھر کی اس جید دیو
سے پرے جو حادثہ مذکورہ بالا کے بعد بنائی گئی ہے۔ حمید مسجد تک سارے
رستے سواروں کا رسالہ صف بستہ کھڑا تھا۔ اور مسجد کے چاروں طرف محل کے

سامنے۔ نیز جس دروازہ سے اعلیٰ حضرت باہر تشریف لاتے ہیں۔ اُس کے دونوں طرف عرب ترک وغیرہ دیگر جنگی جوان تعینات تھے۔ فوجی بینڈ حاضر تھا۔ بارہ بجے سے تھوڑی ہی دیر بعد بانگِ دُہل اعلان ہوا کہ اب اعلیٰ حضرت نے اپنی شاہی گاڑی میں قدم رنجہ فرمایا ہے۔ اس کی خبر ہوتے ہی بینڈ باجہ بجا شروع ہوا۔ دو تین منٹ میں اُنکی گاڑی سامنے آگئی۔ اعلیٰ حضرت کے بالمقابل ضیا پاشا کمانڈر انچیف افواجِ سلطانی بیٹھے تھے۔ شاہی سواری کا سامنے سے گزرتا تھا کہ ہر طرف سے ”پادشاہم چوقِ یث“ ”پادشاہم چوقِ یث“ کے نعرے بڑی گرمجوشی کے ساتھ بلند ہوئے۔ جس کے معنی ہیں کہ بادشاہ سلامت تادیر زندہ رہیں۔ جس وقت اعلیٰ حضرت ہمارے پاس سے گزرے ہم نے بادِ سلام عرض کیا۔ آپ نے عنایت آمیز تبسم فرماتے ہوئے ہمارے سلام کا جواب دیا جس سے یہ پایا جاتا ہے کہ غالباً ہمارے ہندی لباس سے پہچان گئے کہ یہ وہی دونو ہندوستانی سیاح ہیں جو اندونوں ہمارے دار الخلافہ میں آئے ہوئے ہیں۔

اعلیٰ حضرت کا لباس نہایت سادہ تھا اور یہی آپ کی مستقل عادت تھی۔ ایک لمبے اُوور کوٹ سے بٹن بڑی حسیط سے لگے ہوئے تھے۔ اندر کی تمام پوشاک ڈھکی ہوئی تھی۔ اور اُس اُوور کوٹ پر سوائے بڑے بڑے بٹنوں کے کوئی شے نمائش و زیبائش کی ٹکی ہوئی نہ تھی۔ سلطانِ المعظم کی ریش مبارک جس سے ایک قار اور بزرگی مترشح ہے نہ تو بہت بڑی اور گھنڈا رہی اور نہ کچھ پھدہری۔ پھر بھی خاصی اچھی بھری ہوئی ڈاڑھی ہے۔ آپ اس میں خضاب



پہرہ مبارک
میں جیسا کہ پورے
میں مسجد کی
میں جو اور کی شہ
کے دو نوٹوں
میں پیر میں
میں سلطان
میں حضرت نور آباد
میں کہتے ہوئے
میں دہلی
میں غبار و غبار
میں اس وقت پر
میں بھی اپنی اپنی
میں نامہ جامی علی
میں لکھے تھے
میں یہ کہتے
میں استعارہ پر
میں لوگ مجھ
میں آج

لگاتے ہیں۔ چہرہ مبارک سے گو تفکرات عیاں ہوتے ہوں تاہم وہ ایسا افسرہ و پژمردہ نہیں جیسا کہ یورپ کے عیب جو حساد کی تحریروں سے خیال میں آتا ہے۔ جب علی حضرت مسجد کی سیڑھیوں پر پہنچے تو جو افسر احاطہ مسجد کے اندر کھڑے تھے اور نیز جو اوپر کی سیڑھی پر تھے انہوں نے کمال ادب سے حضور کی سلامی اتاری۔ آپ دو نو طرف سلاموں کا جواب ہاتھ کے اشارے سے دیتے ہوئے بکاسانی سیڑھیوں پر چڑھتے چلے گئے۔

سُلطانِ اعظم کے مسجد میں پہنچتے ہی نماز جو شروع ہو گئی اور جب نماز ختم ہوئی تو اعلیٰ حضرت فوراً باہر تشریف لے آئے اور شاہی گاڑی میں سوار ہو کر اس کو خود ہی ہانکتے ہوئے محل کی راہ لی۔ اس وقت پرنس بُرمان الدین حضور کے ساتھ سوار تھے۔ وہی پرنس نے پھر نزائے شادمانی سنا یا۔ اور شاہی سواری کے پیچھے پیچھے اظہارِ وفاداری کے نعرے محلِ سلطانی کے پھاٹک تک برابر بلند ہوتے رہے۔ اس موقع پر حرمِ محترم کی خواتین بھی بکثرت آئی تھیں۔ اور وہی کے وقت وہ بھی اپنی اپنی گاڑیوں میں شریکِ جلوس تھیں۔ جب رسمِ سلامتی ختم ہو چکی تو ہم حاجی علی پاشا ناظر اعلیٰ کے پاس گئے جن سے ہم ۳۱ جولائی کو بھی مل چکے تھے۔ آپ کے کمرہ میں منجملہ دیگر اشخاص کے احمد پاشا دامادِ سلطان بھی تشریف رکھتے تھے۔ وہ بھی بڑی التفات سے پیش آئے اور ہمارے گاڑی کی استدعا پر جو ہماری ہی طرف سے تھی فرمایا کہ میرے لئے موجبِ مسرت ہوگا اگر آپ لوگ مجھ سے ملنے کو آئیں۔

۲۵ اگست | آج کے دن کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں گذرا بجز اس کے کہ ہم نے

جو چھٹی سفیرِ برطانیہ کی خدمت میں بھیجی تھی اس کے مطابق بڑش سفارتخانہ کے ترجمان صاحب ہم سے ملنے آئے۔ پھر کچھ دیرِ حقی بے مشیر قانونی با بعالیٰ سے بات چیت ہوتی رہی۔

۲۶۔ اگست [آج ہم نے مدرسہ دارالحنیز کی سیر کی جو صرف نادار و محتاج بچوں کے لئے مخصوص ہوا جس میں علاوہ دیگر ضروری تعلیمات کے تعلیمِ صنعت و حرفت بھی دی جاتی ہو۔ اس درسگاہ کی عمارت اصل میں ایک محلِ شاہی تھا جو علیحضرت نے حال ہی میں اس خیر جاریہ کے لئے وقف فرما دیا ہے۔ سکول کے سیکنڈ ماسٹر صاحب نے ہمیں اندر سے خوب اچھی طرح اسکی سیر کرائی۔ ہم نے دیکھا کہ یہاں بچوں کی آسائش و تربیت کے تمام ضروری سامان مہیا کئے گئے ہیں۔ اس موقع پر بعض لڑکے بوجہ تعطیل اپنے رشتہ داروں کے ہاں گئے بھی تھے۔ مگر کچھ بھی انکی ایک معقول تعداد ہوا موجود تھی۔ معلوم ہوا کہ اس مدرسہ میں طلباء کو علمِ موسیقی اور فنِ مصوری بھی سکھایا جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم محکمہ مال کی طرف گئے تاکہ جوعمال اس صیغہ سے متعلق ہیں وہ ایک نظر انہیں بھی دیکھ آئیں۔ ہم نے یہاں کی عمارت اور انتظامات کو بھی دیکھا ہی پایا جیسا کہ با بعالیٰ اور عندالتوں میں پہلے دیکھ چکے تھے۔ جامعِ بایزید کے متعلق پہلے امسبریری دکتبہ عام کو بھی دیکھا۔ جہاں جا کے معلوم ہوا کہ علمِ دوست پہلے اسکی اچھی سرپرستی کرتی ہے۔ اسی روز سہ پہر کے وقت مطبع عثمانی دیکھنے گئے جس کا بڑا بھاری عمارت ہے۔ قسطنطنیہ میں دوسرے کاری مطابع ہیں جن میں مختلف محکمہ جات کی ریسورٹیں اور دیگر سرکاری کاغذات بطرزِ جدید طبع ہوتے ہیں۔ اور چھپا

موتا متفرق کام بھی ہوتا ہے۔ پریس میں اس وقت ٹائپ اور لٹیکو کی مشینیں کام کر رہی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ علم کا انتظام بہت عمدہ ہے۔ یہاں ہم نے دیکھا کہ گودام کی الماریوں میں ہزار ہا قرآن شریف رکھے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کلام مجید کی یہ تمام جلدیں حجاز اور دیگر حصص قلمروئے عثمانیہ کے غریب غرابہ میں علیحضرت خلافت پناہی کی طرف سے صفت تقسیم ہونے کے لئے چھپی ہیں۔ خیرات و صدقات کا یہ ایک ایسا حسن طریقہ ہو جسے لینے والے بھی بہت پسند کرتے ہیں اور معطی محترم کو بھی ثواب عظیم ہوتا ہے۔

۱۲۔ اگست | چونکہ احمد پاشا داماد علیحضرت ہمیں ملاقات کا موقعہ دینا منظور فرما چکے تھے ہم آج صبح کو انکے گرامی مسکن کی طرف روانہ ہوئے جو فوار باغچہ کے قریب واقع ہے۔ اسکا رے پر لے پار پہنچ کے مقام حیدر پاشا سے ہم فوار کی ٹرین میں بیٹھ گئے۔ اور ٹرین سے گاڑی میں سوار ہو منزل مقصود پر ان اترے۔ جو سالن بھر پر ایک خوشگوار دیہاتی محل ہو۔ اس جگہ میں ایک رنگ مہم (ملاقات کو کہتے ہیں) بیگے بیان چند ہی منٹ بعد پاشائے مہرچ بھی ہم سے ملنے تشریف لے آئے۔ آپ مارشل اسمیل پاشا مرحوم کے فرزند ارجمند ہیں۔ اچھی محفل تعلیم و تربیت پائی ہو۔ آپ کی خوش بانی اور طلاق لسانی کا ہم پر بہت ہی اچھا اثر پڑا۔ باتوں باتوں میں یہ ذکر چل پڑا کہ مسلمان ہند کو اپنے دینی بھائی عثمانیوں کے ساتھ ہمیشہ سے ہمدردی رہی ہے۔ اور وہ ہمدردی صرف زبانی جمع خیر تک ہی محدود نہیں بلکہ ضروری موقعوں پر وقتاً فوقتاً پیاک چندوں کو ذریعہ سے انہوں نے علی طور پر بھی اپنی دلی ہمدردی کا ثبوت دیا ہو۔ ان اوقات و خیالات کا اظہار کر کے آپ نے فرمایا

کہ اصل میں ہمدی تو طرفین کو ایک دوسرے کے ساتھ ہو لیکن مسلمانانِ رُکِ جو ہندو کے کسی کا خیر میں ملی مرد دیکر اپنی ہمدی کا عملی ثبوت نہ دے سکے اسکی وجہ یہ ہو کہ انہیں اپنے ہندی بھائیوں کے اُن اغراض و مقاصد سے پوری آگاہی نہیں جو محتاجِ اعانت و حوصلہ افزائی ہیں۔ جب میں نے پاشائے مدوح کو اُن ابنیہ کی کیفیت بتلائی جو مسلمانانِ ہند نے مختلف اقطاع ملک میں اپنے افرادِ ملت کی تعلیم ادیتیوں کی پرورش و غیرہ کی غرض سے قائم کر رکھی ہیں۔ اور کہا کہ وہی صلہ افزائی کی سب سے زیادہ مستحق ہیں تو آپ نے اُن کا رِہا خیر کی نسبت بہت کچھ اظہارِ پسندیدگی فرمایا اور توقعِ ظاہر کی کہ انشاء اللہ مسلمانانِ رُکِ بھی اپنے ہندی بھائیوں کے ساتھ ایسی ہی عملی ہمدی ظاہر کرنے میں ساعی ہونگے جیسی کہ اُنکی جانب سے ہمیشہ ظہور میں آتی رہی ہے۔

اسکدار کو واپس ہوتے ہوئے ہم شفا خانہ فوجی سے گزرے اور تھوڑی دیر کے لئے وہاں بھی ٹھہر گئے۔ ڈاکٹر عزیز نے ہمیں اس ہسپتال کی قابلِ دید چیزوں کی سیر کرائی اور تیسرے پہر ہم اسلامبول کو لوٹ آئے۔

۲۸۔ اگست | ہمارے قیامِ قسطنطنیہ کا سب سے زیادہ دلچسپ دن آج کا تھا جو ہر لمحہ کی سیر میں گتا۔ یہ اناطولی ریلوے لائن پر ایک چھوٹا سا خوبصورت قریہ جس میں فیرکے ہائیوں واقع ہے جو رشیم اور قابیلین کا نہایت عالیشان کارخانہ ہے۔

۲۹۔ اگست | جس فرمان میں ہمیں نشانِ عثمانی عطا ہونے کی نسبت ارشادِ عالی تھا وہ آج صبح کے وقت پہنچا۔ یہ ایک سرکاری سند جو۔ طلالی حروف میں مرقوم۔ جس پر شاہی طغرائے ہوا ہے جوڑکی کے تمام سرکاری کاغذات پر ہوتا ہے۔

افسران تونجانه





نہیں جن جن

تہا نہیں۔ یہ

ہیں کہتے ہیں۔

ہر زمان کی وساطت

بہرگز جو نقطہ

ہر گت آج

نہیں کے وزیر تو

ہی غیر معمولی

تو ہمیشہ تھی کہ

نہیں رہا تھی کہ

نہیں تھی کہ

نہیں تھی کہ

نہیں تھی کہ

نہیں تھی کہ

نہیں تھی کہ

نہیں تھی کہ

نہیں تھی کہ

نہیں تھی کہ

نہیں تھی کہ

نہیں تھی کہ

نہیں تھی کہ

مقام خلافت

آج ہمیں جن جن قابل ذکر شخصوں سے نیاز حاصل ہوا ان میں سے ایک امیر البحر
عزت پاشا ہیں۔ یہ صاحب ترکی صیفہ بحری کو تقویت دینے کی بہت ہی ضرورت
محسوس کرتے ہیں۔ چونکہ آپ انگریزی بلا تکلف بول سکتے ہیں ہم آپ کے ساتھ
بغیر ترجمان کی وساطت کے ہی بخوبی بات چیت کر سکے۔ کپتان سی۔ جی مارکس صاحب
ایک انگریز جو قسطنطنیہ میں مدت سے رہتے ہیں۔ انہوں نے ان سو ہماری کئی فائدہ کما
۳۰۔ اگست | آج ہم تو چنانچہ بین گئے کہ ہنر کسلنس ترکی پاشا سے نیاز حاصل کریں جو دولت
علیہ کے وزیر تو چنانچہ مات ہیں۔ مگر چونکہ آج انہیں اپنے فرائض متعلقہ میں بہت
ہی غیر معمولی مصروفیت تھی ملاقات نہ ہو سکی۔ ہمیں ان سے ملنے کی اس خیال سے زیادہ
خواہش تھی کہ آپ کی اجازت سے ایمپیریل ٹری سکول دیکھ سکتے۔ مگر افسوس کہ وہ
آرزو باقی رہ گئی۔ پھر ہم بالعالی کو گئے۔ جہاں ہم کو ہنر کسلنس مدح پاشا مستور
تعارف حاصل ہوا۔ یہ ترکی کے ایک پُرانے سولین ہیں اور وزیر داخلہ کے منصب
ذمہ داری پر ممتاز۔ ہم نے آپ سے عرض کیا کہ ہم ہفتہ عشرہ میں دولت علیہ کے
قدیم پائے تخت بروسہ کو روانہ ہونا چاہتے ہیں۔ آپ نے کمال عنایت سے فرمایا
کہ میں والے بروسہ کے نام پیغام بھیج دوں گا کہ آپ کو وہاں کی سیر کرنے میں ہر طرح
سامان سہولت بہم پہنچا دیں۔ ہم نے اس مہربانی پر آپ کا شکریہ ادا کیا اور قریباً
آدھ گھنٹہ کی دلچسپ گفتگو کے بعد وہاں سے رخصت ہوئے۔

یکم ستمبر | آج جلوس کا دن تھا جس میں قسطنطنیہ کے لوگ علیحضرت سلطان العظمیٰ کی
تخت نشینی کی سالگرہ مناتے ہیں۔ جو عظیم الشان نفاذہ ہم نے آج شام کو دیکھا۔
اسے ہمارے دل سے اس انتظار کی تمام کوفت بھلا دی۔ جو ہمیں اس جلوس کی یاد دلا

کے شوق دید میں بہت دنوں تک کرنا پڑا تھا۔ قسطنطنیہ کے دلکش محل وقوع اور اس کی
قدرتی و لفریبیوں کا کچھ ذکر میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ آبنائے باسفورس کے دونوں
طرف پہاڑی پر وہ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی عمارتیں۔ وہ شاندار مساجد، کچھ قلعے
سے دیکھتے تو بس ایسا معلوم ہوگا کہ یہ خاک و خشت کے بنے ہوئے انسانی مسکن
نہیں ہیں بلکہ ایک دل آویز تصویر ہے جسکے کھینچنے میں کسی بڑے کاریگر نے
اپنا کمال ہنر ختم کر دیا ہے جب معمولی حالت میں اس عظیم الشان شہر کی کیفیت
ایسی نظر فریب ہو تو بھلا اس حالت خاص کا ٹھیک ٹھیک نقشہ کھینچنے کے لئے
موزون الفاظ کہاں مل سکتے ہیں جبکہ اس تمام بستی میں چراغاں کیا گیا ہو جیسا
کہ یہاں ہفتہ کے دن کی شب کو ساگر سلطانی کی مبارک تقریب پر کیا گیا اوقت
شہر بالکل ایک بقیعہ نور نظر آتا تھا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ لوگوں نے روشنی کرنے
میں طرح طرح سے کمال ہنرمندی دکھلایا تھا۔ جابجا روشنی کی محرابیں بنی ہوئی
تھیں۔ گھر گھر کے دروازوں اور درپچوں میں جا پانی لائینس رات کو دن
بنارہی تھیں۔ بازاروں میں چپہ چپہ پر چھنڈے کھڑے اور پرچم لہرا رہے تھے
جدھر نظر اٹھاؤ نشان بلال مجسم فخر و سرت بنے چمک رہے تھے۔ گویا شہر کی ہر
خاصہ ایک طلسم حیرت ہے جس نے جادو کے زور سے قلبِ مہبت کے بعد یہ شکل
خستہ کیا کر لی ہے۔ مسجدوں کے منبر و نشانِ نبیؐ اور سینار نور سے چلے پہنچے
ہوئے ہیں اور اندر جھاڑوں فانوسوں کی کثرت سے گویا ایک دریائے نور
ہے کہ موجیں مار رہا ہے۔ تمام سرکاری عمارات اس مبارک تقریب پر تہا
خاص سے سجائی گئی تھیں اور بڑی رات گئے تک ہم نے دیکھا کہ مردوں و عورتوں

کے غول کے غول بازاروں میں چراغاں کا تماشا دیکھتے پھرتے تھے۔ مجھی پتا
خاص طور پر قابل توجہ معلوم ہوئی کہ آج کی رات اعلیٰ حضرت سلطان العظم کی مسلمان
رعایا کی طرف سے تو خیر جتنا کچھ بھی اظہار عقیدت و مسرت ہوتا کہ تھا لیکن تب
یہ ہے کہ غیر مسلم رعایا کی دوکانوں مکانوں کی روشنی و آرائش اُسے بھی ماند کرتی
تھی۔ آبنائے باسفورس کا منظر خصوصیت سے دلفریب تھا۔ کشتیوں کے گھاٹوں
کے ارد گرد۔ جہاں باسفورس کو جانولے سیٹمبر ٹھہرتے ہیں اور اس وقت بھی کئی
سیٹمبر ادھر ادھر چکر لگا رہے تھے۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔
تیسرے پہر بہت سے آدمی آبنائے کے پرلی طرف چلے گئے تھے تاکہ واپسی کے
وقت روشنی کا تماشا دیکھیں شام کے بجے جبکہ روشنی شروع ہی ہوئی ہم بھی ایک
سیٹمبر پر سوار ہو گئے۔ اور دیکھا کہ سیٹمبر پر ہر شخص سامنے کے دلفریب نظارہ سے ایک
عالم بخودی میں آیا ہوا ہے۔ جن شاہی عمارات و محلات کا میں تراپیہ کی سیر کے
ضمن میں کر کر چکا ہوں۔ اور جو زیادہ تر خاندان شاہی۔ ممبرانِ خاندانِ خدیوی
اور نیز عمائد سلطنت سے متعلق ہیں۔ انکی روشنی و آرائش میں غیر معمولی اہتمام اور
فراخ دلی سے کام لیا گیا تھا۔ اور اس منظر نورانی کا عکس پانی میں پڑ کر سیلوں تک
ایک عجیب ہی تحیر خیز سماں پیدا کر رہا تھا۔ عمارتوں کی ٹیٹ پر اوپر تلے مسلسل
پہاڑیاں واقع ہیں ان پر بھی روشنی کی گئی تھی اور الفاظ پادشاہم چوق یشا روشن
حرف میں کئی کئی طرح بڑی خوبصورتی سے لکھے گئے تھے جن سے مختلف مشرقی
رسوم خط کا کمال ظاہر ہوتا تھا۔ بہت سی کشتیاں بھی بقیہ نور بھی ہوئی تھیں اور
جب وہ ادھر ادھر آتی جاتی تھیں تو گویا روشنی کے بڑے بڑے ستون حرکت

نظر آتے تھے۔ بعض ناشائی بڑی کشتیوں کو چھوڑ کر کشتیوں میں بیٹھنا پسند کرتے تھے اور ہنرمند ملاح انہیں لئے لئے دوسری چھوٹی کشتیوں اور سیٹروں کی پھیڑا نہیں آتا۔ بھاڑ کو چہرتے ہوئے ادھر سے ادھر کھجالتے تھے۔ ایسے بہت سی اطلال و قریب دیکھ کر ان کشتیوں پر بیٹھنا خالی از خطر تو نہ تھا مگر ماں اس میں شک نہیں کہ بہت سیٹروں کے ان پر سے قناشا کہیں زیادہ نظر آتا تھا۔ کیونکہ وہ جہاں چاہتیں بے تکلف و بے جاہر ٹھہر جاتی تھیں چنانچہ ہم نے دیکھا کہ ایک بند کے پاس جہاں سلطان کے کسی رشتہ دار کے مکان کے سامنے باجہ بچ رہا تھا جسے سنے کو بہت سی ترکی خواتین بھی انکو جمع ہو گئی تھیں اور روشنی کے دروازوں اور محرابوں کے تلے جو اس موقع کے لئے تیار کی گئی تھیں چپ چاپ بیٹھی لطفِ نظارہ اٹھا رہی اور جہاں پہلی کو کچھ سُن ہی تھیں۔ وہیں چھوٹی کشتیاں بھی بیسیوں آٹھری تھیں۔ ایشیائی ساحل یعنی فرمانِ خاص کا منظر بھی گونبہ ذرا دور تھا مگر اپنی دلفریبی اور شیش میں کچھ کم نہ تھا۔ وہ ایسا خوبصورت و معلوم ہوتا تھا کہ گویا فردوسِ بریں رُوئے زمین پر اتر آیا ہے اور اس بنا کہ قریب شادمانی کی طرف لطف آمیز بستم سے تک رہا ہے۔ چونکہ چاند بھی اس وقت پُورے جہاں پر تھا وہ اس سین کی آمدنی ہوئی دلفریبی کو اور جی دو بالا کر رہا تھا۔ اور جب چاند مہتاب آبنائے باسفورس کی لہروں پر آن کے پڑتی تھی تو ایسی کیفیت نظر آتی تھی جس کی سحر کاری روزِ روز دیکھنے میں نہیں آتی حقیقت یہ ہے کہ اس کا لطف دیکھنے ہی سے تعلق لگتا ہے اور یہ کسی بڑے جادو نگار کا ہی کام ہے کہ اس کا ٹھیک ٹھیک نقشہ بھیج سکے۔

مجھے یہ بھی کہ حیرت و حسرت ہوئی کہ اس تقریبِ سجدہ کے پروگرام میں شہزادی

مقام خلافت

کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس سی میری یہ مراد نہیں کہ آتش بازی اگر اچھی ہو تو بھی
 جیسے اس کا لطف نہیں آتا۔ بچہ تھا تو آواز بچوں کی طرح مجھ کو بھی اس کا بڑا شوق تھا
 اور اب بھی اسے دیکھ کر ایک قسم کا لطف تو ضرور آتا ہے مگر جب سے کچھ ہوش سنبھالا
 بیٹیں سمجھنے لگا ہوں کہ اس پر روپیہ خرچ کرنا گھر بھونک تماشا ہوتا ہے اور اسی لئے
 میں اُن احباب کا ہمدرد و موید ہوں جو شبِ برات وغیرہ تہواروں پر آتش بازی
 کا بربادی بخش رواج موقوف کرنے کی فکر میں ہیں تاکہ وہی لاکھوں روپیہ جو ہر سال
 اس سرافِ بچا کی نذر ہوتا ہے کسی اور بے ضرر مشغلہ یا مفیدِ عام کارِ خیر میں صرف
 ہوا کرے۔ پس ناظرین میری اس خوشی کا اندازہ خود ہی کر سکتے ہیں جو مجھے سینکر
 حاصل ہوئی کہ کچھ عرصہ سے اس تقریب پر آتش بازی چھوٹنے کی اعلیٰ حضرت نے
 بذریعہ فرمانِ خاص مانعت فرمادی ہے اور حکم ہو گیا ہے کہ جو زبردِ کثیرِ مالِ حکومت
 یا دیگر اشخاص قبل ازیں آتش بازی میں بھونک کر خاکِ سبہا کر دیا کرتے تھے
 وہ آئندہ سے دارالبحرہ و محلِ خانہ کی اعانت میں دیا جائے۔ اعلیٰ حضرت
 کی یہ کارروائی فی الواقع نہایت ہی مستحقِ ستائش ہے اور قابلِ تقلیدِ جلوں
 ہمایوں کی تقریب پر مختلف شکلوں میں صدقات و خیرات اور داد و دہشِ ٹپی
 کثرت سے ہوتی ہے۔ اس روز ایک ہی دن میں کئی جگہ رسمِ ختنہ ادا ہوئی جیسے
 حمیدِ ہسپتال میں ہم نے بھی دیکھا۔ اس دن قریباً تین سو لاکھوں کا ختنہ تو
 اس ایک ہی جگہ کیا گیا۔ شہر بھر میں خدا جانے کہاں کہاں اور کتنے مختون
 ہوئے ہونگے۔

ستمبر آج ہم پھر دارالبحرہ میں گئے کیونکہ وہاں کل رسمِ ختنہ دیکھنے کا وعدہ پُر ہوا

ذکر سکے تھے۔ وہاں سے لوٹے ہوئے آرمینی لوگوں کا گورستان دیکھا جسکی نگہداشت
 مثل اکثر مسیحی قبرستانوں کے نہایت عمدگی سے کی جاتی ہے۔ اس میں کئی بڑے
 خوبصورت یادگاری کتبے نصب ہیں جو بعض مخیران ملت کی یادگار میں کھڑے
 کئے گئے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں آرمینین قوم کی ترقی و فلاح کے
 کاموں کی اعانت کے لئے اپنی دولتیں وقف کر دی تھیں۔ آج کی شام کا وقت
 ایک اور ایرانی ضیافت کے لئے رکھا گیا تھا۔ مرزا حسن اصفہانی معتمد التجار نے
 جنکے ہوٹل میں تشریف لایا کتنا ذکر یہ ہیں اس روز ناچہ کے شروع میں گرچا پلہا
 ہمیں مدعو کیا تھا اور پس اک اور بھی ممتاز ایرانی جہانوں کو اس میں شریک
 ہونے کے لئے بلوا دیا تھا۔ چونکہ ان احباب میں بعض ایسے بھی تھے جو حال
 میں ایران سے آئے تھے اور جلد ہی وہیں وطن مالوف کو واپس بھی جانا تھا
 ہمیں اس تقریب پر ایران کی موجودہ حالت سے آگاہی حاصل کرنے کا بہت
 کچھ موقع ملا۔ منجملہ انکے ایک صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یعنی ڈاکٹر شیخ محمد
 طہرانی۔ جو پائے تخت ایران کے ایک قابل و تجربہ کار ڈاکٹر ہیں۔ آپ نے ڈاکٹری
 تعلیم پیرس میں پائی ہو۔ اور حال میں آپ نے یورپ کا جو سفر کیا وہ اپنے
 بیٹے سے جا کر ملنے کی غرض سے تھا جو وینا د پائے تخت آسٹریا میں ڈاکٹری
 پڑھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہیں سے انہی دنوں لوٹے تھے۔ ایک اور صاحب
 جو ہم سے ملے حاجی سید احمد آغا تھے جو طہران کے بڑے بھاری جوہری ہیں
 اور ان دنوں کاروباری اغراض سے سیاحت یورپ کر رہے تھے۔ ہم نے
 ان سے سفر طہران کا شوق ظاہر کیا۔ انہوں نے ہمیں اپنا پتہ دیا اور فرمایا کہ

جب آپ کو اُدھر شریف لانے کا اتفاق ہو تو غریب خانہ پر ضرور قیام کجیگا۔ آپ نے
 دُنیا کے چند ایرانی تجار کے نام مغربی چٹھیاں دینے کا بھی وعدہ فرمایا کہ شاید دُنیا
 کے مختصر قیام میں ہمیں کبھی اُن کی ضرورت پڑے۔ چُونکہ ہم ایرانیوں کے ساتھ
 (فارسی زبان میں) باکسانی گفتگو کر سکتے تھے۔ شام کو دیر تک برابر مزے مزے
 کی باتیں ہوتی رہیں اور ہم نے جو چند باتیں اپنے ایرانی احباب سے چوچیں تو
 اُن سے مسائل متعلقہ پر بہت سی دلچسپ بحثیں چھڑ گئیں منجملہ انکے ایک تعلیم نسل
 کا مسئلہ تھا جسے میں نے شروع کیا اور پھر اس پر خوب گرامری سے حرج و مرج
 ہوتی رہی۔ علماء ایران میں سے ایک صاحب نے جو اُس وقت موجود تھے یہ بتا
 تو مان لی کہ عورتوں کو تعلیم ضرور دینی چاہئے مگر صرف اسی قدر کہ اپنے حقوق و
 فرائض دینی کے مسئلہ مسائل سے واقف ہو جائیں قرآن شریف پڑھ سکیں اور
 نیز انتظام خانہ داری و تربیت اطفال کی قابلیت سے بے بہرہ نہ رہیں۔ ہمارا
 دوست حاجی زین العابدین بھی شریف رکھتے تھے۔ جن کے خیالات بشکل
 اور پولیشکل معاملات میں بڑے آزادانہ ہیں۔ آپ کی یہ رائے تھی کہ عورت کے
 حقوق تعلیم کے بارے میں مرد سے کچھ کم نہیں۔ اس بحث میں بعض احباب تو
 ایک طرف تھے اور بعض دوسری طرف۔ ابھی مسئلہ زیر غور و تفسیفہ طلب ہی تھا
 کہ اتنے میں ایک فقیہ صاحب بطور ثالث بیچ میں پڑ گئے کہ مولانا صاحب نے
 مذہبی اور علمی تعلیم کو جس حد تک ضروری قرار دیا ہے وہ عام طور پر تو میرے نزدیک
 بھی کافی ہو لیکن جو لوگ اپنی بہو بیٹیوں کو اس سے ذرا اعلیٰ تر تعلیم دینا چاہتے
 اور اسکی قدرت بھی رکھتے ہوں تو بہت اچھی بات ہو اس کی مخالفت نہونی چاہیے

مقام خلافت

اس سے صاف عیاں ہو۔ کہ ایران کے بعض علماء ہمارے ہندی بزرگواروں سے بلحاظ روشن خیالی کہیں بڑھے چڑھے ہوئے ہیں۔ نیز اس سو یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے زیر بحث معاملات دنیا کے تمام حصوں میں قریب قریب ایک ہی ہیں۔

۱۔ ستمبر چونکہ دارالشفقتہ کے پرنسپل صاحب نے ہم سے قرارداد کی تھی کہ گوانوں تعطیل ہو لیکن تین مہینہ ممبرانِ سٹاف کے آپ کو یہیں ملوگا۔ پس ہم آج اس درسگاہ میں گئے یہ ایک عظیم الشان عمارت ہے جو سلطان عبدالغفریہ رحمہ کے زمانہ میں عام چندہ سے تیار ہوئی تھی اور اب اسے کچھ توسرکاری امداد ملی ہے اور کچھ اسی وقت کے سرمایہ محفوظ کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ نصابِ تعلیم میں عام دسترس ریس کے ساتھ کسی قدر دستکاری دخل ہے۔ اور دینیات کو بھی لازمی رکھا گیا ہے۔ پرنسپل صاحب صاحبِ تعلیمی امور کا مقول تجربہ رکھتے ہیں۔ آپ نے اس بارہ میں بڑے شوق سے گفتگو کی کہ دنیا کے مختلف حصوں میں تعلیم کے کیا کیا طریق مروج ہیں۔ یہ امر خاص طور پر دریافت فرمایا کہ حضراتِ علماء کو علومِ جدیدہ سے مانوس و بہرہ اندوز کر نیکی لئے آپ لوگ ہندوستان میں کیا کر رہے ہیں؟ اور کہا کہ میرے نزدیک اگر آپ ہندوستان سے کچھ طالبانِ علم ایسے بھیجیں جو عربی فارسی خاصی اچھی جانتے ہوں اور وہ علومِ جدیدہ کی تحصیل تکمیل استانہول میں کریں تو اس میں بڑی کامیابی کی امید ہے۔ تعلیم جو آئندہ کے لئے اوس ضروری ہے۔ انہیں بلا اسلامیہ ہی میں حاصل ہو سکتی ہے۔ فرمایا کہ مثلاً یہاں انکو وہ پہلے تڑکی زبان سیکھیں جو چھ مہینے میں خاصی کام چلانے کے قابل آسکتی ہے۔ پھر ان میں انگریزی یا طبیعیات کی تعلیم دے اس سے کہیں تھوڑی مدت میں حاصل کر سکتے ہیں جتنی کسی یورپی زبان کو ذریعہ

مقامِ خلافت

یکھنے میں نہ کار ہوگی۔ یہاں ایسے طالب علم کا خرچ ٹھیننا بچھتر روپے ماہوار ہوگا۔ جو طلبا اسکو برداشت نہ کی مقدار نہ رکھتے ہوں۔ انکو حامیان تجویز کے چندہ سے وظائف دینے کا انتظام ہو سکتا ہے۔ ہم نے پرنسپل صاحب اور چند ممبرانِ شاف کے ساتھ تمام عمارت کی سیر کی۔ اور اسے اُن جمیع ضروریات سے لیس پایا جو ایک جدید درسگاہ (سکول یا کالج) میں ہونی چاہئے۔ یہاں ایک سکول میوزیم ہے۔ ایک کیمیکل لیوور ریٹری۔ ایک صیغہ علم نباتات۔ ایک صیغہ علم حیوانات مصوٰی اور نقش کشی کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ طلبا کی دستکاری کے جو نمونے ایک کمرہ میں رکھے تھے اُن سے پایا جاتا تھا کہ فنون لطیفہ کی وہ اچھی قابلیت و صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہاں ہم نے ایک خاص بات یہ بھی کہ ایک صیغہ میں طلبا کو تار برقی کا کام بھی سکھایا جاتا ہے اور وہ محکمہ تار کے واسطے تیار ہوتے ہیں۔ عمارت مدرسہ کی بالائی منزل طلبا کا بورڈنگ ہوس ہے۔ اور نیچے ڈائننگ ہال ہے۔ جسکو ایک چھوٹی سی ریلوے لائن کے ذریعہ باورچیخانہ سے ملا رکھا ہے۔ اسی لائن پر ہی کھانا باورچیخانہ سے ڈائننگ ہال کو جاتا ہے۔ تمام طلبا کو یکساں دسی ملتی ہے یہی انہیں وقت پہنچی پڑتی ہے خواہ سکول سے باہر بھی ہوں۔ اگر کوئی طالب علم ملاوری پایا جائے یا مدرسہ سے باہر کچھ شرارت کرتا ہو تو پریکٹر صاحبان جو اس درسگاہ میں اکٹھے ہیں اسکو سزا دیتے ہیں۔

قبل اس کے کہ دارالشفقتہ کا یہ مختصر ذکر ختم کیا جائے یہ بیان کر دینا بھی بد محل نہوگا جو میں نے اس مدرسہ کے ایک معلم سے سنا تھا کہ حال ہی میں چار نوجوان مسلمان تار (وسط ایشیا) سے قسطنطنیہ آئے ہیں اور اپنی بیویوں کو بھی ساتھ لائے ہیں۔

کہ خود بھی وار الشفقتہ میں علم حاصل کریں اور انہیں بھی پڑھائیں۔ یہ نوجوان خواتین
 آجکل زمانہ نازل سکول میں معاشی کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور انکے شوہر کالج میں
 پڑھتے ہیں۔ چونکہ متاثر ہیں اور انکی بیویاں بھی انکے ساتھ ہیں اس واسطے کالج
 (بورڈنگ ہوس) کی لازمی سکونت سے بری کر دیئے گئے اور لمبے متعلقین
 میں رہتے ہیں۔ اس نظیر کی ندرت اور اسلامی جرات قابلِ توجہ ہے۔

جب ہم اس مدرسہ کو دیکھ بھال چکے تو ڈاکٹر ڈیوڈ ہمیں خواجہ موسیٰ کاظم افندی
 کے ہاں یکے جنگی نسبت انہوں نے ہم سے ذکر کیا تھا کہ بڑے روشن خیال مولوی ہیں
 اسلام کی فلاسفی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اس کے اصول و احکام کو جدید سنس
 سے تطبیق کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ اس وقت گھر پر نہ تھے۔

ہم ستمبر ایوں تو دار السعادة میں ساری ہی ملاقاتیں جنکا ہمیں موقع ملا نہایت پس
 رہیں۔ لیکن ایک ملاقات جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ پڑوسی میں کچھلی سبلا قاتلو
 سے بڑھ گئی۔ یعنی مارشل ادھم پاشا فاتح تھسلی سے ملاقات ہوئی۔

یہ وہ مشہور جرنیل ہیں جو اب سے چند ہی سال قبل ترکی کی تاج میں نمایاں کام کر چکے
 ہیں اس لمو ہمیں قدرتی طور پر ان سے نیاز حاصل کرنے کا از حد اشتیاق تھا۔ ترکی میں
 آجکل مشاہیر کی ایسی بے وقعتی ہے کہ محلِ سلطانی کے ایک مغز ہلکار نے جتنے کمرہ میں
 غازی ادھم پاشا سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ہم سے بڑے استقباب کے ساتھ پوچھا
 کہ ادھم پاشا سے آپ سے کیا واسطہ ہو اور انکو دیکھنے کے آپ اس درجہ اشتیاق کیوں ہیں؟
 ہم نے عرض کیا کہ ہماری اور کوئی غرض نہیں صرف انہیں دیکھنے کی خواہش ہو اور
 اس لمو کہ پاشا و مدوح جنگِ ترکی و یونان کے ہیرو ہیں اور تھسلی کے میدانِ کارزار

میں ترکی سپاہ کے سپہ سالار تھے۔ زمانہ جنگ میں چونکہ ہم انکی شجاعت و غیرت کے بہت کچھ جانتے
 اجاڑوں میں پڑھتے رہے ہیں لہذا ہمارا شوق دید بے محل نہیں۔ ہم صبح کے دس بجے
 محل شاہی میں پہنچے۔ تھوڑی دیر بعد پانچاویں صبح بھی تشریف لائی۔ ہم نے دیکھا کہ زمانہ
 جنگ سے اب تک انکے چہرہ مہرہ اور ڈیل ڈول وغیرہ میں کوئی بڑا فرق نہیں پڑا۔ انکی
 جو کچھ صورت اور تن و توش اُن دنوں بالصور اخبارات میں دیکھ چکے تھے
 فریبا بالکل سیاہی اب بھی پایا۔ جس خوش خلق و نوازش سے آپ نے ملاقات کی اور
 جیسی گرمجوشی و تپاک سے ہمارے ساتھ کوئی گھنٹہ بھر گفتگو فرماتے رہے وہیں
 مدت العمر نہ بھولے گی۔ جیسا کہ یہاں عام دستور ہو اور ہم پانچا کے ہاتھ میں بھی ایک
 تسبیح تھی۔ آپ ہم سے بات چیت کر رہے تھے اور تسبیح کے دانے بڑی تیزی کے
 ساتھ انکی انگلیوں سے نکل کر کھٹا کھٹ کرتے جاتے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے زمانہ
 سلف کے مسلمان نبرد آزماؤں کا خیال آیا جو طاعت و عبادت میں بھی ایسے ہی
 سرگرم و مخلص ہوتے تھے جیسے کہ حرب ضرب میں چمٹتے و مستعد۔ ہم نے اثنائ گفتگو میں
 اُن سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض لفظ جنگ کا کان میں پڑنا ہی آپ پر بڑا
 گھرا اثر ڈالتا ہے۔ اور آپ کے چہرہ سے وہ اثر نمایاں ہوتا ہے۔ اس پر آپ مسکرائے
 اور فرمایا کہ جس شخص کی ساری عمر فوجی خدمت میں گزری ہو اُس میں اس قسم کا احساس
 ہونا قدرتی بات ہے۔ فرمانے لگے کہ گزشتہ جنگ جاپان و روس کے زمانہ میں میری
 بڑی خواہش تھی کہ میدان کارزار میں کسی طرح اُڑ کر بھی جا پہنچوں اور لڑائی کا رنگ
 یکشم خود دیکھیں۔ میں اس کے واقعات بڑی گہری لچپی سے پڑھتا رہا اور اگر
 مجھے کو اجازت مل جاتی تو ضرور ہی جاتا۔ آپ نے ہماری اس دعا پر اپنی تازہ ترین

عنایت فرمانے کا وعدہ کیا۔ ہم آپ کی عنایت کا شکریہ ادا کر کے واپس چلے آئے۔
تیسرے پہر کو میں پھر احمد احسان بے سے ملنے دفتر ثروت الفنون کو گیا۔ قیطنیہ
میں میرے سب سے پہلے ملاقاتیوں میں تھے لیکن انفسوس کہ پہلی ملاقات کے بعد
سے اب تک میں اُن سے ملنے کو نہ جاسکا تھا۔ انہوں نے ہم سے وعدہ کیا تھا
کہ بروہہ کی سیر کے واسطے ایک سفارشی چٹھی لکھ دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے وراثت
خداوندگار کے سیکرٹری کے نام ایک خط مجھے لکھ دیا۔ آج کل بروہہ اسی لایٹ کا
صدر مقام ہے۔ آپ نے مجھے یہ بھی بتلایا کہ وہاں مقامی دستکاریوں کی ایک نمائش
کھولی گئی ہے۔ اور یہ نمائش بہت قابل دیدن ثابت ہوئی۔

۵۔ ستمبر | آج صبح میں ایک ایسے بزرگ کو دیکھنے کا موقع ملا جس کا وجود ایک خاص
اہمیت رکھتا ہے۔ ملاقات غیر متوقعہ طور پر ہی ہو گئی۔ لیکن سخت انفسوس ہوا اگر ہم اس
محروم رہتے۔ شیخ محمد عبدالہدی وہ بزرگ ہیں جنکے قیام قطنیہ کی مدت تو
اعلیٰ حضرت سلطان المعظم کے زمانہ حکومت کے قریباً برابر ہو گئی۔ لیکن سادات کرام
کے ایک محترم خاندان اور ایک مشہور سلسلہ اولیا میں سجادہ نشین ہو چکی شہرت آپ کو
عہد نماہوں سے پہلے ہی حاصل تھی۔ عام سیاحوں کو اُنسے شرف ملاقات کا شاذ و نادر
ہی موقع ملتا ہے۔ چونکہ آپ کسی منصب سرکاری پر مامور نہیں ہیں اس لئے کاروباری طبق
پر تو کوئی شخص آپ سے ملنے نہیں جاسکتا۔ اعلیٰ حضرت آپ کی فضیلت اور تقدسِ نہایت
کچھ عقیدت رکھتے ہیں اس لئے بہتیرے لوگ شیخ مدوح کی نظر عنایت کے آرزو مند
رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ آپ اپنے اس سوخ و اثر سے غرض مندوں کو فائدہ پہنچانے
سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ اس سبب سے ہر کسی کو اُنکے ہاں بار نہیں ملتا۔ باوجودیکہ

آپ کے درویش قہریم کے سامانِ اُحتِ قول جو قسطنطنیہ میں مہیا ہونے لگے ہیں ہر وقت
موجود ہیں۔ مگر آپ بالکل رویت نہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ آپ عربی کے اچھے فاضل
ہیں اور جو وقت فرصت آپ کو ملتا ہے اپنے طریقہ رفاعیہ کے متعلق کتابیں لکھ کر پیش کرتے
ہیں۔ ایشیائی رزم میں سید احمد رفاعی نام ایک ولی کامل گذرے ہیں۔ شیخ موصوف
انہیں کے سلسلہ میں لوگوں سے بیعت لیتے ہیں۔ انکے ہاں ذکر بالہر کا طریق جاری
ہے اور اس بات پر بڑا زور دیا جاتا ہے کہ طریقت اور شریعت دونوں کو پہلو پہلو
لمحوظ رکھنا چاہئے۔

جب ہم نے باہر کے پھانک پر شیخ موصوف کے ملازم کو اپنے کارڈ دیے اور کہا کہ
ہم شیخ مدوح کی زیارت کرنا چاہتے ہیں تو وہ بظہر تعجب ہماری طرف دیکھنے لگا اور انہیں
کہاں موقع ملاقات کا حاصل ہو سکیگا۔ تاہم وہ کارڈوں کو لیکر اندر چلا گیا اور ہمیں ایک
دیوانخانہ میں بٹھلایا۔ ایسی ہمیں بیٹھے چند ہی منٹ گذرے تھے کہ ہمیں اندر
طلب کر لیا گیا۔ ہم ایک صحن اور چمن میں سے گذرتے ہوئے حضرت کی خدمت
میں پہنچے۔ ایک بڑے عالیشان اور آراستہ کمرہ کے ایک کونے میں آپ تشریف فرما
تھے۔ چھوٹا سا سبز عمامہ سر پر تھا اور ایک ڈھیلا ڈھالا چوغہ زیب پر۔ شکل بہت
بی بارعب و موثر پائی ہو۔ آنکھ میں ایک خاص تاثیر ہے جو ایسے لوگوں کا حصہ ہے۔
جب ہم اندر داخل ہوئے تو آپ نے لطف آمیز بزم فرمایا اور بڑی مہربانی سے پیش
آئے سستی کے ہمارے دلوں میں سنی سنائی باتوں کی بنا پر انکی طرف سے جو خیالات
بے التفاتی کے پیدا ہو گئے تھے وہ سب یک لحنت دُور ہو گئے۔ اثنائے گفتگو میں
ابلا و سہلا کے الفاظِ خیر مقدم اکثر آپ کی زبان مبارک پر آتے تھے۔ آپ کی گفتگو

دنیوی معاملات کے متعلق نہ تھی بلکہ سراسر مذہبی اخلاقی پسند و نسیخ پر مشتمل تھی۔

کہیں کہیں اپنی مذہبی تصانیف اور رفاہی بزرگان سلف کے اقوال و تحریرات کا

حوالہ بھی ہوتا تھا۔ آپ نے ازراہ مہربانی اپنی بعض تصنیفات کے نسخے بھی ہمیں

مرحمت فرمائے۔ اور یہی ارشاد کیا کہ کل شام کو یہیں کھانا کھائیے اور ذکر کے حلقہ

کو بھی دیکھئے جسے ہم نے بطیب خاطر منظور کیا اور ان سے رخصت ہو کر گھر گئے۔ اس لئے مسلمان

۶۔ ستمبر آج صبح کو ہزار کسلسنی نظیف بے ہم سے ملنے آئے جنکے دفتر کو ہم ایک دن بڑا کیونکہ بڑی

بغرض ملاقات گئے تھے۔ مگر وہ اسوقت وہاں موجود نہ تھے۔ اب آپ ملاقات باز دیدہ کیلئے

کے واسطے تشریف لائے۔ آپ فارسی بول سکتے ہیں۔ چونکہ ہزار کسلسنی ملازمت سکر کی کامیاب ہو کر ہم

اختیار کرنے سے قبل ایک مشہور مصنف اور قانع نگار رہ چکے ہیں۔ بڑے خوش حال چھوٹے

اور مذہبی معاملات میں وسیع المعلومات ہیں۔ اسوجہ سے آپ کی ملاقات میرے لئے چند اہم اور

آور بھی باعث ستر ہوئی۔ ٹو گویا پائے تخت جاپان میں جو مذہبی کانفرنس منعقد تھی۔ اس پر انہوں

ہونے والی تھی وہ اگر ہوتی تو اس میں شریک ہونے کے واسطے جو وفد ترکی سے پہلے کا شغل

روانہ ہوتا اس کے ایک ممبر ہزار کسلسنی بھی منتخب ہوئے تھے۔ میں نے آپ سے پہلے کے

یہ خیال ظاہر کیا کہ مسلمانان عالم کی ایک عام کانفرنس قائم کیجائے جس میں تمام اقطاع

کے چیدہ چیدہ اشخاص شامل ہو کر مسلمانان کے مذہبی تمدنی اور تعلیمی معاملات پر

غور و خوض کیا کریں اور جس سے تمام مسلمانوں کا سود و بہبود بلا کسی استیسا و تفریق

کے مقصود ہو۔ ہزار کسلسنی نے اس رائے سے اتفاق کیا اور فرمایا و قہی اس کی بڑی

ضرورت ہے۔ میں نے عرض کیا کہ نظر بحالات موجودہ اس قسم کی کانفرنس یا

تو ہندوستان میں برش جھنڈے کے زیر سایہ قائم ہو سکتی ہے یا کسی مصر

جیسے مقام پر جہاں عہدِ برطانیہ کی برکت سے تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ ٹکی والوں میں سے جو لوگ اس میں شریک ہونا پسند کریں انکے لئے مصر کا مقام اس کانفرنس کے قیام کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ میں نے کہا اسے میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ مصر اس مقصد کے لئے ایک اچھا مرکز و موقع ہوگا اور چونکہ اس ملک کی زبان عربی ہو۔ اس لئے مسلمانوں کی ایک عالمگیر کانفرنس کے لئے وہ اور بھی زیادہ مناسب ہو۔ کیونکہ عربی کو کم و بیش تمام ممالک کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو کلامِ قرآن سمجھ سکیں گے۔

آج سہ پہر کو ہم پھر شیخ محمد عبداللہ دہی کے مکان پر گئے۔ آپ اس وقت باغیچہ میں ایک چھوٹے سے بیچ پر تشریف رکھتے تھے۔ آپ کا ایک مرید بھی پاس تھا۔ ہمیں چند اور مرید آنکر ارد گرد بیٹھ گئے۔ گفتگو قلب اور زبان کے متعلق ہو رہی تھی۔ اس پر انہوں نے نہایت عالمانہ بحث کی۔ جب شام ہونے لگی تو پہلے کچھ سماع کا شغل شروع ہوا۔ پھر ان کے تین مرید ملکر عربی کا ایک قصیدہ بلا دیا۔ مرزا میر ٹیپٹے لگے جو سید احمد رفاعی کی شان میں تھا۔ شیخ موصوف کے ہاں اس زبانی ترجمہ کے سوائے اور کسی قسم کا سماع مروج نہیں ہو۔ بعد ازاں شیخ صاحب قرآن نے نماز کی غرض سے اندر چلے گئے اور باقی حاضرین مسجد کو جو احاطہ مکان ہی میں بنی ہوئی ہے۔ نماز کے بعد کھانے کا وقت تھا۔ اور کھانے کے بعد نمازِ عشا کا وقت۔ ان سب کاموں سے فراغت پا کے ذکرِ بالجہر شروع ہوا جس میں تمام اہلِ حلقہ مل کر لا اِلهَ اِلَّا اللہ کے نعرے اس زور سے ادا کیے کہ گونگنار و موثر الجہہ میں لگاتے تھے کہ دل ہلائے ڈالتے تھے۔

۱۔ ستمبر آج جو جمعہ سو کاظم آفندی مع ڈاکٹر ڈیوڈ کے تشريف لائے۔ ہم انکے ساتھ
مسکے تعلیم سنوان پر گفتگو کرتے رہے اور انہیں اس کا بڑا موید پایا۔ آپ کی یہ رائے
تھی کہ اکثر و بیشتر خواتین کے لئے تو معمولی توشت و خواندہی کافی ہوگی۔ لیکن
جنہیں اسکی مقدت ہو انکو اعلیٰ تعلیم کی بھی اجازت ہونی چاہئے۔ پروہ کے بارہ
میں فرمایا کہ ٹرکی میں جیسا پردہ مروج ہے وہ بالکل کافی اور حق بجانب ہے۔ کیونکہ گویا
باہر بھگنے والی مستورات منہ پر نقاب ڈالکر اور خراجہ اوٹھ کر پھرتی ہیں۔ تاہم انہیں
اتنی آزادی تو حاصل ہے کہ تازہ ہوا کھانے کو جا سکیں اور وقت بے وقت
اپنے حسب منشا رسوا خرید سکیں۔

نماز جمعہ کے بعد ہم نے طریقہ مولویہ کے درویشوں کی مجلس کی جیسا جو ملاناے
رومی جیسے بزرگ کے نام لیاوا ہیں۔ اور ہر جمعہ اس تعلق عقیدت کی یادگار تازہ
رکھنے کے لئے مجلس حلاج کرتے ہیں۔ بلا دیورپ میں یہ لوگ درویشان بقاص
کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ درویش اپنے بال کے برآمدہ میں سے اجنبیوں کو بھی
تماشا دیکھنے کی اجازت دیتے ہیں اور اسے ایک ذریعہ آمد بنائے ہوئے ہیں۔
یورپ کے سیاح بخت ہر جمعہ یہ تماشا دیکھنے آتے ہیں اور اسے عجائبات شہانزل
میں سمجھتے ہیں۔ ہمیں یہ بات پسند نہ آئی کہ یہ لوگ اس طرح اس سم کو جان کے نزدیک
مذہبی رسم ہو۔ ذریعہ آمدنی بنائیں اور اغیار کے لئے تماشا بنیں۔ اس مجلس کی صورت
یہ ہے کہ درویش آدمی رہنما درویشوں میں سے ساز بجاتے ہیں۔ اور باقی قص کے جامے
پنوار ملنا پہن کر قص کرتے ہیں۔ مگر اس قص میں انہیں سجدہ ہونے نہیں دیکھا۔ غالباً
لہ وجہ۔ ترکی زبان میں علم کو کہتے ہیں اور اکثر علماء اس لقب سے پکارے جاتے ہیں۔



درویشان ایتیم بود

بہن نے تو اسے ایک
ساتھ دست و پا کی
بال نے مجھے ایک
ناتوا کو اسے سر
نے بیان کیا کہ
دھڑ میں کھڑے
کو دیکھ کر غیب
پنے گردن پائے
کے ہاتھ پائے
بیاضی کی چتر
بائیں کے گرد
پہنے گئے اس
سب نے دیکھے
ہن کہتے تھے کہ
مگر اب ہے۔ مگر
حق کے
ان خصوصیت
ہوتے ہیں۔

اسکی ابتدا تو یہی ہوگی کہ صاحبانِ حال فرطِ بیخودی سے رقص میں آگئے۔ لیکن اب موجود
 یارانِ طریقت نے تو اسے ایک فن بنالیا ہے۔ اور بیٹھے بیٹھے جھٹ اٹھ کر ساز کی
 آواز کے ساتھ دست و پا کی حرکات کو بلا تے ہیں اور رقص کرنے لگتے ہیں۔ ایک
 فاضل ترک نے مجھے ایک حکایت سنائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا
 کا یہ مشائخہ تھا کہ اُنکے سب پیرو بغیر صاحبِ حال ہونے کے یوں رقص کریں۔
 اس نے بیان کیا کہ روایت ہے کہ مولینا علیہ الرحمۃ ایک دفعہ تنہا بیٹھے تھے۔
 حالتِ وجد میں اُٹھ کر رقص فرمانے لگے۔ دو چار مُرید جو آئے۔ اُنہوں نے
 ارشاد کو دیکھ کر تقلید کی۔ کچھ دیر کے بعد جب مولینا ہوش میں آئے۔ تو مریدوں
 واپس گھر دنا چتے پایا۔ ہنسے اور ارشاد کیا۔ میں نے تو کچھ دیکھا تھا اس لئے
 خوشی کے مارے ناچنے لگا۔ تم نے کیا دیکھا ہے جو ناچ رہے ہو۔ مشنوی شریف
 میں ایک کوٹری کی حکایت ہے کہ اُس نے اپنے حیلے سے شیر کو کنوئیں میں گرا دیا
 تھا اور کنوئیں کے گرد خوشی سے ناچ رہی تھی۔ جنگل کے اور جانور آئے اور اُسے
 دیکھ کر نلچنے لگے تو اُس نے انہیں کہا کہ میں نے تو کچھ دیکھا ہے جب ناچ
 رہی ہوں۔ تم بے دیکھے بھالے اور بے جانے بوجھے کیا کر رہے ہو۔ میرے
 فاضل دوست کہتے تھے کہ اس حکایت میں مولینا نے اپنے اس واقعہ کی طرف
 اشارہ فرمایا ہے۔ مگر افسوس اُنکے نام لیا اس ہدایت کی طرف سے بے پروا
 ہیں۔ اس خرقیت کے درویشوں کا ایک خاص لباس ہے جس میں منہ کی لمبی ٹوٹی
 ناک رنگ کی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے اور وہ ہر جگہ اس اپنی وردی سے
 پہچانے جاتے ہیں۔

مقام خلافت

۲۵۷

۸۔ ستمبر | آج ہم دفترِ صنیعہ خارجیہ کو گئے تاکہ اجازت حاصل کریں کہ جلال اُنسی بے سیرِ بروہہ میں ہمارے ساتھ رہیں۔ یہ اجازت اُسی وقت مل گئی۔ اور سہاری روٹنگی اور فاکس کے ساتھ بروہہ سہ شنبہ کے روز قرار پائی۔

۹۔ ستمبر | اس تاریخ میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

۱۰۔ ستمبر | آج ایک ایسے شخص ہم سے ملنے تشریف لائے جنکی ملاقات ہمارے لئے بات کی ترقی پر نہایت دلچسپی کا باعث ہوئی۔ وہ کون؟ حاجی یوسف بے بھری کالج واقعہ حیدر آباد کا بڑا ہلکی کے پروفیسر انگریزی جو بلحاظ پیدائش باشندہ سکائینڈ ہیں لیکن اُنکے خاندان میں کچھ بہت کے تمام اراکین مع اُنکے والد بزرگوار کے مشرف باسلام ہو چکے ہیں جسے چار ماہ گئے اور سال سے اوپر عرصہ گزرا۔ آپ کا خاندانی نام کاسل ہے۔ اور جس ماہ یہ گھرانہ لاہور کی گئی میں داخل ہوا ہوں ان دنوں انگلستان میں اس تبدیل مذہب کا بہت چرچا ہو رہا ہے کہ کو جانے حاجی صاحب مدوح کے قبولِ اسلام کی قدامت کو ملحوظ رکھ کر یہ سمجھنا چاہئے کہ یہی تیار کیا میں نے ان سے پہلے کا نو مسلم انگریز کوئی نہیں دیکھا۔ حاجی صاحب تاریخِ مقررہ سرکار زبان ایسی بے تکلف اور بلا تکلف بول سکتے ہیں کہ گویا وہ انکی مادری زبان ہے۔ ستمبر | آج صبح اور علاوہ اس کے اور بھی کئی زبانیں جانتے ہیں۔ آپ ایک بڑے سیاح بھی ہیں۔ مختلف صوبجاتِ ترکی کے متعلق پوری پوری معلومات رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس کئی سال سے اکثر حصص آپ کے چھانے ہوئے ہیں۔ عبادات و معقولات اس سے انہیں بڑی گہری واقفیت ہے۔ ایسی سطحی معلومات نہیں جو اکثر نو مسلموں کے ذہن کے قریب کرتی ہیں۔ آپ کی ملاقات میں ہمارا جو وقت صرف ہوا وہ بہت ہی لطیف اور اگر ہمیں سیرِ بروہہ کے واسطے پاسپورٹ لانے کو جانا نہ ہوتا تو ہم اُن کو بھی

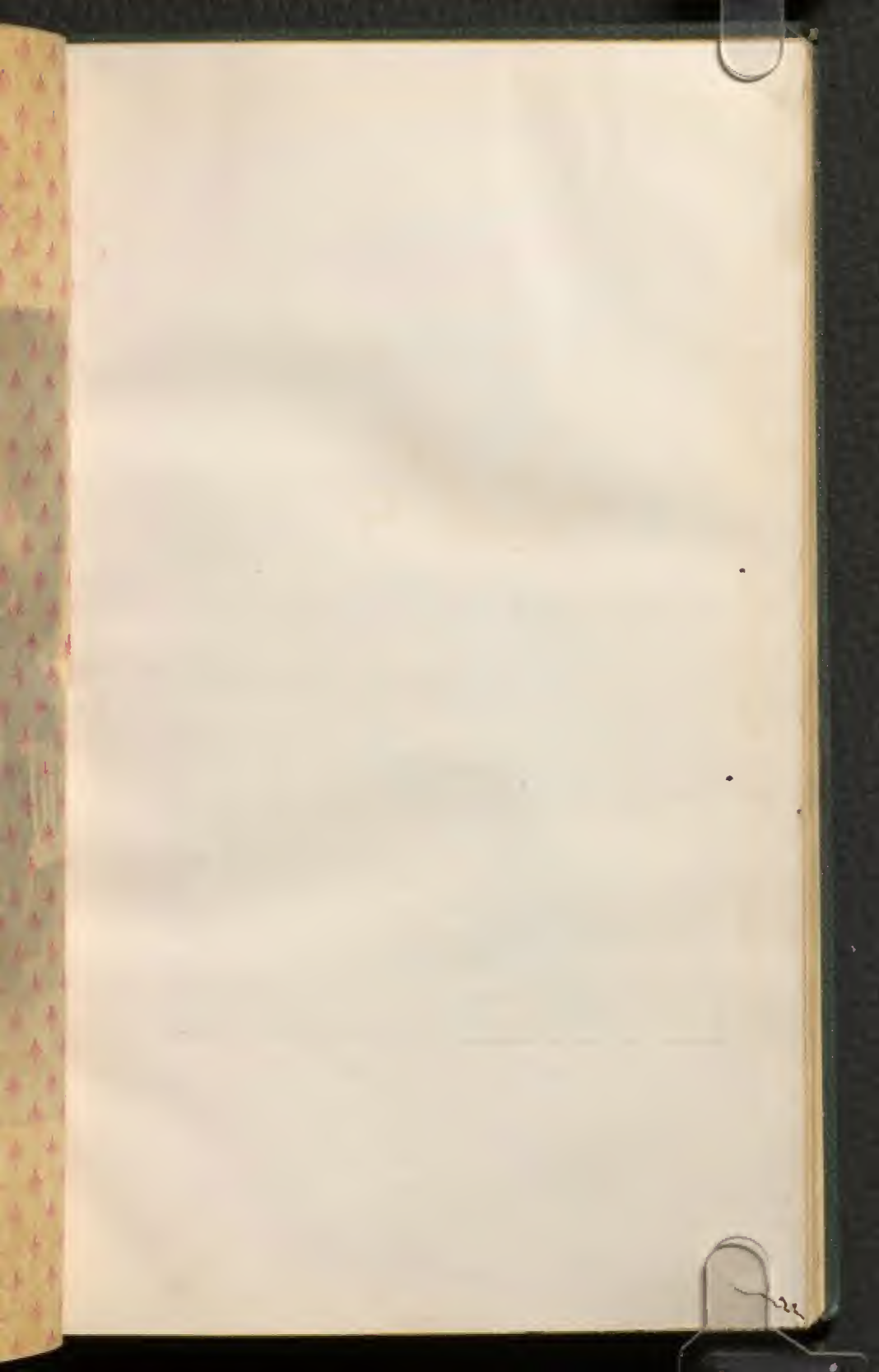
مقام خلافت

کچھ دیر اور بھی بات چیت کرتے رہتے۔ یہ دستور یہاں بڑا ہی ناگوار ہے کہ قسطنطنیہ باہر خواہ قلمروئے عثمانیہ ہی میں جب کہیں آؤ جاؤ۔ تب بھی نیا پروانہ راہداری حاصل کرنا پڑتا ہے۔ یہ قاعدہ خصوصاً ان سیاحوں کے واسطے تو اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہے جو بلا کسی ایسی قیود کے سفر کرنے کے عادی ہوں یہ سلسلہ آمد و رفت اوکاوا تجارت کی ترقی میں بھی بالمشبہ بہت کچھ حاجت ہے کیونکہ آمد و رفت کی آزادی پر ہی تجارت کا بڑا دار و مدار ہے۔ مگر شک ہے کہ اس پروانہ (بول ٹنڈر) کے ملنے میں ہمیں کچھ بہت تکلیف نہ اٹھانی پڑی۔ بس اتنا ہوا کہ پہلے ہم قونصل خانہ برطانیہ کو گئے اور اپنا پہلا پاسپورٹ پیش کیا۔ جہاں فریج زبان میں ایک فارم کی خانہ پڑی کی گئی یعنی ہمارا پتہ نشان جو درج کیا گیا۔ اور ہمیں مقامی پوس آفیس کو جانے کی ہدایت ہوئی۔ وہاں اس فریج فارم سے ترکی زبان میں پروانہ راہداری تیار کیا گیا۔ اور دونوں جگہ فارم بائے مذکورہ کا حقیقت ساعدہ و نائب سرخ مقررہ سرکاری لیا گیا۔

۱۱۔ ستمبر صبح سویرے ہی ہم مقام مدانیہ کو جانے کیلئے جہاز پر سوار ہونے لگے کی طرف گئے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عازمان بروسہ جا کر خشکی پر اترتے ہیں جہاں نے اسپیکٹر بحری سے ہمارا تعارف کرایا۔ انہی کے کمرہ میں ہماری ڈاکسٹر احمد نسیق پاشا سے واقفیت ہوئی جو فوجی کلج کے پروفیسر ہیں۔ ہمارا جہاز نو بجے کے قریب مدانہ کو روانہ ہوا اور دو بجے وہاں جا پہنچا۔ مسافت کسی بڑے جہاز میں اور ذرا زیادہ تیز رفتاری سے اسکی نسبت آدھے وقت میں طے ہو سکتی ہے۔ پھر بھی چونکہ دن اچھا تھا ہمارا یہ چھوٹا سا بحری سفر خاصے لطیف رہا۔

اُس دُورِ مسکن کی حالت میں تھا اور سوج کی کریشیں مشرقی یورپ کے نیلے پانی پر
 پڑ کر ہر طرف ایک نظر فریب سما پیدا کر رہی تھیں۔ مدانیہ سے بروسہ کو ایک
 چھوٹی ٹیسی ریل گئی ہے جو جریتون کے خوبصورت باغات اور تاکستانوں سے گزرتی
 ہوئی قدیم پایہ تخت عثمانیہ کو جا پہنچتی ہے۔ اگر ہم اس میں سوار ہوتے تو کوئی ڈیڑھ
 ہی گھنٹے میں منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے۔ لیکن چونکہ ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ رستہ
 میں بہت سے قابلِ دید منظر ہیں جنکی سیر گاڑی میں بیٹھ کر جانے سے خوب
 ہو سکتی ہے۔ لہذا ہم نے ایک اچھی آرام دہ لینڈ و گاڑی لی اور اس میں کوئی
 تین گھنٹے کے اندر بروسہ پہنچے۔ جس وقت ہم شہر میں داخل ہوئے ہیں شام
 ہو چکی تھی۔ اور اس قدیم بستی کا منظر مشہور قلعہ کوہِ اُمیس کی آغوش میں بکنا
 جاتا تھا۔ ہاں اس کے مکانات برابر برابر دامنِ کوہ سے سر نکالے اور اسکی چوٹیوں
 سے باتیں کرتے ہوئے بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ یہاں جو ہوٹل ہیں
 سب پہلے نظر آیا۔ ہم اُسی میں اتر پڑے اور دیکھا کہ وہ بہت صاف ستھرا اور
 آرام دہ ہے۔ گو وہ تکلفات اور سامانِ آسائش میں تو یورپ کے معمولی ہوٹلوں
 کی بھی برابری نہ کر سکتا تھا لیکن کچھ بھی بعض باتوں کے لحاظ سے اُس میں انکی
 نسبت کہیں زیادہ آرام مل سکتا ہے اور کم خرچ ہونے میں تو کچھ شک ہی نہیں۔
 اس ہوٹل کا مالک بھی مسلمان ہے اور میزبان بھی۔ ہم نے اس میں اپنی مرضی کے
 مطابق کمرے لے لئے۔ اور اپنا اسبابِ غیرہ ٹھیک ٹھاک کرتے ہی والے
 ولایتِ بروسہ کو کہلا بھیجا کہ ہم آن پہنچے ہیں۔ اور ساتھ ہی وہ معرفی کی جیٹھی بھی
 نکلی خدمت میں بھیج دی جو ہمیں زیرِ داخلہ نے ازراہ تہربانی لکھ کر دی تھی۔









میں مغرب جلا
پہلے کی ہوگی
درمیان میں۔ اس
نے ہم کو آتے آتے
لئے تو وہ منہ پر
میں ہی نصف
میں سارا حصہ
پہلے ستر راہ
ہم نے مقامی
کے ہی غمی رہے
میں سارا حصہ
میں غمی سچ
ت کے دریا
میں بیچ قرار
میں اندر آسکے
میں سے ہم
میں کی رائے
میں سے روز
میں نے اس

اس سفر میں جلال انسی بے کسوا انکا چھوٹا سا صاحبزادہ مظہر انسی بے جسکی عمر کوئی نو برس کی ہوگی ہمارے ساتھ ہو لیا تھا۔ میں نے ایسا زمین اور خوش تربت چمک دیکھا ہے۔ اسکی بدولت والی بروہہ کے ہاں ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ جو چٹھی ہم انکے نام لائے تھے اُس میں ہم تینوں کا نام تھا۔ جب ہم جناب والی پاشا کی ملاقات کو گئے تو وہ مظہر بے کو دیکھ کر متسم ہوئے اور پوچھا تم کون ہو۔ اُس نے کہا میں بھی نصف مہمان ہوں۔ اس کے والد نے کہا آپ کی خدمت میں اچ بچہ یعنی سارٹھ تین مہمان ہوتا بول سے آئے ہیں۔

ہیستہ تراہم سویسے ہی سیر تاشے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے ہم نے مقامی دستکار یوں کی نمائش دیکھنے کا عزم کیا جو بروہہ میں نئی نئی کھلی ہی تھی۔ رہستہ میں ہم کو وہ مسجد ملی جسے علوجا مع کہتے ہیں اور جو اس علاقہ کی مساجد میں سب سے بڑی ہے۔ یہاں کی قابل دید چیزوں میں ہے۔ قسطنطنیہ کیا ہم نے جیسی مسجدیں دیکھیں یہ طرز تعمیر میں اُن سے مختلف ہے۔ اس کے اندر چھت کے درمیانی گنبد کے نیچے ایک خوبصورت حوض بنا ہوا ہے۔ جس کے پنجوں بیچ نوارہ لگا ہوا ہے اور گنبد اس طرح بنایا گیا ہے کہ ہوا اور روشنی بخوبی اندر آسکے اور مسجد کی ساری عمارت بھی اچھی طرح نظر آئے۔

مسجد سے ہم نمائش کو گئے جو لچسپیوں سے لبریز تھی۔ محض مقامی صنعت و حرفت کی نمائش ہونے کے لحاظ سے اُس کا حسن انتظام بھی بہت قابلِ اذ تھا اور اس سرزمرہ دار حکام نیز والے ولایت کی مستدی قابلیت عیاں ہوتی تھی جنہوں نے اسکی امداد و حوصلہ افزائی میں پوری پوری سرگرمی و توجہ کو

کام فرمایا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا کچھ تفصیلی حال بھی مدتہ ناظرین کروں۔ کیونکہ ایک صوبہ کے صدر مقام ہیں۔ اس قسم کی نمائش کا باقاعدہ انتظام میرے نزدیک فخر و عنائت میں حرفتی بیداری کی ایک نیک فال ہے۔ اس بیداری کو اگر درجہ تکمیل تک پہنچنے کا موقع ملا تو اُسید ہو کہ وہ ٹرکی کو دنیا کی ممتاز اقوام کے ہم لہجہ بنا دیگی۔ یہ نمائش ایک مضہار اور جدید طرز کی خوشنما عمارت میں تھی جو خاص اعلیٰٰ سے بنائی گئی تھی۔ اس میں نمائشوں والی معمولی دس پچاس سب موجود تھیں۔ فرش کی درستی بڑی احتیاط سے کی گئی تھی۔ اندر ہی مینیٹر باجہ کا ایک ٹیڈ تیار کیا گیا تھا جس میں تیسرے پہر کو باجہ بچتا تھا۔ اشیاء نمائش و شکارین کی ترتیب کو ملحوظ رکھ کر سجائی گئی تھیں۔

سب سے پہلا کمرہ جس میں ہم داخل ہوئے۔ مقامی مکاتب و دستکاری کی کارگریوں کے نمونوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور اُس سے وہ حرفی تعلیم بخوبی عیاں ہوتی تھی جو وہاں طلباء کو دیجاتی ہے۔ اکا لکڑی۔ لوہے اور پتیل کا تمام کام تھا خوبصورت تھا۔ مکتب کی دستکاریوں میں جلد بندی کا کام بھی حسن خوبی کا کچھ کم نہ تھا۔ اور بوٹ اور جوتے بھی جو طلبہ نے بنائے تھے بہت عمدہ تھے۔ چونکہ یہ تعلیل کے دن طلباء حساب کتاب لکھتے تھے اور کچھ مصنوعات دکھائی غرض سے وہاں موجود تھے۔ دوسرے کمرہ میں مختلف اقسام کے وہ پتھر ایک ترتیب خاص سے سجائے گئے تھے جو فواج شہر میں دستیاب ہوئے تھے۔ نیز اُن پتھروں کی بنی ہوئی چیزیں۔ اور ساتھ ہی وہ مختلف اقسام کے معدنی پانی جنکے لئے بروئے مشہور ہے۔

تیسرے میں چرمی اسباب تھا۔ اور چوتھے میں یورپی طرز کے جدید آلاتِ کشاورزی۔ یہ آلات ایک مقامی کارخانہ کے تیار شدہ تھے جو کسی یونانی کی ملکیت ہو۔ ایک اور کمرہ میں کھانڈ اور اس سے بنی ہوئی تمام قسم کی مٹھائیاں۔ خاصکر لوکم وغیرہ بینپوں کی سجاوٹ بہت دلچسپ تھی۔ یہ سب خاصکر بروسہ کی بنی ہوئی تھیں اور چوکولیٹ وغیرہ ایسی چیزوں کے ساتھ جو یورپین مذاق میں عام طور پر دلپسند ہیں نہایت خوش سلوبی سے چنی ہوئی تھیں۔ اُنکے علاوہ پارچہ بانی۔ صابون سازی۔ قالین بانی۔ سگرٹ سازی وغیرہ ہر قسم کی دستکاریوں کے جدا جدا کمرے تھے۔ نقشہ کشی اور رنگ سازی کا سامان اور نمونے بھی ایک عظیم الشان مال میں سجے ہوئے تھے۔ عطریات اور عجائبات و نادرات جو بروسہ اور اس کے علاقہ گرد فواح سے مخصوص ہیں۔ انکا حصہ بھی قابلِ دید اور لائقِ داد تھا۔ لیکن ان سب سے بھی زیادہ خصوصیت ان کمروں میں پائی جاتی تھی جن میں ریشم کے کوپوں کی پرورش۔ ریشم کے تننے بننے وغیرہ کے سامان دکھائے گئے تھے۔ اور بہت سے کمروں میں بروسہ کے بڑے بڑے قیمتی ریشمی پارچات اور ریشم ہار ریشمی تولے دھرے تھے۔ یہیں حرفتِ ریشم کی ساری ترکیبیں دیکھ کر شاہی مکتبِ ریشم کے ایک پروفیسر نے اچھی طرح سمجھا سمجھا کر دکھائیں۔ غرض ہم اس عائن کی سیر سے بہت ہی خوش ہو کر نکلے۔ اگرچہ ہماری جیب بہت کچھ ہلکی ہو گئی تھی۔

جب ہم اپنے ہوٹل کو واپس آئے تو سنا کہ ولایت کی طرف سے کوئی اہلکار صبح کے وقت آیا تھا۔ مگر ہم وہاں موجود نہ تھے اس لئے وہ پھر کئی وقت آگیا۔ چنانچہ چند ہی منٹ بعد وہ صاحبِ پھر تشریف لے آئے۔ یہ بہت

عیسائی تھے اور والی ولایت کے ناظر اعلیٰ۔ آپ کا یہ پیغام لیکر آنا ہوا کہ والی صاحب یاد فرماتے ہیں اور بڑی خوشی سے آپ کا خیر مقدم کریں گے۔ ہم سب شکر پرانہ بیل گورنر کے ہمید گوارٹر کو روانہ ہوئے اور ہر اس سنسی توفیق بے کی خدمت میں پہنچے جو محکمہ امپیریل سیکرٹریٹ میں بڑے بڑے نوٹرواری کے منصب پر ممتاز رہ چکے ہیں اور اب ولایتِ خداوندگار کے گورنر ہیلیشیائی ٹرکی کا اہم ترین صوبہ سوا اور جس کا بروئے صدر مقام ہے۔ آپ کی گفتگو ہمارے ساتھ زیادہ تر ترجمان کے توسط سے ہوئی مگر فرینچ بخوبی فرینچ جانتے ہیں اور اس وقت بھی اس قدر اسی زبان میں بات چیت کی۔ آپ کی عمر کوئی چالیس سال ہوگی۔ بڑے سنجیدہ اور منین آدمی ہیں اور اپنے کام میں بڑے محنتی و مستعد۔ آپ نے اپنے ایک معتمد اہلکار کو بلوایا اور ان کی خدمات ہمارے سپرد کر دیں۔ اب ہمارے پاس دوسرے کاری گاہ ہو گئے۔ انکی محیت میں ہم اس جگہ کے باقی قابل دید مقامات کی سیر کو نکلے۔ لیکن روانہ ہونے سے پہلے کچھ دیر احمد نظیف بے کے ساتھ مزے مزے کی باتیں کرتے رہے۔ جو والے ولایت کے کاتب اول یعنی فٹ سیکرٹری ہیں اور جنکے نام نوت الفنون کے ایڈیٹر نے ہمیں چھٹی لکھی تھی۔

پھر ہم وہ درس گاہ دیکھنے گئے جہاں رشیم کا کام سکھلایا جاتا ہے۔ یہ ایک خوبصورت عمارت ہے۔ ہر قسم کی ضروریات سے آراستہ۔ اب سے ۲۲ سال قبل جاری ہوئی تھی اور اب تک یہاں سے بڑے بڑے قابل آدمی کام سیکھ کر اس وقت کے اکثر کارخانوں کو جاتے رہے ہیں۔ اور نئی عمارت جس میں یہ انسٹی ٹیوشن اب واقع ہے۔ کوئی دو ہی برس ہوئے۔ بنی ہے۔ اس میں ۸۵ طالب علم درجِ حشر ہیں

در سفارت پرشین در هند

Hospital Serikhole.



اور یہ سکول روز بروز ترقی و بہر و لغزیزی حاصل کرتا جاتا ہو۔ اس کے پاس ہی ایک اور بھی
جدید عمارت ہو جس میں مقامی ہائی سکول واقع ہے۔ سکول سے ہم رشیم کے
ایک کارخانہ کو دیکھنے گئے۔ چونکہ شہر میں اس کے کئی ایک کارخانے ہیں۔ ہم نے
سوچا نوٹہ ایک تو اچھی طرح دیکھ ہی لیں۔ وہاں سے ہم مقامی ملٹری سکول کو دیکھنے
گئے۔ جس کی عمارت شہر کے ایک ممتاز و بلند مقام پر واقع ہے اور سیاح کو دور ہی
سے نظر آتی ہے۔ اس سکول میں کوئی دو سو طلبہ پڑھتے ہیں۔ اُن میں سے جو
ذرا اعلیٰ تر نصاب کی تعلیم پاتے ہیں وہ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر سنٹرل کالج
قسطنطنیہ میں داخل ہوتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ فوجی تعلیم کے ایسے برانچ
سکول دیگر صوبجات کے صدر مقاموں پر بھی ہیں مثلاً اور نہ اور ارض روم وغیرہ میں
سکول سے واپس ہوتے ہوئے ہم نے نیشنل جامع یعنی سبز مسجد دیکھی جو ایک
پُرانی تاریخی مسجد ہو اس کی اینٹوں پر سبز روغن اس خوبی سے کیا گیا ہو کہ باوجود
امتداد و زمانہ روغن قائم ہو اور اسی لئے اسے کالی مسجد کہتے ہیں۔ وہاں سے
لوٹ کر شہر کو آئے کہ سلطان عثمان غازی کے مرقد پر فاتحہ پڑھیں۔ اس قبر کے
کتبہ پر ایک عثمانی نشان آویزاں ہو جسے سلطان عبدالعزیز نے اپنے مورث
علی کی یادگار میں قائم کیا تھا۔

اس قبر کے پاس ہی ایک اور قبر سلطان اور خان بن عثمان کی ہو۔ ان خزاوندگی
ذہانت کر کے اور مینار کے اوپر سے شہر و نواح شہر کا و لفریب نظارہ دیکھ کر ہم گواہی
میں بیٹھ اپنے ہوٹل کو واپس آ گئے۔ واپس ہوتے ہوئے ہم نے رستہ خوجہ عبداللہ بن
فندی کے جادو تک می۔ جو بروسد کے ممتاز علماء سے ہیں۔ ہم نے آپ کو نہیں

اسلامی تربیت کا ایک عمدہ نمونہ پایا۔ آپ نے ہمارے ساتھ فارسی زبان میں گفتگو کی جو آپ بڑی آسانی سے بول سکتے تھے۔ بخلاف اکثر دیگر علمائے رُکی کے۔ اُنکے ساتھ ایک چار کی پالی پی کر ہم ذرا تازہ دم ہوئے اور اُن سے اجازت طلب کی شام کو نیک نل خوجہ صاحب ہماری ملاقات باز دید کو تشریف لائے۔ آپ کے بھائی صاحب بھی ساتھ تھے۔ دونوں صاحبوں کی ملاقات سے ہم نہایت مسرور و متاثر ہوئے۔ کیونکہ ہم نے دیکھا کہ دونوں کے دونوں بزرگوار بڑے روشن خیال عالم ہیں۔

۳۱ ستمبر بروز جمعہ میں ہمارا پہلا دن تو بڑی مصروفیت میں گذرا ہی تھا لیکن دوسرا روز اس سے بھی زیادہ مشغولی کا رہا۔ پہلے ہم نے یہاں کے ”چارشہ“ کو دیکھا جو ذرا چھوٹے پیمانہ پر ہو رہا تھا اس بڑے بازار کا نمونہ ہو جسے ہم قسطنطنیہ میں دیکھ چکے تھے۔ وہی وضع قطع۔ وہی نقشہ۔ وہی ہی مختلف قسم کی دوکانیں۔ اس میں داخل ہونے کے متعدد دھانگ ہیں جن سے ملحق کئی کئی ”خان“ یعنی سرائیں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض میں ہزاروں پونڈ کچا ریشم روزمرہ آتا اور بکتا ہے۔ اکثر دوکانوں میں بڑے بڑے نفیس اور اعلیٰ قسم کے ریشمی مال بھرے پڑے ہیں۔ جو بیرونی دنیا کو بہت کم معلوم ہیں اور اس قابل ہیں کہ اقطاع عالم میں انہیں بیش از بیش شہرت دی جائے اور دیساور میں بھیجے جائیں۔ اس بازار کی سیر دیکھ کے ہم حمیدیت کتب صنعت و حرفت میں آئے اور اسکی سیر سے بہت محفوظ ہوئے۔ کوئی دوسرا طلبہ اس میں داخل ہیں جو یہیں رہتے اور یہیں کتابی نیز علمی تعلیم پاتے ہیں۔ یہیں ہاشمی حلی بے پرنسپل مدرسے میں اپنی درسگاہ کے مختلف صنفی دیکھنا

هزینه پرورش بزرگسالان



هزینه

اہل ہجرت کا قافلہ
 اہل نوحی و مسکرا
 ہنسی کی بھی تعلیم
 اس درگاہ میں
 رسال تک ہر جو
 نال ہو جاتے ہیں
 زینا تین ہزار
 ہیں۔ اس کتب
 فاکم سہا تھا
 سے اس
 میں اسکو بڑ
 تمام ضروریات
 یو تیز اس کے
 ہو گیا اور بڑ
 والی ولایت ک
 کے عرصہ میں تین
 اسی طرح سن
 نے جب ہم سک
 ہنسا دردی پ

یہاں کوئی جماعت قالمین بانی سیکھتی ہو۔ کوئی خیاطی۔ کوئی پاپوش سازی۔ کوئی جلدگری اور کوئی فوجی و سرکاری مینڈروں میں ملازمت کے لئے تیار کیجاتی ہو۔ ایک جماعت فن نگاری کی بھی تعلیم حاصل کرتی ہے۔

اس درس گاہ میں ہر مذہب و ملت کے طلباء داخل ہو سکتے ہیں۔ درجہ کی عمر دس سے بارہ سال تک ہو۔ چار یا پانچ برس میں یہ نوعمر لڑکے اچھی طرح سیکھ کر کام کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ مختلف جماعتوں کی مدت تعلیم بھی مختلف ہو۔ اوسط خرچ سالانہ قریباً تین ہزار پونڈ ہے۔ سکول سٹاف میں آٹھ لکچرار اور پانچ ماسٹر مختلف فنون کے ہیں۔ اس مکتب کی تاریخ بڑی دلچسپ ہو۔ اب سے ۳۴ سال قبل پبلک چنڈہ سر قائم ہوا تھا۔ اس وقت اس کا سرمایہ جائداد کمپنی میں لگا دیا گیا تھا۔ جسکی آمدنی سے اس کے اخراجات چلتے رہے اور سلطان حال کے عہد مبارک میں اسکو بڑی معقول سرکاری امداد بھی ملنے لگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اسکی تمام ضروریات بھی بوجہ حسن پوری ہو جاتی ہیں اور کچھ رقم دافر بھی رہتی ہے۔ یہ تو فیروز اس کے سرمایہ مستقل میں شامل کر دیجاتی ہو۔ جو جائداد کی آمدنی سے جمع ہو گیا ہو اور بڑھتا رہتا ہو۔ میں نے سنا ہو کہ وہ عالیشان محل نما مکان جو والی ولایت کی جائے سکونت ہو اسی مدرسہ کی جائداد ہو گزشتہ پندرہ سال کے عرصہ میں تین سو آدمی مذکورہ بالا فنون کے پورے پورے ماہر بن کر اس انسٹیٹیوشن سے نکل چکے ہیں اور ۲۴ نوجوان پچھلے امتحان میں کامیاب ہوئے تھے۔ جب ہم سکول کی سیر ختم کر کے چلنے کو تھے تو جماعت موسیقی نے جو نہایت خوشنادر دی پہنے تھے ہمیں حمید یہ مارچ سن کر مسرور کیا۔

اس مدرسہ سرکاری کے پاس ہی شفا خانہ کی عمارت واقع ہیں جس میں زنانہ و مردانہ حصے جدا جدا بنے ہوئے ہیں۔ رشیدی بے نے جو اس ہسپتال کے افسرِ علیٰ ہیں ہمیں عمارت متعلقہ کی اچھی طرح سیر کرائی۔ ہم نے دیکھا کہ یہاں تمام ضروری سامان اور جدید آلات وغیرہ موجود ہیں جو ہم قسطنطنیہ میں دیکھ چکے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ فنِ علاج میں ترکوں کی ترقی دار الخلافہ تک محدود نہیں۔ بلکہ صوبجات میں بھی نظر آسکتی ہے۔ ہسپتال سے چل کر ہم محلہ مرادیتہ میں آئے۔ اس میں سلطان مراد کا مقبرہ ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی سلطان مرحوم کے نام پر ایک مسجد اور مذہبی مدرسہ بھی بنا ہوا ہے۔ اس مدرسہ میں نوے کے قریب طلباء پڑھتے ہیں جنکو عربی و دینیات کی تعلیم بخشی جاتی ہے۔ اتفاق سے ہم ایسے وقت مدرسہ میں پہنچے کہ انہیں دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے بھی دیکھ سکے۔ جہاں کھانا کھایا جاتا ہے اُسے ترکی بولی میں ”عمارت“ کہتے ہیں۔ اس جگہ کل طلباء اکٹھے کھانا کھاتے ہیں۔ اگرچہ یہاں کا انتظام طعام محکم سیدھا سادہ ہو لیکن اصولاً اُسی ڈھنگ پر ہے جیسے کہ بلادِ مصر و ترکی ریزیدانشیل یونیورسٹیوں میں درگاہوں کے ساتھ ہی ڈاننگ حال بھی ہوتے ہیں جب ہم کمرہ کے اندر گئے طلباء اس وقت جمع ہوئے ہی تھے۔ یہ طلباء چھوٹے بڑے مختلف عمروں کے تھے۔ میں سے چالیس سال تک۔ بعض بعض تو خاصی لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے تھے۔ جنکی مٹھے شکیں قابلِ ادب اور واجب الاحترام معلوم ہوتی تھیں۔ یہ حضرات اُن نوجوانوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ جنکے ایسی میس ہی بھیننی شروع ہوتی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں کھانا آگیا۔ جس میں ایک تود وٹیاں تھیں۔ جنہیں ہاں فدلہ کہتے ہیں اور جو ہندوستان کے مانوں سے ملتی جلتی تھیں اور

اُنکے ساتھ چور با یا سالن جو ہمارے ہاں کے شور بہ سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ روز
تو اُن طلباء کو یہی کھانا ملتا ہے لیکن جمعرات کے دن پلاؤ زردہ بھی دیا جاتا ہے۔
مراۃ سے ہم خداوند کار غازی کی مسجد کو گئے۔ وجہ تسمیہ اس مسجد کی یہ
ہے کہ اسے اُسی سلطان نے تعمیر کرایا تھا جسکے نام سے صوبہ خداوند کار موسوم
ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی مگر خوشنما عمارت ہو اور حال ہی میں کی تجدید و مرمت
ہوئی ہے۔ اس مسجد کے قریب ہی وہ مشہور حمام واقع ہے جس کا پانی قدرتی چشمہ
سے ہی گرم نکلتا ہے۔ مسجد سے واپس ہوتے ہوئے ہم نے ایک اور مشہور و معروف
حمام دیکھا۔ اس کا پانی بھی اسی طرح قدرتی چشمہ سے گرم ہوتا ہے جس میں گندہک کا وہ
شال ہو اور اکثر جلدی امراض میں اس کا غسل بہت مفید پڑتا ہے۔

۱۲۔ ستمبر آج کی سب سے پہلی قابل ذکر بات یہ ہو کہ صبح ہی صبح بروسنام ایک لکھل
پرچے کا قلم مقام ہم سے ملنے آیا۔ اس نے مسلمانان ہند کے متعلق کسی باتیں
پوچھیں جن پر بعد میں معلوم ہوا کہ اُس نے اپنے اخبار میں ایک طویل آرٹیکل شائع
کیا۔ اور قسطنطنیہ واپس آنے پر وہاں کے ایک اخبار میں نقل شدہ وہ مضمون میری
نظر سے بھی گذرا۔ نماز جمعہ ہم نے بڑی مسجد میں ادا کی جہاں شرکار جماعت کی
نقد و بڑی معقول تھی۔ جب ہم مسجد سے لوٹ کر آئے تو پہلے رشیدی مہتمم شفا خانہ
تشریف لائے اور اُن سے تھوڑی دیر بعد ہر اس سنی گورنر صوبہ نے ملاقات مارڈ
کی غرض سے قدم رنجہ فرمایا جو حقیقت ایک بڑی بھاری عزت افزائی اور
ذرا نوازی تھی۔ اور ہمارے لئے باعث فخر و مسرت۔ تیسرے پہر کو ہم وہ دیہاتی
محل شاہی دیکھنے کے لئے گئے جو شہر کے قریب ہی ایک پہاڑ کی چوٹی پر سلطان

مقامِ خلافت

عبدالغزیز مرحوم کا بنایا ہوا ہے جس پر سے نہایت دلفریب نظارہ دکھلائی دیتا ہے۔ اور جو بڑی خوش اسلوبی سے آراستہ کیا گیا ہے۔ گو سلطانِ جال کے عہد میں یہ محل کبھی نہیں برتا گیا۔ پھر بھی ایسی اچھی حالت میں ہے کہ اس سے پایا جاتا ہے کہ اسکی نگہداشت بڑی احتیاط سے کی جاتی ہوگی۔

شام کو ہر کھسنی گور صاحب سو اہنی کے دولتانہ پر ملاقات ہوئی۔ شب کو کھانا رشی بے کے ہاں کھایا۔ یہ کھانا خالص تر کی کھانے کا نمونہ تھا۔ اکثر کھانے نمک چرچ مسالے سے خالی ہوتے ہیں۔ ایک قسم کی شیرینی ضرور دسترخوان پر ہوتی ہے اور آخرین چانول آتے ہیں۔ چانولوں کا میز پر آنا اس بات کی علامت ہے کہ کھانا ختم ہے۔

۵ اکتوبر | آج ہم ہندوستانی تکیہ دیکھنے گئے اور وہاں اس مقبرہ کی زیارت کی۔ جس میں اس حصے میں قیام سلطنت اسلامی کے پیش رو مدفون ہیں۔ ان صوفیہ کرام کی اسلامی خدمتیں اور الہ الغزوی بھی فی الواقع بڑی ہی حیرت انگیز قابلِ تعریف و لائقِ داد ہیں کہ اُس زمانہ میں جبکہ سفر کی یہ سہولتیں خوابِ خیال میں بھی نہ تھیں جو آج میسر ہیں۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی خاطر تمام صعوبتیں بطیبِ خاطر گوارا کر کے انہوں نے دُور دراز سفر طے کئے۔ غیر ملکوں میں غیر قوموں کے درمیان جہاں نہ انکا کوئی خویش تھا نہ بچانہ نہ واقف نہ شناسا۔ سکونتِ خستیا کی اوگویا۔

اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈال گئے۔ اس تکیہ میں شیخ نور اللہ نقصوری نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ اپنا چھوٹا سا باغچہ دکھلایا جو انکے اپنے ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے۔ دستِ بگنے اور جس میں ہر قسم کے پھلدار درخت موجود ہیں۔ یہاں کچھ درخت انجیر کے تھے

جکی ٹہنیاں انجیروں سولہوی تھیں۔ شیخ صاحب نے ہم سے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے
توڑ کر چکھتے تو سہی۔ ہمارے بلغ کے پھل کیسے ہیں۔ یہ ہندی شیخ اب ہیں تو
ہیں انہوں نے ہمیں شادی کر لی ہوا اور ترکی خاتون کے بطن سے اُنکے دو بچے
بھی ہیں۔ تیسرا لڑکا جسکی عمر کوئی پندرہ سال ہوگی آپ کی پہلی بیوی سے ہے جو
عربی نژاد تھی۔

ہم نے دوپہر کا کھانا ایک ہندی دوست سید محی الدین سورتی کے ہاں کھایا۔
ان سے مل کر اور عرصہ کے بعد اپنے دہلی کھانے کھا کر طبیعت کو بڑی مسرت ہوئی۔
حلی بے پرنسپل مدرسہ دہلی سے ہم سے فرما چکے تھے کہ چار ہمارے ہاں بھیج دو
چنانچہ ہم سید محی الدین صاحب سے رخصت ہو کر مدرسہ کی طرف گئے۔ آپ سو وقت
مع چند ممبرانِ سٹاف کے مدرسہ میں موجود تھے۔ دیر تک اس شاخ تعلیم کے متعلق
باتیں ہوتی ہیں جس سے پرنسپل صاحب کو خاصہ دلچسپی تھی۔ آپ سے معلوم کر کے
ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ جیسے سکول کے وہ پرنسپل ہیں اسی قسم کے اور بھی کتاب
اب قلمروئے عثمانیہ کے تمام صوبجات میں قائم ہو گئے ہیں۔ بلکہ آپ نے فرمایا کہ میں
جیسے دور اُنقادہ علاقہ تک میں ایک مکتب دہلی موجود ہو۔ اور کہنے لگے کہ
میرے خیال میں ان درسگاہوں سے ملک کی مادی ترقی کو عنقریب ضرور بڑی مقبول
درپہنچیگی۔

۱۶ ستمبر | ہم آٹھ بجے کے قریب برسہ سہ رخصت ہو کر۔ اس حیدر روزہ قیام میں ہاں ہمارے
بہت سے دوست بگٹے تھے۔ جو صبح سویرے ہی ہمیں الوداع کہنے آ گئے اور بعض نے
شیشن تک ہر مشایعت کر لے چلے آئے۔ مدانیہ کو دہلی کے ہوتے رستے میں چھوڑ دی

دلفریب نظر دیکھنے میں آجھ جاتے وقت نظر سے گزرا تھا۔ بلکہ اُس وقت کالے کالے بادلوں کا
 سین مزید برآں تھا جو محیطِ آسماں تھے اور کچھ کچھ ترشح بھی ہو رہا تھا مگر ہم اپنی چھوٹی سی
 خوبصورت ٹرین کے اندر بیٹھنے سے بچے رہے جو میدانوں سینہ زاروں اور باغات
 کو طے کرتی ہوئی فراتے بھرتی چلی جاتی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ میں ہم مدائنہ جاتے پہنچے۔
 جہاں افسر ضلع (جو وہاں قائم مقام والی کہلاتے ہیں) ہم سے ملے اور جب تک کہ
 قسطنطنیہ جانے کے لئے دُخانی کشتی پر ہم سوار نہیں ہوئے ہمارے ساتھ رہے۔
 کیونکہ انہیں اُنے ولایت کی طرف سے ہدایت پہنچ چکی تھی کہ ہم سے ملیں اور ہمارے آرام
 کا بندوبست کر دیں۔ یہ ایک سن رسیدہ بزرگ تھے۔ انہوں نے چاہا کہ ہم ایک دن
 مدائنہ ہی میں قیام کریں اور وہاں سے اگلے روز روانہ ہو جائیں لیکن ہم نے اُنکا شکریہ
 ادا کیا اور تنگی وقت سے مجبوری ظاہر کی۔ ہم دونے قسطنطنیہ پہنچے مگر چونکہ سارا سترہ
 خاطر خواہ آرام سے نہ کٹا تھا بہت تھکے ہوئے تھے۔ اس لئے ہم نے جلال بے کو
 گھاٹ ہی پر سے رخصت کر دیا اور گاڑی میں سوار ہو کر پیرا میں اپنے ڈیرہ پر چلے گئے۔
 ۱۰ ستمبر | آج کاروبار ہم نے ایک خوبصورت مکان میں گزارا جو سلطان محمد فاتح
 کے تعمیر کردہ قلعہ قدیم موسومہ "رومیلیا حصار" کے قریب باسفورس کے دہلیز طرف
 واقع ہے۔ یہ مکان حسین بے افسر تار و ڈاک کا تھا۔ یہ ایک عجیب بزرگ ہے جو باوجود
 پیرائہ سالی کے جوان بہت ہیں۔ کوئی پینتیس چالیس سال کی بات ہو کہ آپ ٹرکی کی طرف
 سے بیسی میں تو نصل جنرل تھے۔ اُردو باسانی بول سکتے ہیں۔ گوہندوستان
 چھوڑے آپ کو مدت گزر چکی۔ فارسی اور کچھ انگریزی بھی جانتے ہیں۔ اسی لئے
 آپ کے ساتھ گفتگو کرنے میں ہمیں ہر طرح آسانی رہی۔ آپ کو ہندوستان اتنی

اچھی طرح یاد رہی جسکے ایک ٹہ حصہ میں سیر و سیاحت کر چکے ہیں۔ شمال میں پشاور بلکہ اس سر پہ تک کا علاقہ اچکا دیکھا ہوا ہو اور ہندوستان کے حالات و معاملات سے آپ گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے ساتھ آپ کی ہمدردی اگرچہ ایک حد تک اس لئے بھی ہو کہ آپ عرصہ تک ہندوستان میں رہ چکے ہیں لیکن خصوصاً اس واسطے کہ ہمارے ملک سے آپ کو روحانی عقیدہ کا تعلق ہو۔ آپ سلسلہ نقشبندیہ میں مرید ہیں۔

ہم جیسے کے پاس صبح کو گئے تھے اور پھر تک ان سے بات چیت کرتے ہوئے جو اُنکے دفتر جانیکا وقت تھا۔ وہ ہمیں ایک صاحب کے سپرد کر گئے۔ جو اُنکے چھوٹے بچوں کے استاد دیا تالیق تھے۔ ہم نے سوچا کہ جب تک آپ وہیں آئیں ہم اس باپ کے قابل دید مقامات کی سیر ہی کر آئیں۔ چنانچہ ہم پرانے قلعہ کے کھنڈرات کی طرف چلے گئے اور وہاں سے ذرا اور اوپر جا کر رابرٹ کر سچن کالج پہنچے۔ جو پہاڑ کی چوٹی پر اس کالج کی شاندار عمارت بنی ہوئی ہو۔ اسی پر ایک تاشی فرقہ کے درویشوں کی بھی ایک چھوٹی سی جگہ ہو۔ اس فرقہ کی نسبت لوگوں میں کچھ عجب قسم کے افسانے مروج ہیں۔ چونکہ یہ جگہ قریب ہی تھی ہم نے سوچا چلو ذرا اسے بھی دیکھ آئیں۔ چنانچہ وہاں گئے اور بکٹاشینوں کے شیخ سے ملاقات کی۔ شیخ کو تعلیم یافتہ آدمی نہیں تاہم علم مجلسی میں ایک خاصہ ہوشیار شخص ہو۔ اس فرقہ کے لوگ تاج کی شکل کی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ انکے لباس۔ عادات اور گفتگو میں اور بھی بہت سی باتیں عجیب اور زلی ہیں۔

۱۹ ستمبر اور میلی حصار سے لوٹتے ہوئے سیٹر مریم کو نسل عالیہ کے ایک ممتاز نمبر احمد رشید سے ملے۔ ہمارے دوست جمال بے انہیں جانتے تھے۔ انہوں نے بھی آپ سے ہمارا تعارف کرایا اور ہمیں بتلایا کہ آپ مصر میں کئی سال رہ چکے ہیں اور مصر

میں خدیو المکرم کے صاحب خاص میں تھو۔ احمد شہید انگریزی بل سکتے ہیں۔ اسی بن میں ہم ان سے دیر تک بات چیت کرتے رہے اور اثنائے گفتگو میں یہ بھی خیال ظاہر کر دیا کہ ہم ہنرمائی نس خدیو مصر سے ملاقات کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں کیا اچھا ہو اگر آپ اسکا کچھ بندوبست کر سکیں۔ انہوں نے کہا کہ میں شام کو خدیو سے ملنے جاؤنگا اور آپکی تمنا گذارش کرونگا۔ اگر ہنرمائی نس نے منظور فرمایا تو آپکو مطلع دیدیجائیگی۔ جب ہم نے خدیو کے دارالسعادة آنے کی خبر سنی تھی اسی وقت سے ہمیں از حد اشتیاق تھا کہ کسی طرح سے ہم کو بھی ملاقات کا موقع مل سکے۔ مگر ساتھ ہی اس کا انتظام مشکل نظر آتا تھا خصوصاً ہمیں وجہ کہ ہم چند ہی روز میں دارالخلافت سے نصرت ہونے والے تھے۔ مگر حسن اتفاق سے رشتہ کا اس موقع پر مل جانا ہماری اس ملاقات کا ذریعہ بن گیا۔

۲۰ ستمبر صبح ہی جلال بے آئے اور احمد شہید کا یہ پیغام لائے کہ خدیو المکرم آپ کو بطیب خاطر شرف باریابی بخشینگے۔ اگر آپ شام کو ۵ اور ۶ بجے کے درمیان ملنے جائیں۔ چنانچہ تیسرے پہر کو ہم بیک کی طرف گئے جو باسفورس کے کنارے واقع ہے اور جہاں خدیو کا محل ہے۔ یہ محل ایک شاندار سفید عمارت ہے جسکے گرد اگر دو نہایت خوبصورت باغات لگے ہوئے ہیں اور باسفورس کا پانی اس کی سیڑھیوں سے اتر نکلتا ہے۔ ہم کو ایک کمرہ ملاقات میں لیجا کر بٹھایا گیا۔ معلوم ہوا کہ خدیو صبح سے بیمار ہیں لیکن اب شریف لانے والے ہیں۔ اتنے میں ایک خوبصورت دُخانی کشتی باسفورس کے اس کنارہ سے آئی ہوئی جہاں ہنرمائی نس ایک شاہی محل تعمیر کر رہے ہیں نظر پڑی۔ آپ بہت سادہ لباس پہنے ہوئے تھے اور

چند آدمی پرائیویٹ سٹاف کے ہزنامی نس کی خدمت میں تھے۔ ورو دسے تھوڑی دیر
بعد خدیو کے پرائیویٹ سیکرٹری ہیں حضور خدیوی میں یگئے اور ایک ایک کر کے
پیش کیا۔ آپ نے ہمارے ساتھ مصافحہ کیا اور بیٹھنے کے لئے ارشاد فرمایا۔
ہزنامی نس نے اس امر کے اظہار سے سلسلہ گفتگو شروع کیا کہ آپ کے شوقِ ملاقات
سے انہیں مسرت ہوئی جس کے جواب میں میں نے عرض کیا کہ حضور کا شرفِ بابائی
بحثِ ناہمارے لئے بڑے فخر و مسرت کا موجب ہو۔ ہزنامی نس نے یہ خیال
بھی ظاہر فرمایا کہ مسلمانانِ ہند کی ترقی سے جسکی خبریں پہنچتی رہتی ہیں ہمیں بہت
خوشی ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ ہم مسلمانانِ ہند کو اس بات سے نہایت طمّینیت
و مسرت حاصل ہوتی ہے کہ ہمارے مصری بھائی بھی بفضلِ ہمدانِ ترقی میں قدم
بڑھا رہے ہیں اور عربی علمِ ادب کی حفاظت و اشاعت میں انکی مساعی حمیلہ
ہمارے نزدیک بالخصوص قابلِ تعریف اور ستیٰ شکر گذاری ہیں۔ چونکہ
خدیو المکرم انگریزی بآسانی بول سکتے ہیں۔ اس لئے اُن سے ہماری بات چیت
بلا واسطہ ترجمان کوئی گھنٹہ بھرتک ہوتی رہی جسکے دوران میں انہوں نے یہ بھی
فرمایا کہ اگر آپ ہندوستان کو واپس ہوتے ہوئے ہمارے دار الخلافہ میں قیام
کر کے ایک بار پھر بھی ملیں تو انہیں بہت خوشی ہوگی۔ بھلا قاہرہ کی سیر کوئی نہیں
چاہتا اگر اسے نصیب ہو۔ اور ہمارے دل میں تو مدت سے اسکی تمنا تھی۔ اور اب
حضرت خدیو المکرم کے اس ارشاد سے یہ تمنا اور بھی تقویت پا کر عزمِ باخبرم کی
شکل میں تبدیل ہو گئی۔ چنانچہ ہم نے عزم کیا کہ اس سے بڑھ کر ہمارے لئے اُوکونا
امر موجب فخر و مبایات ہو سکتا ہے کہ ہمیں خاص حضور کے پایہِ تخت میں پہنچ کے آداب

بجالاتے کی سعادت حاصل ہو۔ اس ملاقات و گفتگو کے ختم سے پہلے میں نے
حضرت خدیو سے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان کے بہت سے ممتاز مسلمان بھی
اس بارہ میں غور و خوض کر چکے ہیں اور قیامِ انگلستان کے زمانہ میں مجھے بھی اکثر
بار صوبہ مسلمانوں سے جو گویا دیگر اقطاعِ عالم کے چیدہ افراد ملت تھے اس بارہ میں
گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے کہ مختلف ممالک و دنیا کے مسلمانوں کی ایک عظیم الشان
کانفرنس قائم ہونی چاہئے جس میں بزبانِ عربی بحث و مشورہ ہوا کرے اور وہ مناسب
تدابیر سوچی جائیں جن کے عمل میں لانے سے مسلمانانِ دنیا کی تعلیمی - تمدنی اور
تجارتی ترقی کا کوئی یکساں پروگرام اختیار کیا جاسکے۔ ساتھ ہی میں نے یہ
بھی گزارش کر دیا کہ میری نیز ان اکثر بزرگانِ ملت کی رائے میں جن سے مجھ اس کے
متعلق تبادلہ خیالات کا موقع ملا ہے حضور کا پایہ تخت اس قسم کے اجتماع ملی کیلئے
زیادہ تر موزوں مرکز ہے۔ کیونکہ نظر بحالات موجودہ یہی کوئی مجلس ہندوستان یا مصر
ہی میں انعقاد پذیر ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ انہی دو ممالک میں قوانین برطانیہ کی
برکت سے تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہے۔ مگر نسبتِ مملکت یا بھٹی کے قاہرہ نسب
اور زیادہ با موقع ہوگا۔ ہمیں اس بات سے بڑی ہی خوشی ہوئی کہ ہرمائی نس نے اس
خیال سے دلی مدد دی ظاہر فرمائی اور کہا کہ مابعدِ ولت و طبیبِ خاطر اس مفید تجویز کے
معاون ہونگے جب کبھی اس نے عملی شکل اختیار کی۔ ہم نے ہرمائی نس کو ایک بڑا
روشن خیال فرمانروا پایا۔

اکتوبر ۱۹۰۶ء قسطنطنیہ میں سیر کرنے اور نئی نئی ملاقاتیں پیدا کر نیکی بھی بڑی گنجائش
تھی مگر ہمارے پاس اب اتنا وقت کہاں رہا تھا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا کہ

مقامِ حُسنات

اس وقت تک جن حضرات سے ملاقات ہوئی تھی اُن سے رخصت ہو لیں اور اُنکی عنایت کا شکریہ ادا کریں۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم ہرنائی لنس فریدیاشا سے ملنے گئے۔ آپ حسب معمول بڑی خوش خلقی و مدارات سے پیش آئے۔ ہم نے اس موقع کو غنیمت جانکر عرض کیا کہ لندن میں ایک مسجد بنانے کی بڑی ضرورت ہو۔ خیال ہو لندن واپس جا کر وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کی طرف سے ایک عرضداشت حضورِ سلطانی میں ارسال کریں۔ آپ سے بھی استدعا ہو کہ اس بارے میں ہماری اعانت فرمائیں۔ جناب مدوح نے وعدہ فرمایا کہ میں حتی الامکان اس کام میں سعی ہونگا۔

۲۶ ستمبر اِج ہم باقی اجاب سے آخری ملاقات کرنے کے لئے گئے۔ پہلو ہرنائی لنس وزیر خارجہ کیمڈن تھیں۔ پہنچے اور اُنکی عنایات کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے ہمیں جلالِ نبویؐ جیسا قابل گائیڈرِ محنت فرمایا۔ سعد الدین بے جتقی بے اور ہرنائی لنس نوڑی بے ہلکارانہ صیغہ خارجہ سے بھی جا کر ملے۔

۲۷ ستمبر قصرِ یلڈیز کے آخری دیدار پر ہمارے قیام دار السعادة کا خاتمہ تھا۔ وہاں جا کر ہم نے حاجی علی پاشا سے ملاقات کی۔ اُنہی کی معرفت وہ فوٹو گراف نہیں لے جتنا اہم پاشا نے ازراہ عنایت وعدہ فرمایا تھا۔ اس بلند نام سپہ سالار کی تصاویر کو جنہر دستِ خاص سے کلماتِ تہذیبِ رقم فرمائے تھے۔ ہم ہمیشہ بڑے ادبِ احترام سے اپنے پاس رکھنے اور اُنکے عزیز رکھنے میں یہ بات جس سے ہم بہت متاثر ہوئے کبھی نہ بھولیگی کہ آپ نے اپنے وعدے کا اس قدر خیال رکھا کہ بغیر ہماری یاد دہانی کے خود ہی وقت پر اس کا ایفا فرمایا۔ پھر ہم غالب کی خدمت میں گئے۔ جسکی ترقی اُنہی دنوں عہد

وزیرِ شریفیات پر پہنچی تھی انہیں اس منصبِ اعلیٰ پر ترقی پانے کی مبارکباد دی۔ ہم نے عرض کیا کہ ہم وہ اعلیٰ ملاقات کو حاضر ہوئے ہیں۔ آپ نے بھی مثل دیگر احباب کے بھی فرمایا کہ خدا پھر بھی کہی یہاں آنا نصیب کرے! محل سے ہم گاڑی میں سوار ہو کر کافی عسکر سے ملنے گئے۔ جنگی قابلیت اور التفات کا ہمارے دل پر پہلی ہی ملاقات میں نہایت گہرا اثر پڑا تھا۔ مگر افسوس کہ وہ اسوقت دولتانہ پر تشریف نہ رکھتے تھے۔ اس لئے ہم آخری ملاقات سے محروم رہے۔ اب وقت بہت ٹھوڑا رہ گیا تھا۔ اپنے ڈیرے پر واپس آئے تو چند احباب کو وہاں بھی پایا جو بغرض ملاقات ہمارے منتظر بیٹھے تھے۔ اُن سے رخصت ہو کر اور اُن میں سے بعض کو اپنے ساتھ لیکر ہم نے سٹیشن کی راہ لی۔ راہی میں جلال بے بھی تھے جو اخیر تک ہمارے ساتھ رہے۔ اور بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے ٹھیک اسوقت رخصت ہوئے جب ریل گاڑی استانبول کے پلیٹ فارم سے چل پڑی۔ وہی استانبول جس میں ہمارے چند ہفتے بہت ہی مفید سیر اور پرلطف ملاقاتوں میں صرف ہوئے تھے اور جس کی مدارائیں اور مہمانیاں ہمیں غالباً مدت العمر فراموش نہ ہونگی۔



پسران علی حسن علی پاشا خدیو مصر



